چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈائجسٹ ڈر

کراچی

جون 2014

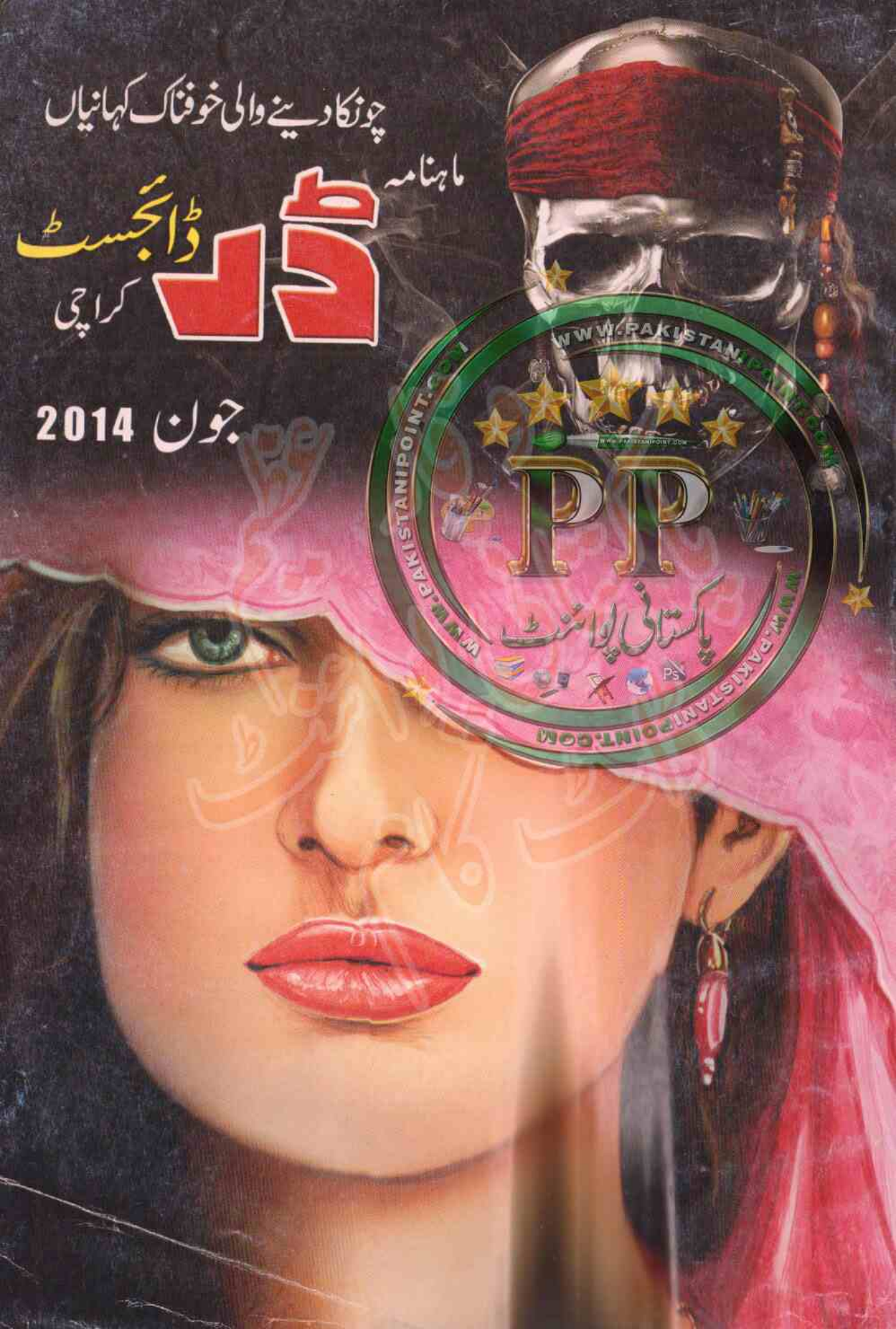

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 15 شمارہ نمبر 9 جون 2014ء

ای میل ایڈریس: Dardigesto1@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

جن زادی	فرحان احمد نصیب	16
موت کا راز	عمرانہ ناز	39
لاحاصل انتظار	ساجدہ راجا	45
خس کم	بشیر احمد بھٹی	53
رولوکا	اے وحید	58
تصویر کا شاہکار	رفعت محمود	81
انوکھا پیار	بلقیس خان	85
معاہدہ	ایس حبیب خان	97
بدروحوں کا مسکن	ایس امتیاز احمد	108
سنہری تابوت	ایم اے راحت	130
زندگی کا خاتمہ	خلیل جبار	157
شیطانی تصویر	راشد نذیر طاہر	163
شکاری	عطیہ زاہرہ	176
اسیر انتظار	ساحل دعا بخاری	187
عشق ناگن	ایم الیاس	190
قوس قزح	ادارہ	210
مالکن	رضوان بھٹی	216
خوفناک عفریت	شہزاد چاند زیب عباسی	222

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تاپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈیڑھ ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

جن زادی

فرحان احمد نصیب۔ کراچی

دو محبت کے متوالے ایک درخت کے نیچے جو کہ بے آب و گیاہ بنجر اور ویران جگہ پر موجود تھا کہ ان کے سامنے اچانک پرہیبت دلوں پر سکتہ طاری کرتا اور رگوں میں لہو منجمد کرتا ایک بھیانک وجود نمودار ہوا اور.....

سوچ کے افق پر رواں دواں اور قوس قزح کے رنگ بکھیرتی دل فگار اور دل فریفتہ روداد

انسان، چرند، پرند اور حشرات کے علاوہ خدا نے زمین پر اور بھی بے شمار مخلوقات کو پیدا کیا ہے جن میں قابل ذکر مخلوق کو "جنات" کہا جاتا ہے۔ بیش تر لوگ تو اس مخلوق کے وجود کے سرے سے ہی انکاری ہوتے ہیں، لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ اس تخلیق خداوندی کا ذکر قرآن پاک میں بارہا موجود ہے۔ عام بات یہ ہے کہ زیادہ تر انسان اس غیر مرئی مخلوق کا ذکر سنتے ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں، دہشت اور وحشت کی لہریں تن بدن میں سرایت ہو کر ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔

مگر میری رائے عام لوگوں سے کچھ الگ ہے، جو کہ مخفی نہیں مثبت ہے۔ اس بات کا اندازہ یہ کہانی پڑھ کر ہو جائے گا۔

جان سوز گرمیاں شروع ہو چکی تھیں اور ہماری یونیورسٹی کا دور ختم ہونے جا رہا تھا۔ میرے دوست عادل کا تو بچپن سے میرے گھر میں آنا جانا تھا مگر باقی یونیورسٹی فیلوز مجھ سے اور ایک دوسرے سے بچھڑنے کے رنج سے مضطرب اور بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

عادل جو کہ اقتصادی حالات میں ہم سب سے برتر تھا، اس نے اپنی طرف سے ہم سب دوستوں کو الوداعی پارٹی دینے کا ارادہ کیا۔ سب متفق ہو گئے مگر میں نے مشورہ دیا کہ اس سے بہتر ہے کہ ہم سب کول کر کہیں گھومنے جانا چاہیے۔ میری تجویز سب کو زیادہ پسند آئی۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ اس شدید گرمی میں ہم تمام دوست مری کی سیر کرنے جائیں گے۔

چونکہ ہم نے اسی ہفتے جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس لئے ہم سب نے جلدی سے سفر کی تیاری مکمل کر لی۔ کرائے کی کوسٹر کا انتظام کیا گیا۔ کوسٹر میں ہم دوستوں کے علاوہ بھی کئی سیٹیں خالی تھیں۔ اس لئے یونیورسٹی کے چند اور لڑکے، جو ہمارے دوست نہ تھے، چلنے کے لئے خواہش مند نظر آنے لگے۔ ہم نے اجازت دے دی اور کوسٹر نے مری کی جانب رواں دواں ہو کر سفر کا آغاز کیا۔

ابھی ہم نے صوبہ سندھ عبور نہیں کیا تھا کہ رات کے جانے کون سے پہر ہماری کوسٹر چند ہلکے جھٹکے کھا کر رک گئی۔ ہم سب نیند کی غنودگی میں تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں جگا کر صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ کوئی ویران بیابان تھا۔ ہم سب ہی لڑکے کسی حد تک خوف زدہ ہو گئے۔ ڈرائیور آدھے گھنٹے کے بعد کوسٹر اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہماری جان میں جان

آئی۔ خیر سفر کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا مگر اس چھوٹے سے واقعہ نے ہم سب کو ڈرا ضرور دیا تھا۔

اس کے بعد مری پہنچنے تک کسی کو بھی نیند نہ آئی اور نہ ہی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔

ہم بخیر و عافیت مری پہنچے۔ وہاں عادل نے ایک بڑا سا کمرا کرائے کا ہٹ بک کیا۔

اس ہٹ کا نام ''کوارٹر ہٹ'' تھا۔ یہ نام سن کر کئی لڑکوں کو ہنسی آ گئی۔ بہرحال ''کوارٹر'' میں جاتے ہی سب ہی تھکن کی وجہ سے سوتے بنے مگر میری آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ گئی تھی۔ میں نے ڈائجسٹ اٹھایا مگر جلد ہی اکتا گیا۔

شب کے ایک بجے کا عمل ہوگا جب میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ گرمیوں کی وجہ سے برف باری کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا پر موسم خوشگوار تھا۔ میں سڑک پر آکر پرنم ہواؤں سے لطف اندوز ہونا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کے باوجود دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ میں کافی آگے نکل آیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہو۔ فوراً سے پیشتر میں نے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اسے اپنا وہم سمجھ کر واپس کوارٹر کی جانب مڑ گیا۔ چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ پھر سے وہی احساس جاگا اور اب باقاعدہ قدموں کی چاپ بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے دوبارہ سرعت سے گردوپیش میں نظریں دوڑائیں مگر سنسان سڑک کے علاوہ کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اب مجھے کچھ خوف محسوس ہونے لگا۔ سرد ہواؤں کا نشہ ہرن ہوگیا۔ میں بے درگ دوڑ پڑا اور کوارٹر پہنچ کر چین کی سانس لی۔ میں بستر پر لیٹ کر اس واقعہ کے متعلق سوچنے لگا۔ نیند اب بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بزدل ہرگز نہیں مگر آج پہلی بار پیش آنے والے اس عجیب واقعہ سے میں کچھ کچھ خوف زدہ تھا۔ مجھے اس بات کی حیرانی بھی تھی کہ میں تو ہر غیر معمولی بات پر تحقیق کئے بنا چین سے نہ بیٹھتا تھا۔ پھر آج میں ڈر کر بستر میں کیوں گھس بیٹھا تھا؟ میں فجر کی اذان تک ڈانواں ڈول ہوتا رہا۔ پھر وضو کر کے نماز ادا کی تو ایسا سکون ملا کہ میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

صبح نو بجے تک تمام لڑکے اٹھ کر تیار ہو چکے تھے۔ عادل کافی دیر سے مسلسل مجھے بیدار کرنے کی کوشش کرتے کرتے اب پریشان ہو کر اپنی تیاری میں مصرف ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی خواب آلودہ آنکھیں رگڑتے ہوئے ایک سرسری نگاہ تمام لڑکوں پر ڈالی اور بادل نخواستہ اٹھ بیٹھا۔

عادل نے مجھے اٹھتے دیکھا تو خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دھمکیوں سے بولا۔ ''نیند کی گولیاں لے کر سوتے ہو کیا؟ حد کر دی تم نے۔''

مجھ پر ہنوز غنودگی طاری تھی سو خالی خالی نظروں سے بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''ارے واہ ..... جناب تو زندہ ہیں۔ مجھے تو لگا تھا کہ جناب نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا ہے۔'' عابد نے موقع کی مناسبت سے اپنی رائے دینا ضروری سمجھا۔ میں اسے گھور کر دوبارہ آنکھیں رگڑنے لگا۔

''بس جلدی سے تیار ہو جاؤ، سب تیار ہیں۔''

عادل شاید بات کو طول دینے کے موڈ میں نہیں تھا اس لئے یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں اس کی بیزار طبیعت اور سخت مزاجی سے بخوبی واقف تھا لہٰذا بنا کسی تامل کے میں واش روم میں گھس گیا۔

پروگرام کے مطابق ہم اکیس لڑکوں پر مشتمل گروپ نے کوارٹر سے باہر نکلنے کے بعد سب سے پہلے ناشتے کی غرض سے قریبی ریسورنٹ کا رخ کیا۔ ریسورنٹ کے نام پر وہ کوئی معمولی سا چائے کا ڈھابا تھا جہاں سیری توقع کے مطابق کئی لڑکوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے منہ بنا کر محض چائے پر ہی اکتفا کیا۔ سبھی لڑکوں کا تعلق امیر کبیر گھرانوں سے تھا۔ صرف میں اور عابد ہی مڈل کلاس تھے۔ میرے سفر کا سارا خرچ عادل نے اٹھانے کی ذمہ داری اپنی مرضی سے لی تھی۔ ان اکیس لڑکوں میں میرے دوست صرف چھ لڑکے عادل، بلال، عابد، شاہد، مظہر اور کمال تھے۔ باقی سب صرف یونیورسٹی فیلوز تھے۔

ناشتے سے فراغت کے بعد وہ سب لڑکے کسی گائیڈ کے ساتھ روانہ ہوگئے اور ہم سات دوست الگ نکل گئے۔ درختوں کے جھنڈ عبور کرتے کرتے ہم کافی آگے چلے گئے تھے۔ برف کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ ابھی تو اوائل سردیوں کی پہلی جھڑی بھی شروع نہیں ہوئی تھی تو برف کہاں سے آتی۔

بہرحال موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سرد اور تازہ ہوا سے بہت راحت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے دھوپ بڑھ رہی تھی، ہوا کی خنکی بھی ختم ہو رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ کر اب سوئی کی طرح چبھنے لگی تھی۔ میں نے جیکٹ اتار دیا۔ میرے دوست آپس میں گفت و شنید میں مشغول سست روی سے چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ پیچھے رہ گئے اور میں کافی آگے نکل آیا۔ جب مجھے اس بات کا احساس ہوا تو ہوش کی دنیا میں آ کر الٹے قدموں واپس ہولیا۔ میں راستہ بھٹک چکا تھا۔ میں نے دوستوں کو پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ یقیناً مجھ سے بہت دور تھے۔ مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا۔ کوئی خوف تو نہیں تھا، بس یوں اکیلا بے یار و مدد گار ہو جانے پر خود کو کوسنے لگا۔

میں واپسی کے راستے کی جانب اندازاً بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک عجیب بات جو میں نے محسوس کی وہ وہی تھی جو گزشتہ رات محسوس کی تھی۔ جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہو۔ میں سوچ کر ڈر گیا کہ کوئی جنگلی جانور نہ ہو۔ میں نے اپنی رفتار بڑھا دی پر وہ احساس بھی بڑھتا چلا گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں میں کہاں سے کہاں نکل گیا، یہاں تک کہ کسی اونچے ٹیلے کے سرے تک پہنچ کر ابھی گرنے کو تھا کہ کسی نے مجھے جیکٹ سے (جو میری کمر سے بندھی تھی) پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں بال بال بچ گیا، لمحوں میں اپنے حواس بحال کر کے میں نے مخالف سمت دیکھا تو وہاں ایک نقاب پوش لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

یہ بات میرے لئے عجیب تھی ایک بل کو میں یہ سمجھا تھا کہ مجھے میرے کسی دوست نے بچایا ہے مگر یہ لڑکی اچانک کہاں سے آ گئی تھی؟ میں کچھ پوچھتا کہ اس سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

''آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔'' اس کے لہجے میں فکر نمایاں تھی۔

''ج..... جی نہیں..... بالکل نہیں۔'' میں نے گڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑی لاپرواہ طبیعت کے مالک ہیں آپ۔ کیا ضرورت تھی اتنی دور افتادہ جگہ پر تنہا چلے آنے کی۔ اگر آپ یہاں سے گر جاتے تو آپ کی یہ ظلاناً حرکت آپ کی جان بھی لے سکتی تھی۔'' وہ جھجک اور تکلف کے سارے بندھن توڑ کر جیسے مجھ پر چڑھ دوڑی۔

میں ہکا بکا رہ گیا مگر اس کی آواز میں درد کی لہر اور لہجے میں بے بسی کے عنصر کو میں نے شدت سے محسوس کیا۔ میں شرمندہ سا ہوگیا، پھر گلا کھنکارنے کے بعد بولا۔

''جی آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے مجھے.....''

''یہ وقت شکریہ کا نہیں ہے۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے مجھے کا ندھوں سے پکڑ کر ایک بار پھر گہرائی سے دور کر دیا۔ شاید میں بے دھیانی میں ایک بار پھر گرنے کے قریب تھا۔ مجھے اپنی لاپرواہی پر سخت پشیمانی محسوس ہوئی۔ میں مرد ہو کر بھی ابھی تک ہچکچاہٹ کے مرحلے سے گزر رہا تھا اور وہ صنف نازک کس قدر خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''یہ وقت آپ کا اپنی منزل کی طرف لوٹنے کا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ راستہ بھٹک چکے ہیں۔ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو آپ کے دوستوں تک پہنچا دوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ایک طرف بڑھنے لگی تو میں جو، اب تک غائب دماغی سے اس کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا، ایک دم سے جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

''آپ کو یہ سب کیسے پتا؟''

"یکھیے فی الحال کچھ مت پوچھیے اور خاموشی سے میرے ساتھ نکل چلیے یوں سمجھ لیں کہ یہ جگہ آپ کے لئے مناسب نہیں، یہاں زیادہ وقت ٹھہرنا ہم دونوں کے لئے مشکل کھڑی کرسکتا ہے۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس بنی بے تکلفی پر میں محض تحیر آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ اپنی تمام ترحیرتوں کا مظاہرہ اپنے دوستوں کے سامنے کرلیجیے گا۔" وہ میری نگاہوں کا مفہوم بھانپ کر بولی اور میرا تھاما ہوا ہاتھ تقریباً کھینچ کر ایک طرف چل پڑی۔

عجیب لڑکی تھی، حیران پر حیران کئے جارہی تھی اور حیران ہونے بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے اپنا بھاری ہاتھ اس کی نرم و نازک ہتھیلی میں دیئے دشوار گزار راستے پر چلتا رہا۔ میری آنکھیں حیرت اور تعجب کے باعث ہنوز پھیلی ہوئی تھیں۔ ذہن میں کئی سوال تھے۔ جن کا جواب جاننے کی جرأت نہیں کر پارہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر میں کچھ کہنے کو تھا کہ اس نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر کچھ کہنے سے باز رکھا۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اسے گھورتا رہ گیا ایک جگہ رک کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور اشارے سے میری توجہ ایک جانب مبذول کرنے کی خاطر بولی۔

"وہ دیکھیے! آپ کا دوست وہاں ہے۔"

مجھے کافی دور عادل نظر آیا۔ پھر عابد اور کمال بھی دکھائی دیئے۔ ان کا انداز کچھ تلاش کرنے جیسا تھا۔ غالباً وہ مجھے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔

"اس سے پہلے کہ آپ کے دوستوں کی نظر مجھ پر پڑ جائے، مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گئی۔

"ارے ارے رکو..... سنو تو سہی۔" میں چلایا۔

"مجھے جانا ہوگا فراز، آپ کے سوالوں کے جوابات دینے کا یہ مناسب وقت نہیں ہے۔"

پھر وہ رکی نہیں۔ برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی کافی دور نکل گئی۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں سخت الجھن میں گرفتار ہوگیا اسے تو میرا نام تک معلوم تھا۔ جانے وہ کون تھی، کیا تھی، کسی سوال کا جواب تک نہیں دیا؟ جس طرح پراسراریت کے لبادے میں آئی تھی، ویسے ہی لوٹ گئی۔ میں کبیدہ خاطر اپنے دوستوں کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں عادل فطرت کے مطابق میری کلاس لینے کو تیار کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کے کوئی دو بجے تھے۔ کوارٹر میں تقریباً سارے لڑکے جاگ رہے تھے اور اپنی آج کی سفر بیتیاں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑا آج پیش آئے واقعہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے دوستوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ راستہ بھٹک جانے کے سوا انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے دماغ میں ابھی تک کئی سوال تھے۔ جن کے جواب میں خود کو اندازاً بھی نہیں دے پارہا تھا۔ کیسے دیتا؟ میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا پھر وہ مجھے کیسے جانتی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال کوندا۔ وہ پردے میں تھی، پردے کے پیچھے شاید کوئی بے تکلف شناسا ہو۔ مگر آواز بھی تو انجانی تھی اور وہ اس بیابان میں کیا کررہی تھی؟ سوالات تو بہرحال اب بھی پھن پھیلائے ناگ کی طرح کھڑے تھے اور میں جتنا سوچتا اتنا الجھتا جارہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔؟" عادل اٹھ کر میری طرف آگیا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔" میں ہوش کی دنیا میں لوٹا۔ مجھے عادل سے بے حد محبت تھی۔ وہ بلا کا سنجیدہ اور سخت مزاج تھا مگر دل کا بہت صاف تھا۔ بائیس سال کی کم عمری میں بھی وہ بہت میچور دماغ رکھتا تھا۔ بہترسے بہترین لطیفوں پر بھی اسے بمشکل ہنسی آتی۔ لاپرواہی اور سستی تو اسے چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ میں بھی اسے اتنا ہی عزیز تھا، جتنا کہ وہ مجھے۔

آج پہلی بار اس نے میرے مل جانے کے

بعد میری کوئی کلاس نہ لی تھی۔ میں نے اسے متفکر دیکھا تھا اور میرے اس کے سامنے جاتے ہی اس کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات اجاگر ہوئے تھے۔ وہ یکلخت مجھ سے خلاف توقع لپٹ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے محض ایک ہی سوال میرے کھو جانے کے حوالے سے پوچھا تھا۔ جس کا جواب میں نے راستہ بھول جانے کے الفاظ کی صورت میں دیا تھا۔ اس نے مزید کوئی استفسار کیا اور مجھے اپنے ساتھ لگائے واپس لے آیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی بے لوث محبت کو محسوس کیا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو فراز، میں واضح طور پر محسوس کررہا ہوں کہ تم آج صبح سے کہیں کھوئے ہوئے ہو۔" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم میرے ساتھ ذرا باہر چلو، میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔" میں اس سے اب کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا۔

"مگر اس وقت..... دو بج رہے ہیں یار۔" اس نے عادتاً پھرسے بوڑھوں کی طرح فکر کا مظاہرہ کیا۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔ میری بات زیادہ ضروری ہے۔" میں اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا اور سڑک پر چلتے چلتے میں نے اسے ساری روداد سنادی۔

"کیا واقعی تم سچ بول رہے ہو۔؟" اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا تھا۔ وہ حیرت کی تصویر بنا میرا منہ تکنے لگا۔

"میں تم سے جھوٹ کیسے بھول سکتا ہوں، میں تو خود پریشان ہوں کہ جانے وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی۔؟"

"اچھا تم زیادہ ذہن پر زور مت ڈالو وہ ضرور ان نیکی کے فرشتوں میں سے ہوگا جو کسی نہ کسی روپ میں انسانوں کی بھلائی کے لئے آجاتے ہیں۔" وہ مجھے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا اسی لئے اپنی دانست میں زبردست دلیل پیش کی۔

"پھر اس نے ایسا کیوں کہا کہ یہ جگہ ہم دونوں کے لئے نامناسب ہے اور ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔؟" میرے پاس بھی سوالات کی کمی نہ تھی۔

"فرشتوں کو اپنا فرض جلد سے جلد انجام دینا ہوتا ہے۔ وہ ہم انسانوں کی طرح وقت برباد نہیں کرتے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر فوراً سے پیشتر اپنا کام نمٹا لیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ شاید اسی لئے تمہاری توجہ ابھی تک اسی طرف ہے۔ تم اس واقعہ کو بھول جاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔" عادل نے تعقیباً سمجھا کر تسلی دی اور میرا ہاتھ تھام کر واپس کوارٹر کی سمت مڑ گیا۔

ہم سب ایک ہفتے کے لئے آئے تھے۔ چار روز گزر چکے تھے مگر برف باری کے اب بھی کوئی امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ میرے امیرزادے یونیورسٹی فیلوز، جو صرف برف سے کھیلنے آئے تھے، بیزار ہونے لگے۔ ان میں سے کئی لڑکے کرائے کی کوسٹر کی پرواہ کئے بنا واپس حیدرآباد لوٹ گئے۔ میرے دوست بھی ان کی دیکھا دیکھی واپسی کا پروگرام بنانے لگے جنہیں عادل نے ناراض ہوکر روک لیا۔ عادل کو برف کا شوق نہ تھا۔ وہ یہاں اتنا پرسکون تھا کہ پورا ہفتہ گزارنے کے بعد ہی لوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ایک رات میں سونے کی ناکام کوشش کررہا تھا کہ اچانک میرے بستر کے قریب ایک چھوٹا سا پتھر آن گرا۔ سارے دوست گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے حیرت سے کھڑکی کی سمت دیکھا اور پھر اس پتھر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس پتھر پر ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ میں نے عجلت میں اسے کھولا ۱۸ اور اس پر لکھی عبارت پڑھ کر دنگ رہ گیا۔

"باہر آؤ فراز..... میں تمہاری منتظر ہوں۔"

اس مختصر جملے نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کردیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ پیغام اسی نقاب پوش لڑکی کی جانب سے بھیجا گیا ہے، جس کو دن گزرنے کے بعد بھی میں بھول نہیں پایا تھا۔ میں نے دستی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ دو بجنے والے تھے۔

"اتنی رات کو وہ باہر کیا کررہی ہے۔؟" میں

نے خود کلامی کی اور فوراً اٹھ کر باہر چلا گیا۔ مجھے اس کی فکر تھی۔ آخر وہ میری محسنہ تھی مجھ پر اس کا کیا گیا احسان میں کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا تھا۔

باہر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ میں نے ایک سرسری نگاہ چاروں طرف دوڑائی اور واپسی کا سوچ ہی رہا تھا کہ یکا یک خاردار جھاڑیوں کے عقب سے کسی کے گزرنے کی آواز سن کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے اس جانب دیکھا پر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں شکستہ قدموں سے لوٹنے لگا۔ کوارٹر کے دروازے تک پہنچا تو اسی شناسا نسوانی آواز نے پکارلیا۔

"ٹھہرو فراز..... مجھے سے ملے بنا ہی جارہے ہو۔"

میں فوراً مڑا، وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

نقاب آج بھی اس کا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ وہ ساکت کھڑی مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔

"تم..... مجھے یقین تھا کہ تم ہی ہوگی۔ اتنی رات کو یہاں کیا کررہی ہو؟ مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا تھا مگر تم....."

"میں تمہیں سب کچھ بتانے آئی ہوں۔ تمہاری الجھن دور کرنے کی خاطر مجھے آنا پڑا۔" اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا پھر میرے قریب آکر گویا ہوئی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" اس نے اس روز کی طرح آج بھی میرا ہاتھ تھام لیا اور ایک طرف چل پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ایسے چل رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

سڑک پار کر کے درختوں کے درمیان سے گزر کر وہ مجھے ایک کنویں کے پاس لے گئی۔ میں نے وہ کنواں وہاں پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس سے پہلے دوستوں کے ساتھ وہاں سے کئی بار گزرا تھا۔ مگر وہ کنواں پہلے کبھی وہاں دکھائی نہیں دیا تھا۔ چاند کی روشنی سے وہاں سب کچھ واضح نظر آرہا تھا۔ کنویں کے قریب رکھے بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک پر وہ بیٹھ گئی اور دوسرے پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا تو کچھ توقف کے بعد بولی۔

"فراز..... میرا نام حسنہ ہے۔ میں ایک باپردہ لڑکی ہوں، آج تک کسی نامحرم نے میرا چہرہ نہیں دیکھا۔ تمہارے سوا کوئی نامحرم مجھے چھو بھی نہیں سکا۔ تمہاری طرح میری پیدائش بھی حیدرآباد کی ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ تمہیں ایک درگاہ پر دیکھا تھا۔ وہاں تم امتحانات میں کامیابی کے لئے منت ماننے آئے تھے، میں وہیں تم پر فدا ہوگئی، اس پل سے میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں مگر کبھی تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہ کر پائی۔ میں نے کئی بار تمہاری مدد کی ہے مگر تمہیں بھنک تک نہ پڑنے دی۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک میں تمہیں ہر مشکل سے بچاتی آرہی ہوں۔ تم سے جس نے بھی جھگڑا کیا، میں اس کا جینا محال کردیتی۔ کالج کے بدمعاش لڑکوں نے تمہیں اور تمہارے دوستوں کو تنگ کیا ہوا تھا۔ پھر وہ لڑکے بھی اس کالج میں نظر نہ آئے، اس کے پیچھے بھی میرا ہاتھ تھا۔"

میں حیرت کے سمندر میں ڈوبا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ جو کچھ بول رہی تھی، بے شک وہ سب سچ تھا۔

"ایک بار ایک لٹیرے نے راہ چلتے گن پوائنٹ پر تم سے تمہارا موبائل فون اور والٹ چھین لیا تھا۔ گلے روز وہ دونوں چیزیں تمہیں تمہارے بیگ میں سے ملی تھیں۔ وہ بھی میرا کام تھا۔ میں تمہاری لاپرواہی سے سخت نالاں رہا کرتی تھی۔ جبھی تم پر ہر وقت نظر رکھتی تھی۔"

مجھے پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ مجھے آج بھی یاد تھا۔ میں اور میرے دوست اس وقت سمجھ نہیں پائے تھے کہ میرا موبائل اور والٹ میرے بیگ میں واپس کیسے آگئے۔

اب سمجھ آرہا تھا کہ یہ لڑکی کتنے سالوں سے میرے ساتھ تھی۔ گراں تے قابل یقین کام وہ کیسے کرگئی اور مجھے کبھی بھی اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں نظر کیوں نہ آئی؟ میں وہ تمام باتیں سوچ بھی رہا تھا اور اس کے کئے جانے والے انکشافات پر میرا پورا دھیان بھی تھا۔

"میرا چھوٹا بھائی یوسف بھی تمہارے لئے میری چاہت دیکھ کر خوش تھا۔ اس نے تمہاری مدد کرنے

کے لئے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔ وہ بھی تمہارا خفیہ طور پر ساتھ دیتا رہا مگر کبھی ہوا تک لگنے نہ دی۔ پھر جب تم نے مری آنے کا ارادہ کیا تو تمہارے پیچھے میں بھی یہاں آگئی اور تمہارا پل پل خیال رکھنے لگی۔ تمہیں جب بھی کسی کی آہٹ محسوس ہوتی، تم ڈر جاتے یا پھر ڈرتے نہیں تو چوکنے ضرور ہوجاتے۔ وہ ہر آہٹ میری ہوتی تھی۔ مجھے تمہارا رات گئے باہر نکلنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس دن جب تم چٹان سے گرنے والے تھے تو مجبوراً مجھے خود کو تم پر ظاہر کرنا پڑا اور نہ تمہارے گرنے کے بعد اسپتال پہنچانے کے لئے بھی وہاں کوئی ذی روح نہ آتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولتی چلی جارہی تھی۔

"ٹھہرو..... میری بات سنو....." میں نے ایک دم اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔

"تم جو کچھ بول رہی ہو، اس سے میری الجھن مزید بڑھ رہی ہے۔ تم کون ہو؟ کیا یوسف کون ہے؟ تم مجھے بھی کالج یا یونیورسٹی میں بھی نظر نہیں آئیں تمہاری باتیں سو فیصد سچ ہیں مگر پھر بھی میرے سر سے گزر رہی ہیں۔ تم اپنے چہرے سے نقاب ہٹاؤ۔ شاید میں تمہیں پہچان لوں۔" میں نے اپنی اصل الجھن یعنی نقاب ہٹانے کی خواہش بالآخر ظاہر کر ہی دی۔

"میں اگر نقاب ہٹا بھی دوں، تب بھی تم مجھے نہیں پہچانو گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ بے پردہ کردیا۔

چہرہ دیکھتے ہی میں جیسے نظر ہٹانا بھول گیا، اتنا حسین، اتنی معصومیت، میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا خوبصورت چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کھڑکی کی صباحت میرے دل میں اتر گئی۔ چاند کی روشنی میں وہ چاند کا ہی عکس لگ رہی تھی۔ واقعی میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کے حسن میں کھو کر اپنی تمام الجھنیں بھول گیا۔

"اب مجھے جانا ہوگا فراز۔" شاید وہ بے نقاب ہو کر اداس ہوگئی تھی۔

"نہیں حسنہ پلیز رکو..... ابھی مت جاؤ، میرے ساتھ کچھ پل تو بیٹھو۔" میں جیسے دیوانگی کے عالم میں بول رہا تھا۔

"یہ میرے جانے کا وقت ہے فراز۔ میں مزید ٹھہری تو یہ ہم دونوں کے لئے نامناسب ہوگا۔"

"ہاں تم نے پہلے بھی ایسا کہا تھا۔ اس کی وجہ بھی بتادو۔؟" میں جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹا۔

"میرے بابا جان مجھے ڈھونڈنے نکل گئے تو بہت مشکل کھڑی ہوجائے گی۔" وہ بے چین تھی۔

"تمہارے دل میں میرے لئے کیا جذبات ہیں، یہ جاننے کے لئے میں پھر آؤں گی۔ تم میرا انتظار کرنا چلتی ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر تیزی سے چلتی بنی۔ میں اس کے پیچھے لپکا مگر وہ نہ جانے کہاں اچانک نکل گئی اور میں دل مسوستا ہوا واپس کوارٹر کی طرف لوٹ آیا۔

☆.....☆.....☆

ہم سب دوست اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ آج ہمیں حیدرآباد لوٹ جانا تھا۔ سامان باندھنے کے بعد بھی لوٹنے کے وقت تقریباً پانچ گھنٹوں بعد تھا۔ ہم فارغ ہوئے تو میں نے سوچا حادل کو سب کچھ بتادوں۔ مگر میرے باقی دوست ساتھ ہی تھے۔ ان کی موجودگی میں، میں کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں حسنہ کو لے کر اب بھی کئی سوال تھے۔ مگر اس کے باوجود میں آج کسی بھی الجھن میں گرفتار نہ تھا۔ بے چینی تھی تو محض اتنی کہ میں اس سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ اس کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اس کا حیدرآباد سے اتنا دور تنہا چلے آنا، آدھی رات کو اکیلے مجھ سے ملنے آنا، لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوجانا، تعلیمی اداروں میں مجھے نظر آئے بنا ہی میری مدد کرتے رہنا، یہ سب باتیں سمجھنا شعور کی وسعتوں سے بھی بالاتر تھا۔ میں نے ان باتوں میں خود کو الجھانا چھوڑ دیا تھا۔ میں بس اسے ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے اقرار کرنا چاہتا تھا کہ مجھے بھی اس سے شدید محبت ہوگئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھا کر سب لڑکے قیلولہ کرنے لگے

تب میں باہر نکل گیا۔ اس کو تلاش کرنے کی غرض سے ٹہلتا رہا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں لوٹ آیا۔ شام کو ہماری کوسٹر حیدر آباد روانہ ہوگئی، میں راستے بھر مضطرب رہا کہ جانے اس سے پھر کب ملاقات ہوگی۔

ہم بخیر و عافیت گھر پہنچ گئے۔ میرے گھر پر تالا لگا تھا۔ سب گھر والے کسی عزیز کے ہاں شاید دعوت میں مدعو تھے۔ میں نے پڑوس سے چابی لی اور گھر میں اپنے کمرے میں آکر ستانے لگا۔ میری آنکھ لگ گئی اور خواب میں وہی پری وش دکھائی دی جو بھیانک روپ والے لوگوں کے درمیان تھی۔ وہ خوش نظر آرہی تھی۔ اسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ ان بھیانک لوگوں کو کھانا پیش کررہی تھی۔

اچانک ڈوربیل کی چنگھاڑتی آواز سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھر والے آگئے تھے، مجھ سے مل کر خوشی کا اظہار کرکے سب ایک ایک کرکے سونے چلے گئے۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن حنا کو روک لیا۔ چونکہ وہ بھی میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اس لئے میں نے اسے دبے لفظوں میں حسنہ کے متعلق استفسار کیا۔ اس نے مکمل طور پر لاعلمی کا اظہار کیا اور سونے چلی گئی۔ میں ایک بار پھر حسنہ اور اس عجیب خواب کے بارے میں سوچنے لگا اور انہی باتوں کو سوچتے سوچتے میں سوگیا۔

اگلی صبح میری آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ پھر بھی خمار آلود آنکھیں نیند پوری نہ ہونے کے باعث جل رہی تھیں۔ مجھے یاد تھا کہ مری میں، میں نے نیندیں بہت کم لی تھیں۔ خیر انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھ گیا۔ نہا دھو کر فریش ہوا اور ناشتہ وغیرہ کرکے ویٹ لفٹنگ کلب چلا گیا۔ وہاں عادل بھی آتا تھا۔ ہم دونوں کسرت چھوڑ کر سفر کی باتوں میں لگ گئے۔ میں نے موقع کی مناسبت سے اس کو حسنہ کے متعلق سب کچھ بتادیا۔

"اوہ..... اس کا مطلب وہ کوئی فرشتہ نہیں تھی۔" عادل معنی خیزی سے بولا۔

"ہاں یار..... مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ ضرور انسان ہوگی۔" میں نے اپنا دیرینہ خیال پیش کیا۔

"انسان..... ؟ نہیں انسان ہرگز نہیں ہوسکتی وہ۔ یونیورسٹی میں تمہیں وہ کبھی نظر نہیں آئی۔ ایک نادیدہ کنوئیں کے پاس آدھی رات کو وہ تمہیں ملے گی۔ پل میں آئی اور پلک جھپکتے رفو چکر ہوجاتی۔ وہ انسان کیسے ہوسکتی ہے۔؟ اس کی ہر بات عجیب تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ کوئی ماورائی مخلوق تھی۔" عادل نے میرے خیال کی تردید کی۔

"ایسا مت کہو۔" میں تڑپ اٹھا۔

"تو کیا تمہیں اب بھی اس سے ملنے کی امید ہے۔؟" اس نے تمسخرانہ لہجے میں چوٹ کی۔

"ہاں..... بالکل میں اس سے ملوں گا۔ ہم یہاں آگئے ہیں تو ضرور وہ بھی لوٹ آئی ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈنے کے لئے پورا حیدر آباد چھان ماروں گا۔ وہ کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گی۔" میں جذب کے عالم میں بولا تو عادل سارا مذاق بھول کر عادتاً سنجیدہ ہوگیا۔

"پاگل مت بنو فراز..... ہوش کے ناخن لو میرے سمجھانے پر بھی تمہارے پلے کچھ نہیں پڑا۔ وہ ایک دوسری مخلوق ہے۔ غیر مرئی مخلوق نہ جانے کیا سوچ کر، کس نیت سے وہ تمہاری زندگی میں آئی ہے، کیا چاہتی ہے، یہ سمجھنا ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ مخلوق پہلے خود کو بے حد خوبصورت ظاہر کرکے اپنے حسن کے حامل میں پھانس لیتی ہے اور پھر اپنے کیا مقاصد پورے کرتی ہے، یہ نہ میں جانتا ہوں اور نہ تم۔" وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔؟"

"تمہیں کسی اچھے اور دین دار عامل سے رجوع کرنا چاہئے۔ چلو تمہاری یہ مشکل میں دور کئے دیتا ہوں۔ میں ایک بہت اچھے عامل کو جانتا ہوں میری پھوپھی کے جسم پر ایک سرکش جن قابض ہوگیا تھا، جسے اسی عامل نے مار بھگایا۔ میں تمہیں اس عامل کا پتہ دیتا ہوں۔ وہاں تمہیں تمہارے تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے۔ مجھے پوری امید ہے۔" عادل

نے بنا وقت برباد کئے مجھے پتہ لکھ دیا اور اسی وقت عامل کے پاس بھیجنے پر مصر ہوگیا۔ بہر کیف مجھے جانا پڑا۔

عامل صاحب کا آستانہ کافی دور تھا۔ وہاں پہنچنے کے لئے ایک نہایت سنسان علاقے سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں اپنی بائیک تیزی سے دوڑا رہا تھا دھوپ کی تمازت سے بائیک بہت گرم ہورہی تھی میرے انگ انگ میں گرمی کے باعث سوئیاں سی چبھ رہی تھی تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا کے تھپیڑے قدرے راحت دے رہے تھے اسی پل میں اس غیر آباد علاقے تک پہنچا کہ اچانک میری نظر ایک برقع پوش خاتون پر پڑی۔ وہ سڑک کنارے ایک درخت کے سائے تلے بیٹھی تھی۔ اس نے غالباً ٹوپی والا برقع پہن رکھا تھا۔ ایسی سنسان جگہ پر تن تنہا عورت کو دیکھ کر مجھ کو کچھ تشویش لاحق ہوئی۔

"کیا آپ کو کوئی مدد درکار ہے خاتون۔؟" میں نے بائیک اس کے قریب روک کر پوچھا۔

"جی مجھے بس کا انتظار ہے۔ وہ آئے گی تو میں چلی جاؤں گی۔ آپ کا شکریہ۔" اس نے بنا ہچکچاتے جواب دیا۔ آواز سے وہ کوئی نوجوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

"دیکھیں اس طرح آپ کا یہاں تنہا کھڑے رہنا مناسب نہیں آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچادوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔" میں یقین دلانے والے انداز میں بولا تو وہ بنا اعتراض کئے بائیک پر بیٹھ گئی۔ میں پھر سے بائیک دوڑانے لگا۔

"کہاں جائیں گی آپ۔؟" میں نے دوران سفر پوچھا۔

"جی میں پیر حشمت علی کے آستانے جاؤں گی۔ وہ قریب پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد آئے گا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"آرے واہ..... میں بھی وہیں جارہا ہوں۔ چلو اچھا ہے اب کسی سے راستہ نہیں پوچھنا پڑے گا۔" میں نے خوش دلی سے کہا تو وہ محض "جی" کہہ کر رہ گئی۔

اس کے بعد ہمارے بیچ کوئی گفتگو نہ ہوئی جب ہم آستانے کے قریب پہنچے تب اس نے مجھے مطلع کیا اور میں نے بائیک دیگر موٹر سائیکلوں کے درمیان پارک کردی ہم دونوں ساتھ ہی اندر داخل ہوئے دالان سے گزر کر ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں پہنچے جہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان تفاوت کرنے کے لئے بیچ میں ایک طویل سفید چادر دیوار کے طور پر بندھی ہوئی تھی میں مردوں کی بیٹھک میں چلا گیا۔ چند ہی مرد بیٹھے تھے قریب آدھے گھنٹے بعد میری باری آئی تو میں آگے کی طرف پیر حشمت علی کے سامنے جا بیٹھا۔

وہ ایک باریش نورانی چہرے والے خوبصورت بزرگ تھے وہ جگہ بھی نہایت معطر اور پاک صاف تھی۔ قرآنی سورتوں کی تختیاں دیوار پر نصب تھیں۔ وہاں کا ماحول بتا رہا تھا کہ میں ایک نہایت نیک بزرگ کے سامنے ہوں۔ سفلی عملیات کرنے والے عاملوں کے آستانوں کی طرح انسانی کھوپڑیاں اور ان سے اٹھنے والی تعفن اور خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہاں کا نورانی ماحول دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا۔

وہ بزرگ کافی کم گو تھے۔ مجھے محض ایک نظر دیکھ کر پھر اپنے آپ میں مگن ہوکر پوچھنے لگے۔

"نام بتایئے۔"

"ج..... جی..... فراز..... فراز احمد۔" میں جو وہاں کے ماحول میں کھویا ہوا تھا، یکدم سٹپٹا گیا۔

"والدہ کا نام۔؟" وہ ہنوز معروف تھے۔

"جی رضیہ بانو۔" میں اب پوری طرح متوجہ تھا۔

"اچھا..... !" اتنا کہہ کر وہ ایک ڈائری میں کچھ لکھنے لگے۔

"ٹھیک ہے جناب، اب اپنا مسئلہ بتایئے۔" کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئے۔

"جی..... " میں ایک بار پھر سٹپٹا گیا۔ مجھے وہ وقت کے پابند محسوس ہوئے تھے اور میرے پاس تو ایک طویل قصہ تھا۔ میں فاتحہ کیسے سنا دیتا۔ دوسرے مجھے سے بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں شروع کہاں سے کروں۔ بہر حال سوچنے کا بھی وقت ختم ہوگیا۔ اب بھی نہ بولتا تو

وہ ضرور ٹوٹ کے۔ میں نے جیسے تیسے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر انہیں سارا قصہ سنا دیا اور آخر میں کہا۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے۔؟" انہیں تفصیلات بتاتے بتاتے شرم اور ہچکچاہٹ سے میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں بیٹا۔ بے شک حسنہ ایک جن زادی ہے، مگر اس کا تعلق ایک پاک اور مسلم گھرانے سے ہے۔ جنات بھی خدا کی بنائی ہوئی مخلوق ہے۔ ان کا رہن سہن، رسم و رواج، سب انسانوں جیسا ہی ہوتا ہے ان میں انسانوں کی ہی طرح مختلف مذاہب، فرقے اور مسلک بھی ہوتے ہیں تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ پاک جن زادی سرکش نہیں ہے۔ بہت نیک اور باپردہ ہے وہ تمہیں کسی بھی طرح کوئی بھی اذیت اور تکلیف پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" انہوں نے گویا مجھے تسلی دی مگر میں جیسے پتھر کی مورتی بن گیا۔

اس انکشاف نے مجھے کسی حد تک رنجیدہ کر دیا تھا کہ حسنہ انسان نہیں تھی۔

"بالآخر وہ چاہتی ہے کیا۔؟" میں نے کبیدہ خاطر پھیلا سوال پھر سے پوچھ ڈالا۔

"تمہیں چاہتی ہے وہ۔ شرعاً نکاح کرنا چاہتی ہے تم سے۔" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا تو میں جیسے یکدم سے زندہ ہو گیا۔

"کیا۔؟ کیا اس سے میرا نکاح ہو سکتا ہے؟" مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"تم چاہو تو ضرور ہو سکتا ہے۔" وہ پرسکون تھے۔

"مگر..... وہ تو کوئی اور مخلوق ہے۔ کیسے ہو گا یہ سب؟ ہماری زندگی کیسی گزرے گی؟ مجھے..... مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔؟" میرے ذہن میں کئی سوالات تھے، جو مجھے الجھا رہے تھے۔

"یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ دیکھو تم دنیا کے پہلے انسان نہیں ہو جس کی نسبت اس مخلوق سے ہو رہی ہو۔ ایسی بے شمار شادیاں ہو چکی ہیں اور کامیاب بھی رہی ہیں۔ یہ تم پر ہے کہ تمہیں اپنی ازدواجی زندگی کیسے گزارنی ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہ رشتہ کر لو۔ وہ لڑکی تمہاری زندگی بدل دے گی۔" وہ ایک پل کو رکے اور پھر بولے۔

"دیکھو میرے زائچے کے مطابق وہ جن زادی یہاں قریب ہی ہے۔ شاید باہر تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے جو بھی سوالات تمہارے من میں ہیں اس سے پوچھ لینا۔ ٹھیک ہے اب تم خیر سے جاؤ بیٹا۔" ان کے لہجے کی طمانیت نے مجھے بہت تسلی دی۔

"آپ کی فیس۔؟" میں نے اٹھنے سے پہلے پوچھا تو وہ دھیمے سے مسکرا دیے۔

"فیس کسی بیٹا، یہ آستانے میں خدا کی رضا اور خلق خدا کی خدمت کے لئے بنایا ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔" وہ پھر سے اپنے کام میں منہمک ہو گئے تو میں باہر چلا آیا۔

باہر رکھی چندے کی پیٹی پر میری نظر پڑی تو میں نے اس میں پانچ سو روپے ڈال دیے۔ پھر دالان سے گزر کر باہر آیا تو اپنی بائیک کے پاس اسی برقع پوش لڑکی کو موجود پایا۔

"غالباً آپ کو پھر سے لفٹ چاہئے محترمہ۔" میں نے قریب جاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ضرور چاہئے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے اس کی سمت بغور دیکھا اس کی آواز اب کچھ اور تھی، جسے میں لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔

"حسنہ..... تم؟" میں نے برجستگی سے پوچھا۔

"ہاں میں ہوں۔" وہ اتنا ہی بولی۔

"مگر..... پہلے تو تمہاری آواز کچھ اور تھی۔" مجھے واقعی امید نہیں تھی کہ یہ برقع پوش لڑکی حسنہ ہو سکتی تھی۔

"وہ میں نہیں تھی۔ وہ لڑکی کوئی اور ہے۔ وہ اب بھی آستانے میں موجود ہے میں نے تو بس اس کا روپ دھارا ہے۔ تاکہ آس پاس کے لوگوں کو ہم پر شک نہ ہو۔ یہ بے حد شریف خطہ ہے۔" اس نے وضاحت کی

عشق، عشق، عشق،

ردا بری طرح بوکھلا چکی تھی اور اس کے پیچھے لپکی ثمر اس کے جانے سے پہلے اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ ردا کے ہاتھ پاؤں بری طرح پھول چکے تھے کہ کہیں یہ کچھ الٹا سیدھا نہ کر لے..... اس نے بھاگ کر اماں اور ولید کو بلایا اور تینوں مل کر دروازہ بجانے لگے مگر اندر گہری خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا آخر ردا نے ماں کو مختصر بتایا کہ کیا ہوا تھا' دوسری طرف ولید دروازہ توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ آخر وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ عشق اور محبت کے شکنجے میں گرفتار اپنی نوعیت کا ایک انوکھا ناول۔

شازیہ رانا

قیمت -/300 روپے

شمع بک کارنر امین پور بازار فیصل آباد

اور مجھے پیر صاحب کی بات یاد آئی کہ حسنہ مجھے باہر ملے گی۔ میں من ہی من میں پیر صاحب کا مرید ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مجھے فوراً سے پیشتر وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے فوراً اسے بائیک پر بیٹھا کر وہاں سے واپسی کی راہ لی۔

وہ مجھے ایک انتہائی سنسان، جنگل نما علاقے میں لے آئی۔ میں نے بائیک ایک درخت کے سائے تلے کھڑی کر دی اور اس کے ساتھ خود رو گھاس پر بیٹھ گیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم پیر حشمت علی کے آستانے پر کیوں گئے تھے اور میں نے تمہاری وہاں ہونے والی تمام گفتگو بھی سن لی تھی۔'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہاں شاید میں جانتا ہوں کہ تم نے سب سن لیا ہے ورنہ وہاں تم اس بات کا اقرار نہ کرتیں کہ تم کسی اور لڑکی کا روپ دھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔'' میرے لہجے میں طنز اور شکایت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''میں تمہیں اپنی حقیقت بتانے کا بارہا ارادہ کر چکی ہوں۔ مگر کبھی بھی عملی اقدامات نہیں اٹھا پائی۔ صرف تمہیں کھونے کے ڈر سے۔'' غالباً وہ میری شکایت بھانپ گئی تھی۔

''مجھے بھروسہ ہے تم پر حسنہ، میں مانتا ہوں کہ تم مجھ سے سالوں سے سچی اور بے لوث محبت کرتی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں انسان ہوں اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں بھی تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔'' میں اس سے مزید ناراض نہیں رہ سکتا تھا اس لئے فوراً ہتھیار ڈال کر اپنی محبت کا اقرار کر لیا۔

''سچ فراز.....'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی در آئی۔

''بالکل سچ۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا پھر جذبات عشق میں مغلوب ہو کر اسے بانہوں میں سمیٹنے کو آگے بڑھا تو وہ خود میں سمٹنے لگی۔

''نہیں فراز.....رک جاؤ۔'' وہ التجائی لہجے میں بولی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں ٹھہر گیا۔

''ابھی تم میرے لئے نامحرم ہو۔ فی الحال ہمیں یہ فاصلہ برقرار رکھنا ہوگا۔'' اس کے انداز میں حیا سموئی تھی۔ میں بدمزہ سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

''پھر بتاؤ.....کب کریں نکاح؟'' میں نے کچھ توقف کے بعد شوخی بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ شرم و حیا کے مارے مزید سمٹ گئی۔

''حسنہ.....!'' اسی پل کسی نے اس قدر زور دار آواز میں اس کو پکارا کہ میرا کلیجہ کانپ اٹھا۔ حسنہ بھی گھبرا گئی۔

ہم دونوں نے بجلت میں آواز کی سمت دیکھا تو میں مزید دہشت زدہ ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے پاس انتہائی خوف ناک شخص نظر آیا۔ اس کی آنکھیں جلتے کوئلے کی طرح سرخ تھیں سر پر کسی بیل جیسے سینگ تھے۔ لباس عجیب سا سجھ سے باہر تھا اور چہرہ ایسا کہ میں نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں پایا۔

وہ بجلی کی رفتار سے قریب آیا اور حسنہ کا ہاتھ پکڑ کر سمت نائب ہو گیا۔

میں نے حیرت سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر اب وہاں اکیلا تھا۔ میں ایک دم سے خوف زدہ ہو گیا اور نجیدہ دل کے ساتھ اپنی بائیک پر بیٹھ کر وہاں سے نکل بھاگا۔

گھر پہنچتے پہنچتے جسم میں کپکپاہٹ نے گھر کر لیا۔ مجھے بخار چڑھنے لگا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گیا۔ میری بہن حنا نے میری حالت دیکھی تو چلاتی ہوئی ابو کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو سب گھر والے میرے کمرے میں موجود تھے۔ امی میری پیشانی پر گیلا کپڑا رکھ اور اتار رہی تھیں۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ سب نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے جیسے تیسے کر کے سب کو بمشکل مطمئن کیا۔

کچھ دیر بعد عادل آ گیا۔ شاید گھر والوں نے اسے میرے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا تو سب باہر چلے گئے۔

''یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا؟ تم تو پیر صاحب کے پاس گئے تھے۔'' وہ متفکر سا میرے قریب آ بیٹھا۔

''ہاں.....وہاں ایک لڑکی پر سے آسیب اتارا جا رہا تھا اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر مجھے بخار چڑھ آیا۔'' میں نے صاف جھوٹ بول دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ حقیقت جان کر عادل مجھے دیوانہ سمجھا تا رہے گا۔ جس کے لئے میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں ایسا ہوتا رہتا ہے ان آستانوں میں، تم بے فکر ہو ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' عادل نے مجھے غیر مترقبہ طور پر جلد ہی چھوڑ دیا اور حیرت انگیز بات یہ کہ حسنہ کے انکشاف سے متعلق بھی کچھ نہ پوچھا وہ کچھ دیر بیٹھ کر واپس لوٹ گیا۔

میں اگلے ہی روز بالکل ٹھیک ہو گیا میرے دماغ میں حسنہ اور وہ بھیانک شخص ہر وقت سوار تھے۔ میں اب بھی نہ سمجھ پایا تھا کہ آخر وہ کون تھا۔ اتنا تو مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھی حسنہ کی طرح کوئی اور مخلوق تھی۔ مجھے یہ تشویش لاحق تھی کہ وہ شخص حسنہ کو کہاں اور کیوں لے کر گیا تھا؟

عصر کی اذان ہوئی تو میں مسجد چلا گیا۔ نماز کے بعد میں دعا مانگنے لگا تو کسی کی نظروں کی تپش محسوس ہونے لگی۔ میں نے اس سمت دیکھا تو ایک باریش اور نورانی چہرے والا ایک نوجوان لڑکا سامنے والی صف میں بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے زیادہ توجہ نہ دی اور پھر سے دعا مانگنے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران وہ مجھے ہی دیکھتا رہا۔ اب مجھے الجھن سی ہونے لگی، میں نے بجلت میں دعا مکمل کی اور مسجد سے باہر چلا آیا۔ ابھی چپل ہی پہن رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔

''ٹھہریں فراز بھائی۔'' یہ اسی لڑکے کی آواز تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ قریب چلا آیا۔

''فراز بھائی.....میرا نام یوسف ہے۔ میں حسنہ کا چھوٹا بھائی ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا تو میں چونک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ مزید بولا۔

''مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ واپس مسجد میں چلیں۔'' اس کا لہجہ اضطرابی تھا۔ میں بنا کسی اعتراض کے اس کی ہمراہی میں مسجد کے اندر چلا گیا۔

ایک کونے میں بیٹھ کر اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات شروع کی۔

''فراز بھائی ہم جنات ہیں۔ شاید آپ ہمارے متعلق اب تک سب کچھ جان چکے ہوں گے اس لئے میں تفصیلات بتانے کی بجائے اہم بات کی طرف آتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ حسنہ سے شادی کرنے کے معاملے میں سنجیدہ ہیں۔'' اس نے نہایت مہذب لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں میں حسنہ سے رشتہ کرنے کے لئے تیار ہوں، مگر وہ اس وقت کہاں ہے۔؟'' میں نے اثبات میں جواب دے کر من میں دبا سوال پوچھ ڈالا۔

''وہ اس وقت ہمارے گھر میں ہے مگر بہت مشکل میں ہے۔'' اس کی آواز میں درد تھا۔

''کیسی مشکل۔؟'' میں بے چین ہو گیا۔

''میرے بابا جان نے اسے آپ کے ساتھ خلوت میں دیکھ لیا تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ حسنہ لاکھ ان کی لاڈلی سہی مگر ایک نامحرم کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر وہ مشتعل ہو کر اسے آپ کے سامنے وہاں سے گھر لے گئے۔ انہوں نے بس حسنہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا ورنہ تو بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا حسنہ کا تو رو رو کر برا حال ہے۔''

''کیا؟ وہ تمہارے بابا جان تھے۔؟'' مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس خوف ناک شخص کے تصور سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی۔

''جی ہاں، جس روپ میں آپ نے انہیں دیکھا، وہی ہمارا اصل روپ ہے۔'' حیرت انگیز طور پر وہ میرے دل کی بات سمجھ گیا۔

''بہرحال اگر آپ شادی کے لئے تیار ہیں

تو آپ کو اس وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا، اور آپ فکر نہ کریں حسنہ کا اصل روپ وہی ہے جو آپ نے دیکھا ہے۔" وہ بلا کا ذہین لڑکا تھا۔ میری سوچوں تک کو پڑھ لیتا تھا۔ میں خجل سا ہو کر سر جھکا گیا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "اپنی آنکھیں بند کریں۔" میں نے آنکھیں بند کیں تو اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

ابھی لمحہ ہی گزرا تھا کہ مجھے آنکھیں کھولنے کے لئے کہا گیا۔

وہ ایک نہایت عجیب جگہ تھی۔ چاہِ زمین پر بانس لگے تھے جن کے بالائی سرے پر مشعلیں تھیں۔ حالانکہ ابھی رات نہ ہوئی تھی چاروں طرف کچے مکانات نظر آرہے تھے۔ کچھ خیمے تھے اور کچھ کلوی اور کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے گھر۔ میں متحیر سا گردوپیش کا جائزہ لیتا ہوا یوسف کی ہمراہی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک مکان کے قریب پہنچ کر یوسف اندر داخل ہونے لگا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

ایک بیٹھک نما کمرے میں اس نے مجھے بٹھایا اور خود گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ میں کمرے کا نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ دیواروں پر پاک تبرکات کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ فرش پر نرم و دبیز قالین بچھا تھا۔ جس پر میرا جان ہانا گاؤ تکیہ بھی بے حد آرام دہ تھا۔ میرا دھیان انہی چیزوں پر تھا کہ گھر کے اندرونی طرف سے کرب دار آواز سنائی دی۔

"کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو یہاں لانے کی۔؟" لہجہ انتہائی غصیلا تھا۔

"بابا جان یہ اس رشتے کے لئے سنجیدہ ہے۔" یوسف کی آواز بہت ہلکی تھی میں واضح طور پر سننے کے لئے اٹھ کر چوبی دروازے کے قریب چلا گیا۔

"کیا میں نے تجھے کہا تھا کہ اسے یہاں لے کر آ؟"

"مگر بابا جان وہ....." یوسف منمنایا۔

"مگر وگر کیا..... میں اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی نسبت کسی اور مخلوق کے ساتھ کیسے طے کردوں۔ تیرا دماغ چل گیا ہے کیا۔" کرخت آواز میں قطع کلامی کی گئی۔

"انہیں یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی یوسف۔؟" اب کی بار حسنہ کی آواز سنائی دی۔

"تمہارے لئے حسنہ۔ تم ہی چاہتی ہو کہ یہ رشتہ ہوجائے۔" یوسف کی آواز میں بے چینی تھی۔

"میرے اپنے سگے ہی کھوٹے ہیں، میں اس لڑکے کو کیا دوش دوں۔" اتنا کہہ کر غالباً وہ بیٹھک کی طرف بڑھنے لگے۔ میں سرعت سے پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں وہ اندر داخل ہوئے میں نے ان کی طرف دیکھا تو خوف سے آنکھیں بند کرکے سر جھکا گیا۔ وہ ای خوف ناک روپ میں تھے۔

"آنکھیں کھولو برخوردار۔" ان کی آواز میں ناراضگی عیاں تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھائیں تو سراسیمگی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اب وہ ایک خوبصورت بزرگ کے روپ میں تھے۔

"اتنا سا تو جگر ہے تمہارا کہ نظر بھر کر ہماری طرف دیکھ بھی نہیں سکتے اور چلے ہو رشتہ کرنے۔" وہ میرے سامنے رکھے ہوئے گاؤ تکیئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں خجل سا ہو گیا اور خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

"ایسی کیا خوبی ہے تم میں جو میں اپنی اکلوتی پھول جیسی بچی تمہارے حوالے کردوں۔ نہ تو مضبوط جوانوں جیسا تمہارا کسرتی جسم ہے، نہ نماز اور دینی معاملات میں تمہارا کوئی خاص دھیان ہے اور نہ ہی تم بہادر اور دلیر ہو۔" ان کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔

"اور سب سے اہم بات یہ کہ تم ہمارے قبیل

کے نہیں ہو۔ تم انسان ہو۔" وہ مہذب لہجے میں بول رہے تھے۔ مجھے ان کی سادگی بہت بھلی لگ رہی تھی مگر میں شرم اور ہچکچاہٹ کے باعث کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ حسنہ اور یوسف دروازے کے عقب سے ہماری گفتگو سننے کی کوشش کررہے ہیں میں نے اس طرف دیکھا تو بزرگ نے مجھے ٹوک دیا۔

"بیٹے میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں مگر تمہاری کوئی توجہ نہیں۔ تم لاپرواہ بھی معلوم ہوتے ہو اور لاپرواہی ہمیں بالکل پسند نہیں۔" وہ کھڑے ہوگئے۔ میں بری طرح سٹپٹا گیا۔ انہوں نے یوسف کو آواز دی تو وہ فوراً اندر آ گیا۔

"مہمان کو خالی پیٹ لوٹانا ہمارا رواج نہیں۔ اسے کھانا پیش کرنے کے بعد رخصت کردینا۔" وہ یوسف کو ہدایت دے کر جانے لگے تو میں جیسے یکدم سے ہوش میں آگیا۔ آگے بڑھ کر میں نے ان کے پاؤں پکڑ لئے۔

"نہ..... نہیں بابا جان..... ایسا مت کہیں۔ پلیز! اس رشتے کو قبول کرلیں میں حسنہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اسے ہرخوشی دوں گا۔ جو آپ کہیں گے، میں وہی کروں گا بس آپ اس رشتے سے انکار مت کیجیے۔" میں ان کے پیروں میں پڑا گڑگڑا رہا تھا۔

"اسے بیٹھاؤ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔" وہ کچھ لمحات تک سوچتے رہے پھر یوسف کو ہدایت دے کر چلے گئے۔

یوسف نے مجھے سنبھالا پھر کھانے کا انتظام کرنے کے لئے وہ بھی چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کھانے پینے کے لوازمات کے ساتھ آ گیا۔ مٹی سرخ دسترخوان بچھا کر ترتیب سے کھانا رکھا اور بولا۔

"بابا جان اندر حسنہ سے اس رشتے کے حوالے سے پوچھ کچھ کررہے ہیں وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور مان جائیں گے آپ بے فکر ہوکر کھانا کھائیں۔" وہ اتنا کہہ کر اندر چلا گیا اور میں کسی حد تک مطمئن ہوکر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا، وہ کھانا اس قدر لذیذ تھا کہ میں بنا رکے کھاتا چلا گیا۔ ایسا کھانا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا مشروبات کا ذائقہ بھی مثالی تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں پھر سٹ کر بیٹھ گیا۔ اسی دوران یوسف اپنے بابا جان کے ہمراہ بیٹھک میں داخل ہوا۔ وہ دونوں میرے سامنے براجمان ہوگئے۔

"دیکھو بیٹے، صرف اور صرف اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر میں یہ رشتہ منظور کرتا ہوں یہ تمہارے گھر میں ہمیشہ انسانی روپ میں حاضر رہے گی۔ بلکہ کسی بھی حال میں جناتی خصوصیات سے اپنے کو الگ رکھے گی۔ میری ایک شرط ہے کہ یہ رشتہ میں اسی صورت میں طے کروں گا جب تمہارے والدین اپنی رضامندی سے یہاں رشتہ مانگنے آئیں گے۔" انہوں نے جب یہ کہا تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

میں نے اپنے گھر میں کسی سے بھی حسنہ کے حوالے سے بات نہ کی تھی۔ اب مجھے ایک نئے طوفانی ہنگامے کا سامنا کرنا تھا۔ کیونکہ میں اپنے والدین کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔

"جی ضرور آئیں گے۔ میں جلد ہی انہیں رشتے کے لئے بھیجوں گا۔" میں لاکھ سراسیمہ سہی، مگر اس یکطرفہ رضامندی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے انتظار رہے گا۔ تب تک تم حسنہ سے نہیں مل سکتے۔ وہ شادی ہونے سے پہلے تک گھر کی چار دیواری میں رہے گی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بول کر اٹھ گئے اور میں دل مسوس کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

جب سے میں نے گھر والوں کے آگے ایک جن زادی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا گھر میں اس دن سے سناٹا سا چھایا رہنے لگا۔ ابو کا ردعمل امی کے مقابلے میں یکسر مختلف تھا۔ وہ کسی آتش فشاں پہاڑ کی مانند مجھ پر پھٹ پڑے تھے انہیں میری ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا جبکہ امی اور حنا ہر وقت خوف زدہ رہنے لگی تھیں، امی

مجھ پر وہ قہقہے سے قرآنی آیات پڑھائی کر کے پھونکتی رہتیں جبکہ حنا تو مجھ سے ڈرنے لگی تھی۔ وہ میرے کمرے میں بھی آنے سے کترانے لگی تھی۔

اس صورتحال نے مجھے ذہنی تناؤ کا شکار کر دیا تھا۔ میں سوچتا رہتا کہ اس خوف کے ساتھ یہ لوگ حنہ کے ساتھ کیسے رہیں گے۔ ایسے حالات میں ، میں ہمیشہ عادل سے مشورے لیا کرتا تھا۔ مگر اس بار میں نے عادل کو کچھ نہ بتایا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی اس معاملے میں میرے گھر والوں کو صحیح قرار دے گا۔

جب مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں نے یوسف سے مشورہ لینا مناسب سمجھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہر نماز میں ہمارے محلے کی مسجد میں موجود ہوا کرے گا۔ لہٰذا میں عصر کی نماز کے لئے مسجد چلا گیا۔ نماز کے بعد وہ خود ہی میرے پاس چلا آیا۔

"یہ تو بہت ہی گھمبیر صورتحال ہے۔" وہ سارا قصہ سننے کے بعد پرسوچ لہجے میں بولا۔

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔؟" میں مزید پریشان ہو گیا۔

"اب تو بس ایک ہی حل ہے۔ وہ یہ کہ حنہ کو آپ کے گھر والوں سے ملانا پڑے گا۔ شاید اس سے مل کر آپ کے گھر والے مطمئن ہو جائیں۔" اس نے پتے کی بات کی اور مجھے بھی اس کی تجویز بہت پسند آئی۔

"مگر کیا تمہارے بابا اسے اجازت دیں گے۔؟" مجھے اچانک یاد آیا۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ انہیں میں سمجھالوں گا۔" اس نے دلاسہ دیا۔

پھر اگلے ہی روز پروگرام کے مطابق وہ حنہ کو طے شدہ مقام پر لے آیا وہاں سے میں حنہ کو بائیک پر بیٹھا کر گھر لے آیا۔

توقع کے برخلاف میری امی اور حنا، حنہ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں اس کی معصومیت اور حسن دیکھ کر امی تو اس پر فدا ہو گئیں۔ حنا کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ حنہ انسان نہیں۔ تھوڑی سی جھجک کے بعد منٹوں میں ہی وہ حنہ سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔

جب میں نے اصل مقصد یعنی شادی کا ذکر چھیڑا تو امی نے من میں دبے سارے خدشات حنہ کے سامنے رکھ دیئے۔ جسے حنہ نے حیرت انگیز طور پر لمحوں میں سلجھا کر دونوں کو مطمئن کر دیا۔ شام کو ابو گھر لوٹے تو انہیں بھی حنہ نے شرم و جھجکاہٹ کے باوجود اس رشتے کے لئے آمادہ کر لیا۔ میں بے حد خوش تھا۔ جو کام میں نہ کر سکا، وہ حنہ نے کتنی آسانی سے کر لیا تھا۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب آگ اور مٹی کا ملن ہونے جا رہا تھا میں اور حنہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو رہے تھے۔

ہماری جانب سے کئی رشتے دار مدعو تھے۔ جبکہ حنہ کی قبیل سے چند باریش نورانی چہرہ مرد اور دو تین باپردہ عورتیں شریک تھیں۔ وہ عورتیں میری امی کے پاس بیٹھیں حنہ کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔

بابا جان ہر معاملے میں حنہ کی خوشی کو ملحوظ خاطر رکھتے آئے تھے مجھے بھی یہ رشتہ اس کی خوشی اور رضامندی کی وجہ سے ملا تھا۔ ورنہ میں کسی بھی طور پر ان کا آبیڈیل داماد نہیں تھا۔

میرے والدین کے انکار کے باوجود بابا جان نے اتنا ہنگامہ دیا کہ سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ کروڑوں کی مالیت کا جہیز دیکھ کر میرے رشتے دار انگشت بدنداں ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا اسسرال بہت رئیس اور تونگر ہو۔

خالص سونے، چاندی اور اصلی ہیروں سے بنے ہوئے کئی سارے بیش قیمت زیورات، خاص قسم کی دھات کے برتن، بے شمار نفیس کپڑوں کے تھان اور ملبوسات، بہترین قسم کا چوبی فرنیچر، اس کے علاوہ چوبی ، دھاتی اور شیشے سے بنائے گئے ترئین اور آرائش کے لئے بڑے بڑے گلدان، تختیاں اور جانے کیا کیا شوپیس بھی تھے۔ دیکھنے والوں کی نظریں پتھرا رہی تھیں۔

لڑکی والوں یعنی حنہ کے رشتہ داروں کی جانب سے بھی تحفے تحائف کی بھرمار تھی۔ بہترین کپڑے جو دبئی اور کے بازار چھان کر بھی نہ ملیں اور پھلوں، مٹھائیوں کے بڑے بڑے ٹوکرے تھے۔ ان ٹوکروں میں سے مٹھائیاں نکال کر مہمانوں کو پیش کی گئیں تو وہ سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔

ہمارا ہر رشتہ دار اس بات سے بے خبر تھا کہ حنہ اور اس کے رشتہ دار انسان نہیں بلکہ جنات ہیں۔

ہماری عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر حنہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر بلائیں لے رہی تھیں اور حاسد عورتیں حنہ کی خوبصورتی اور جہیز دیکھ کر جل بھن کر رہ گئیں۔ جہیز پر یوسف کی خاص نگرانی تھی۔

میری خواہش کے مطابق میرا نکاح پیر حشمت علی نے پڑھایا اور نکاح کے بعد ایک رسم کی طرح میں نے اور حنہ نے ان سے بیعت بھی لے لی۔

پھر حشمتی کا دور آیا۔ بابا جان نے چشم پر آب کے ساتھ حنہ کو وداع کیا، ہم گلے ملاق کے ساتھ دلہن کو گھر لے آئے۔ جہاں میرے کمرے کی خلوتیں دو بے تاب وجودوں کو پناہ دینے کے لئے منتظر تھیں۔

☆.....☆.....☆

حنہ میرے گھر والوں کی آنکھ کا تارا بن چکی تھی۔ اس نے گھریلو امور خانہ داری کی تمام تر ذمہ داریاں بخوبی سنبھال رہی تھیں۔ وہ ہر کام میں طاق تھی۔ امی کو کسی کام کو ہاتھ لگانے نہ دیتی۔ کھانا ایسا بناتی کہ ہمارا بس نہ چلتا کہ برتن ہی چاٹنے لگ جائیں۔ امی پھولے نہ سماتیں۔ حنا بھابھی بھی کبھی اس کے آگے پیچھے منڈلاتی پھرتی۔

حنہ کے پاس حیرت انگیز خداداد قوتیں بھی تھیں۔ وہ امی سے کہتی کہ فلاں فلاں حاسد رشتے دار اپنے بغض کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم پر کالا جادو کرنے لگے ہیں۔ امی پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ وہ سوچتیں کہ فلاں رشتے دار بظاہر تو بے حد مخلص نظر آتے ہیں۔ مگر حنہ سب کے کچے چٹھے کھول کر رکھ دیتی اور صرف اتنا ہی نہیں وہ کالے علم کا بابا آسانی توڑ کر کے حاسدین کو ہکا بکا بھی کر دیتی۔

اس کا حیرت انگیز ترین کارنامہ یہ تھا کہ پڑوسن خالہ نے ہمیں دعوت دی، یہ دعوت نو بیاہتا جوڑے کے لئے تھی۔ میں اور حنہ وہاں گئے تو حنہ نے انکے گھر میں زنجیروں سے بندھی ہوئی جوان لڑکی کو دیکھا تو افسردگی سے اس کے متعلق استفسار کرنے لگی۔

"یہ میری بیٹی سلمٰی ہے۔ چودہ برس کی تھی تب سے آج تک کسی سرکس آسیب کے زیر اثر ہے۔" پڑوسن خالہ نے بتایا۔

"آپ نے کسی عامل کو نہیں دکھایا۔؟" میں نے متفکر لہجے میں دریافت کیا کیونکہ مجھے بھی پہلی بار سلمٰی کے متعلق علم ہوا تھا۔

"ہم کہاں کہاں نہیں گئے بیٹا۔ پر ہر جگہ سے بے مراد ہی لوٹنا پڑا۔ سلمٰی اب اکیس برس کی ہو گئی ہے اس کے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل بے کل ہونے لگتا ہے۔" خالہ نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

حنہ اس دوران اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ جہاں سلمٰی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اسی پل سلمٰی کی بذیانی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ہم سب اس سمت دوڑ پڑے۔ یہ دیکھ کر میں، خالہ اور باقی گھر والے حیران رہ گئے کہ حنہ نے سلمٰی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور اسے پے در پے طمانچے رسید کر رہی تھی۔

خالہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے حنہ کا دماغی توازن درست نہیں۔ وہ آگے بڑھیں مگر میں نے انہیں روک لیا۔ سلمٰی بھیانک آواز میں چیختی رہی اور حنہ پیچ و تاب کے عالم میں اسے طمانچوں کے ساتھ دھمکیاں دیتی رہی۔ یہاں تک کہ سلمٰی بے ہوش ہو گئی۔

حنہ کچھ دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر زیر لب کچھ پڑھتی رہی پھر اس پر پھونک کر ہماری طرف آ گئی۔

"خالہ..... اس سرکش عفریت کو میں نے جلا دیا ہے۔ سلمٰی بہت کمزور ہے آپ جلدی سے ڈاکٹر کو بلوائیں۔" حنہ کے الفاظ سن کر خالہ کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا وہ مجھے دیکھنے لگیں میں ان کی استفہامیہ نگاہوں کو پڑھ کر تسلی دینے لگا اور خود ہی ڈاکٹر

کونون کر کے بلوالیا۔

پھر میری امی نے خالہ کو مطمئن کر دیا کہ آپ گھبرائیں نہیں یہ میری بہو ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک، بے شمار ملاحتوں کی مالک ہے اور یہ سورۃ جن کی عامل بھی ہے۔" امی کی باتیں سن کر خالہ مطمئن ہو گئیں۔

ڈاکٹر نے سلمٰی کا تفصیلی معائنہ کیا اور اسے کسی بھی قسم کے خطرے سے باہر قرار دے کر ضروری ادویات لکھ کر چلا گیا۔ خالہ حسنہ سے لپٹ کر رونے لگیں کیونکہ سلمٰی کو ہوش آ گیا تھا اور اب وہ کسی سائے کے زد میں نہ تھی۔ خالہ حسنہ کی بے حد مشکور تھیں۔

بہر حال ہم کھانا کھا کر گھر لوٹ آئے یہ واقعہ ہمارے محلے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ حسنہ کو بہت بڑی نیک ہستی سمجھا جانے لگا محلے کی کئی خواتین حسنہ سے بیعت لینے چلی آئیں۔ وہ آسیبی معاملات دور بھگانے کے حوالے سے ہار آور سمجھی جانے لگی تھی۔

میری شادی کے بعد میری بہن حنا کے لئے کئی رشتے آئے حسنہ ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی خامی دیکھ کر میرے والدین سے اصرار کرتی کہ وہ اس کا انکار کر دیں اسے کوئی بھی رشتہ مناسب نہ لگتا۔ بالآخر امی ابو نے تھک ہار کر یہ ذمہ داری بھی حسنہ کے کاندھوں پر ڈال دی۔

☆.....☆.....☆

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ حسنہ کی ماں تو حیات نہ تھیں مگر ماں جیسے چاہنے والے بابا جان اور یوسف نے تمام معاملات میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔

ہمارے رذیل رشتہ دار اس موقع پر بھی باز نہ آئے۔ یوسف کے مطابق حسنہ پر انہوں نے کالے علم کے زور سے کئی وار کیے۔ جنہیں بابا جان نے ناکام بنا دیا۔

مگر کون جانتا تھا کہ حسنہ کی زندگی کے دن ختم ہونے جا رہے تھے۔

ایک دن جب حسنہ نے مجھے خلوت میں روح فرسا خبر سنائی۔ "فراز شاید میری زندگی کے ایام مکمل ہونے والے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دن آ پہنچے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں زمانے بھر کی تھکن تھی۔

"یہ کیا بے تکی باتیں کرنے بیٹھ گئی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں ایسا مذاق برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" میں تڑپ اٹھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ خدارا میری مشکل کو اور نہ بڑھائیں، آپ کو میری بات سننی ہو گی۔" اس کی آواز میں کرب کا عنصر نمایاں تھا۔

"اچھا کہو کیا بات ہے۔" میں اس کی باتوں کو محض مذاق سمجھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولنا شروع کیا۔

"آپ کی یونیورسٹی میں ایک لڑکی "نائلہ" پڑھا کرتی تھی۔ وہ دل و جان سے آپ سے محبت کرتی تھی پر کبھی اظہار نہ کر پائی۔ وہ ہماری حنا کی بہت اچھی سہیلی بھی تھی مگر اس نے حنا کو بھی اپنی محبت سے بے خبر رکھا۔ وہ باحیا لڑکی اتنی ہمت بھی نہ رکھتی تھی کہ آپ سے کوئی بات بھی کر لے۔ پیار کا اظہار کرنا تو دور کی بات تھی، وہ من ہی من تڑپتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ پڑھائی کا دور ختم ہو گیا اور وہ اپنی بے کراں چاہتوں کا سمندر دل میں چھپائے اپنے گاؤں چلی گئی۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا قلق رہا کہ میں نے اس معصوم لڑکی کی محبت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ آپ سے نکاح کے بعد میرا آپ پر شرعاً حق سہی، مگر میں اس لڑکی کو آج تک نہ بھول پائی۔ اب میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مجھے آپ کا وعدہ چاہئے کہ میرے بعد آپ نائلہ کو اپنی شریک حیات ضرور بنائیں گے۔ وہ آپ کی زندگی خوشیوں سے بھر دے گی۔ وعدہ کریں فراز۔" حسنہ بھیگی پلکوں کے ساتھ جذب کے عالم میں گڑگڑا رہی تھی۔

میں یہ باتیں سن کر تذبذب میں مبتلا ہو گیا مجھے حسنہ کی باتیں بہکی بہکی لگ رہی تھیں۔

بہر حال میں نے یہ قصہ اور حسنہ کا وہم ختم کرنے کے لئے نائلہ سے شادی کا وعدہ کر لیا۔

اگلے روز ہی حسنہ داغ مفارقت دے کر ہمیں

ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا ہر آنکھ اشک بار تھی۔ میں اس غم کی تاب نہ لا کر گھر کے کسی کونے میں دنیا و مافیا سے بے خبر ساکت و جامد پڑا رہا۔

حسنہ کی تدفین سے لے کر تدفین تک کے سارے امور اسی کے قبیل کے لوگوں نے ادا کئے۔ میں سکتے کی حالت میں تھا، اسی لئے میں ان کے ساتھ شریک نہ ہو سکا۔ مجھے کسی کی کچھ بھی خبر نہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو حسنہ کے انتقال کو تین روز گزر چکے تھے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے رلانے کی کوشش کی گئی اور گھر والے اس عمل میں کامیاب بھی ہو گئے۔

آج پہلی بار میں حسنہ کے غم میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔

☆.....☆.....☆

بابا جان اب اکثر ہمارے گھر چکر لگاتے۔ وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

وہ بضد تھے کہ میں فوراً دوسری شادی کر لوں پر میں ذہنی طور پر تیار نہ تھا، اس لئے ہر بار ٹال جاتا تھا۔

ایک روز مجھے الماری کی دراز سے ایک کاغذ ملا۔ میں نے بے دھیانی میں اسے کھول کر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔

کاغذ پر نائلہ کا نام اور پتہ دیکھ کر مجھے وہ وعدہ یاد آ گیا جو میں نے بے خیالی میں حسنہ سے کیا تھا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی حسنہ کو صرف میری فکر تھی۔ میری لاعلمی میں جانے کب وہ یہ کاغذ الماری میں محفوظ کر گئی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس وعدے پر عمل پیرا ہو کر حسنہ کی آخری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میں نے بابا جان کو یہ بات بتائی تو انہیں حسنہ پر فخر محسوس ہوا۔

اسی ہفتے میں اپنے والدین کو ساتھ لے کر اس گاؤں پہنچ گیا جہاں نائلہ رہتی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک شکستہ مکان میں خستہ حال زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے والد کے انتقال کے بعد دو وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ کوئی بھائی بھی نہ تھا اس لئے نائلہ مقامی اسکول میں پڑھا کر جیسے تیسے بے رحم پیٹ کی آگ بجھانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

بہر حال مجھے دیکھ کر نائلہ کو اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ رشتے کی بات سن کر دونوں ماں بیٹی خوشی سے کھل اٹھیں۔ میرا انہوں نے رشتہ بخوشی قبول کر لیا۔

ہم نائلہ اور اس کی والدہ کو حیدر آباد لے آئے۔ سادگی سے نکاح ہوا مگر بابا جان کی خواہش پر شاندار ولیمہ رکھا گیا۔ سارا انتظام بابا جان نے خود کیا تھا۔

امی نے نائلہ کی والدہ کو تنہا اور بے سہارا چھوڑنا مناسب نہ جان کر انہیں ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر ٹھہرا لیا۔ وہ پل پل دعائیں دیتی نظر آتیں۔

میں نے نائلہ کو حسنہ کی حقیقت بتائی تو وہ خوف زدہ ہو گئی مگر بابا جان سے ملاقات کے بعد اس کا سارا ڈر جاتا رہا۔ وہ بلاشبہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ اس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

ایک دن میں اپنے کمرے میں داخل ہونے لگا تو اندر سے آتی مدھم آواز سن کر مجھے رکنا پڑا۔ نائلہ حنا سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے آج تک گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا؟"

"نہیں بھابھی میں لڑکی ہو کر ایسی بات اپنی زبان پر نہیں لا سکتی تھی۔" حنا شکستہ لہجے میں بولی۔

"لیکن عادل..... وہ تو رشتہ لے کر آ سکتا تھا۔ وہ کیوں نہیں آگے بڑھا؟ کہیں اس کے دل میں چور تو نہیں۔؟" نائلہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی وہ تو رشتہ بھیجنے کے لئے ایک عرصے سے بضد تھا۔ بس میں ہی اس خوف کے پیش نظر ٹال مٹول کرتی آ رہی تھی کہ وہ فراز بھائی کا دوست بھی ہے۔ اگر بھائی نے خفا ہو کر کوئی بکھیڑا کھڑا کر دیا تو میں عادل کو ہمیشہ کے لئے کھو دیتی۔ بس یہی میری غلطی تھی۔ اب میں نے اسے سچ میں کھو دیا ہے۔" حنا روہانسی ہونے لگی۔

"کھودیا ہے..... کیا مطلب ۔؟" نائلہ نے حیرت اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"عادل کے گھر والوں کو جب سے علم ہوا کہ حسنہ بھابھی انسان نہیں تھی۔ تب سے خائف ہو کر انہوں نے ارادہ بدل دیا ہے۔ عادل نے انہیں بہت سمجھایا مگر کسی بھی صورت میں ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ حسنہ اب اس دنیا میں نہیں ہے مگر پھر بھی ان کا خیال ہے کہ ایک جن زادی کی نند کو اگر انہوں نے بہو بنایا تو ان کے گھر کا سکون غارت ہو جائے گا۔" حنا اب باقاعدہ رونے لگی تو میں کبیدہ خاطر وہاں سے ہٹ گیا۔

کتنے انکشافات ایک ساتھ سامنے آئے تھے۔ عادل اور حنا کا ایک دوسرے کو چاہنا۔ دونوں کا مجھ سے یہ بات چھپانا، میری وجہ سے حنا کا انکار اور اب پچھتانا۔

مجھے عادل کے گھر والوں پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ عادل تو بچپن سے ہی سمجھدار تھا پھر اس کے گھر والوں کی سوچ اس قدر دقیانوسی کیسے ہو سکتی تھی؟ بھلا اس سب میں حسنہ کا کیا قصور تھا؟ بس یہی کہ وہ انسان نہیں تھی۔

اس کی خوبیوں اور اچھائیوں کو کیوں پس پشت ڈال کر نظر انداز کیا جارہا تھا؟ وہ لڑکی جس نے ہمیشہ خود سے پہلے دوسروں کے لئے سوچا۔ کبھی کسی کی تکلیف کی وجہ انجانے میں بھی نہیں بنی، آج پہلی بار قصوروار ٹھہرائی جارہی تھی۔ جبکہ اس کا کوئی قصور بھی نہ تھا۔

میرا دماغ سوچ سوچ کر شل ہونے لگا، تھک ہار کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے بھی مجھے بابا جان کی مدد لینی چاہئے۔

☆.....☆

شام کے وقت یوسف ہمارے گھر آیا۔ اس کی حالت غیر تھی، چہرے پر رنج و غم کے بادل چھائے تھے۔ حواس بھی مکمل طور پر قابو میں نہ تھے۔

ہم سب پریشانی کی کیفیت میں اس کے گرد جمع ہو گئے۔ امی بہت زیادہ متفکر تھیں۔ انہوں نے پیار اور اپنے پن سے اسے سنبھالا تو وہ کچھ بولنے کے قابل ہوا، مگر جیسے ہی زبان کھولی تو ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"بابا جان، ہم سب کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔" یوسف یہ کہہ کر روتا ہوا غائب ہو گیا۔

ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔ امی کو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہ آیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑیں۔ بابا جان کو بلانے کا جو ایک خاص طریقہ تھا، اس پر لال رومال اٹھا کر عمل کرنے لگیں مگر بابا جان ہوتے تو آتے۔ وہ بے بس ہو کر زار و قطار رونے لگیں۔ بابا جان انہیں سگے بھائیوں کی طرح عزیز تھے۔ امی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا میں نے یوسف کو پکارا مگر وہ بھی نہ لوٹا۔ بھلا اب ہم کہاں جاتے؟ وہیں پڑے بابا جان کے غم میں دیر تک روتے رہے۔

اذان ہوئی تو میں مسجد چلا گیا۔ میری نگاہیں یوسف کو تلاش کرنے لگیں مگر آج پہلی بار وہ مسجد میں دکھائی نہیں دیا۔ میں مزید بے چین ہو گیا۔ نماز ادا کر کے گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں عادل نظر آیا۔ وہ میرے ہی گھر کی طرف جارہا تھا۔

میرا دل پہلے ہی غم سے نڈھال تھا۔ اسے دیکھ کر غصے کی لہریں تن بدن میں سرایت کر گئیں۔ میں نے غلبت میں اسے روک لیا۔ اس کا اور حنا کا معاملہ اسے بتا کر اسے خوب بے بھاؤ کی سنائی۔ بے نقط سنا کر میں نے دل کی ساری بھڑاس نکال لی۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ عادل کا اس معاملے میں کہیں بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں کا خصہ میں نے اس پر نکال دیا۔ وہ بنا کچھ کہے حیرت اور خاموشی سے سنتا رہا اور پھر واپس لوٹ گیا۔

گھر آ کر جب میں نے اس بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو مجھے اپنی اس جارحانہ حرکت پر افسوس اور شرمندگی ہونے لگی۔ مجھے بابا جان یاد آنے لگے جو کہتے تھے کہ "میری لاپرواہی کی عادت اچھی نہیں اور انہیں لاپرواہ لوگ بالکل پسند نہیں۔"

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اپنی بے وقوفی

سے میں نے جان چھڑکنے والا دوست شاید کھو دیا تھا مجھے حنا کا بھی خیال نہ آیا۔ اس بے چاری کو تو علم بھی نہیں کہ میں نے اس کی رہی سہی امیدیں بھی توڑ دی تھیں۔

میں کسی لائق نہیں۔ حسنہ بھی مجھے سدھارنے کے لئے کتنا ٹوکا کرتی تھی۔ میرے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ عادل بھی مجھے کتنا سمجھاتا تھا۔ میری بڑی بڑی غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف کر دیا کرتا تھا اور آج..... میں نے اسے بنا کسی غلطی کے بے عزت کر دیا تھا۔ جس پر جواباً وہ کچھ بولا بھی نہیں تھا۔

اسی افسوس میں مہینوں کے مہینے گزر گئے۔ میری عادل سے دوبارہ ملاقات نہ ہوئی۔

میں جو پوری طرح بابا جان پر منحصر تھا، اب اپنے دماغ سے کوئی فیصلہ کرنا میرے لئے پہاڑ توڑنے کے برابر ہو گیا تھا۔ میں پل پل مضطرب رہتا۔

پھر ایک دن عادل ایک اور نوکر لے آیا۔ عادل کو اس پر پورا بھروسہ تھا اس لئے میں نے بنا استفسار کے اس کو رکھ لیا۔ وہ لڑکا تو پہلے والے سے بھی زیادہ بہتر نکلا۔ اس نے فوراً ہی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ وہ گھنٹوں کے کام منٹوں میں کر لیتا اور ہم دیکھتے رہ جاتے۔ پھر وہ خوش اخلاق اتنا کہ ہم سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ وہ بے حد مطیع اور فرمانبردار بھی تھا۔ ہمارا اس کے بنا جی ہی نہ لگتا۔ وہ ہماری ضرورت بن گیا تھا۔ میں تو اسے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھی۔

جب پچھلا نوکر لوٹا تو وہ لڑکا جانے لگا۔ ہم سب اس کے آڑے آ گئے۔ کوئی بھی اسے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ تب اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

"جب آپ سب مجھ سے ڈرتے ہیں تو پھر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی بات نہیں سمجھی تو اس نے وضاحت کی۔

"آپ لوگ خدا کی بنائی ہوئی مخلوقات کی صرف نوع اور قسم دیکھتے ہیں، ان کی اچھائی، سیرت اور خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر میرے معاملے میں آپ نے کیسے غلطی کر لی۔؟ میرا تعلق بھی جنات کے قبیل سے ہے، پھر آپ سب مجھے کیوں روکنا

"مگر کچھ مہینوں پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم کتنا غلط سوچتے تھے حسنہ کے بارے میں۔" آنٹی اتنا کہہ کر خاموش ہوئیں تو میرا صبر جواب دینے لگا مگر میں درمیان میں کچھ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے معاملہ صرف بگڑے گا، میں نے زبان کو مقفل کر دیا تھا۔

"کیا واقعہ بہن۔؟" میری امی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہوا کچھ یوں کہ ہمارے گھر کا نوکر بیمار پڑ گیا۔ وہ چھٹیاں لے کر چلا گیا۔ گھر میں اور بھی کئی نوکر چاکر ہیں مگر اس کے ذمے کئی اہم کام تھے۔ اس کے جانے کے بعد ہمیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ گیا تو جیسے پلٹنا بھول گیا۔

پھر ایک دن عادل ایک اور نوکر لے آیا۔ عادل کو اس پر پورا بھروسہ تھا اس لئے میں نے بنا استفسار کے اس کو رکھ لیا۔ وہ لڑکا تو پہلے والے سے بھی زیادہ بہتر نکلا۔ اس نے فوراً ہی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ وہ گھنٹوں کے کام منٹوں میں کر لیتا اور ہم دیکھتے رہ جاتے۔ پھر وہ خوش اخلاق اتنا کہ ہم سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ وہ بے حد مطیع اور فرمانبردار بھی تھا۔ ہمارا اس کے بنا جی ہی نہ لگتا۔ وہ ہماری ضرورت بن گیا تھا۔ میں تو اسے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھی۔

جب پچھلا نوکر لوٹا تو وہ لڑکا جانے لگا۔ ہم سب اس کے آڑے آ گئے۔ کوئی بھی اسے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ تب اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

"جب آپ سب مجھ سے ڈرتے ہیں تو پھر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی بات نہیں سمجھی تو اس نے وضاحت کی۔

"آپ لوگ خدا کی بنائی ہوئی مخلوقات کی صرف نوع اور قسم دیکھتے ہیں، ان کی اچھائی، سیرت اور خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر میرے معاملے میں آپ نے کیسے غلطی کر لی۔؟ میرا تعلق بھی جنات کے قبیل سے ہے، پھر آپ سب مجھے کیوں روکنا

چاہتے ہیں؟ کیا میری حقیقت جاننے کے بعد بھی آپ لوگ محبت اور انسیت کے دعویدار ہیں؟ یا خوف اور دہشت میں خواہ مخواہ مبتلا ہو چکے ہیں؟ جواب دیں۔'' وہ درد بھرے لہجے میں بول رہا تھا مگر مجھے اس کے کہے پر یقین نہ آ رہا تھا۔ تبھی وہ بنا جواب معلوم کئے غائب ہو گیا اور ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔

ایک پل کے لئے میں واقعی خوف زدہ ہو گئی مگر دل مضطرب تھا۔ تب عادل نے ہمیں دیر تک سمجھایا اور شرمساری اور خجالت سے میری گردن جھکتی چلی گئی کئی دنوں تک میں ایک عجیب سی بے چینی اور اضطراب میں مبتلا رہی۔ مجھے وہ ملازم یاد آتا رہا جسے میں نے اپنی اولاد کی طرح چاہا تھا مگر وہ پھر بھی نہ لوٹا۔

عادل نے میری حالت دیکھی تو مجھے احساس دلایا کہ حسنہ کے متعلق میری فرسودہ سوچ نے اس جن ملازم کو ناراض کر دیا تھا۔ اس کی دل آزاری ہوئی تھی جس نے ہماری خوشنودگی کی خاطر دن رات محنت کی تھی۔ میں پانی پانی ہو گئی اور اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے فوراً حنا کا رشتہ مانگنے آ گئی۔ شاید وہ جن زادہ ہمیں معاف کر دے۔

''آنٹی نے رنجیدہ آواز و لہجے میں ساری تفصیل بتائی اور میں بت بنا چپ چاپ انہیں دیکھتا اور سنتا رہ گیا۔

عادل میرا ہاتھ تھام کر مجھے میرے کمرے میں لے آیا اور کہنے لگا۔

''جانتے ہو وہ ملازم کون تھا۔؟''

''نہیں..... کون تھا۔؟'' میں نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''وہ حسنہ کا بھائی یوسف تھا۔'' عادل مسکرایا۔

''کیا۔؟'' یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

''ہاں فراز..... میرے گھر والے اس حقیقت سے اب تک بے خبر ہیں مگر میں اول روز سے سب کچھ جانتا تھا۔ یہ یوسف کا پلان تھا تاکہ وہ میرے گھر والوں کو راہ راست پر لا سکے اور وہ کامیاب رہا۔'' عادل کے چہرے پر ہنوز فاتحانہ مسکان تھی۔

''جس روز تم مجھ پر برہم ہو رہے تھے، تب وہ بھی ہمارے درمیان تھا مگر ہماری نظروں سے پوشیدہ رہ کر تمام باتیں سنتا رہا۔ جب میں وہاں سے لوٹ گیا تو آگے راستے میں حاضر ہو کر اس نے مجھے روک کر پہلے اپنا تعارف کرایا پھر کہنے لگا۔

''آج میرے بابا جان کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ان کی تدفین کے بعد ہمیشہ کے لئے کہیں دور چلے جانا چاہتا تھا مگر مجھے میری بہن کا بستر مرگ پر دیا ہوا وہ وعدہ یاد آ گیا جس میں اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے قسم کھلوائی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد، میں اور بابا جان، فراز بھائی کے گھر پر ہمیشہ نظر رکھیں گے اور کسی رنج اور تکلیف کو یہاں سے گزرنے بھی نہ دیں گے۔ بابا جان جب تک زندہ رہے انہوں نے یہ فریضہ خود بھی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ مگر آج وہ نہیں رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی ذمہ داری سنبھال لوں۔ میں ہر حال میں آپ کا رشتہ اس گھر میں طے کر کے رہوں گا۔ بس آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

پھر جب میں نے حامی بھر لی تو اس نے میرے ساتھ مل کر پلان بنایا اور ملازم بن کر ہمارے گھر میں سب کا دل جیت کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔'' عادل نے سنجیدگی سے سارا ماجرا سنایا تو میری آنکھیں بھر آئیں۔

میں سوچنے لگا کہ کیا یہی وہ مخلوق ہے، جس سے دنیا ڈرتی ہے۔

یہ مخلوق جو اشرف المخلوقات نہیں مگر تہذیب و تخصیص کے معاملے میں خود کو آج کے انسان سے کہیں زیادہ بہتر، اعلیٰ اور بلند ثابت کر دکھایا تھا۔ بے لوث محبت کرنے والی اور کڑی سے کڑی مشکل میں بھی تن دہی اور خوش اسلوبی سے ساتھ نبھانے والی اس تخلیق خداوندی کو قابل افتخار سمجھنے کے بجائے دنیا دہشت ناک، دہشت ناک، اور خوف و ہراس کی وجہ کیوں سمجھتی ہے۔؟

موت کا راز

عمرانہ ناز۔ گوجرانوالہ

اچانک نوجوان نے موٹا ڈنڈا اٹھایا اور لحیم شحیم شخص کو ڈنڈے سے دھننے لگا تو وہ شخص لھولھان ہو کر زمین بوس ہو گیا مگر پھر اچانک اس کے جسم سے دھواں اٹھنے لگا اور پھر وہ دھوئیں میں تبدیل ہو گیا لیکن پھر.....

شکی..... بدمزاج اور شعور سے نابلد لوگوں کے لئے سبق آموز..... دل گرفتہ حقیقی واقعہ

انسانی زندگی میں سوچ اور یادوں کا بڑا عمل دخل ہے، کچھ گزشتہ یادیں ایسی ہوتی ہیں جو کہ انسان کو بے چین کر دیتی ہیں اور انسان سوچوں کی عمیق گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے، کچھ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔

جب میں سات سال کا ہوا تو اچانک امی کا ذہنی توازن خراب ہو گیا۔ آئے دن گھر میں ایسے عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے کہ امی انجانے سے خوف میں گھری رہتیں۔

اور آخر کار اس ڈر اور خوف کے ماحول میں ان کی موت واقع ہو گئی۔

ایک رات دو بج کر چھ منٹ پر میں اپنے پرانے گھر کی عمارت کے سامنے کھڑا، اپنے بچپن کی بیتی ہوئی یادوں کو یاد کر کے سسک پڑا۔ یہ یادیں بھی بہت سادہ و

چھوڑ دیتی ہیں جو ہر گزرتے وقت کے ساتھ یاد آنے پر سانپ کی طرح ڈستی رہتی ہیں۔

سردی سے کپکپاتے ہوئے، گھر کے بلب کی روشنی سے میں قدرے مطمئن ہو کر اپنا سامان اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ جب سے امی اس گھر سے رخصت ہوئی تھیں اسی وقت ابو نے رنج و غم سے چور ہو کر اس گھر کو انکل احمد کے سپرد کر دیا تھا اور مجھے ساتھ لئے لاہور آ گئے تھے۔

انکل احمد ایک ریٹائرڈ فوجی تھے۔ جو اپنی بیوی آسیہ اور پانچ سالہ بیٹی کے ساتھ ہمارے اس گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ آسیہ آنٹی دراصل میری امی کی بیسٹ کیلی تھیں۔ میری ان سے صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوپائی تھی۔ پھر ہمارے اس گھر سے چلے جانے کے بعد، انکل احمد کی فیملی کا کوئی پتہ نہ چلا، کہ وہ کہاں ہیں؟..... زندہ بھی ہیں یا کہیں.....

خیر بہت تگ و دو اور کوشش کے باوجود سراغ نہ ملا تو آخر تھک ہار کر اس گھر کو ابو نے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ پھر ابو بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نہ آنے کے لئے دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

ابو نے اس گھر کو مجھ سے خفیہ ہی رکھا تھا تاکہ میں کبھی بھی اس منحوس گھر کا رخ نہ کر سکوں لیکن ابو کی وفات کے بعد وصیت نامہ میں اس گھر کا راز فاش ہو گیا تو میں اپنی پرانی یادوں کے تحت اس گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ گھر آبادی سے ہٹ کے واقع تھا۔ آس پاس کافی گھنے درخت موجود تھے۔ خیر چند منٹ سوچنے کے بعد خاموشی سے میں گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر پہلے سے ہی صاف ستھرا لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی رہائش پذیر ہو۔ یوں مجھے حیرانی لاحق ہوئی کیونکہ میری سوچ کے مطابق تو یہ گھر گندا ہونا چاہئے تھا لیکن گھر کا نقشہ تو یہاں کسی ذی روح کے ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میں تھکے قدموں سے سارے گھر کا گشت لگاتے ہوئے اپنے سابقہ بیڈ روم میں آیا، جہاں اتنے سالوں بعد بھی میری بچپن کی تصویر دیوار پر ویسے ہی لٹکی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی نئی تصویر لٹکا کر گیا ہو۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی تصویر کا جائزہ لینے میں مگن تھا کہ ایک دم باہر تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ ہوا دروازے اور کھڑکیوں سے ٹکرانے پھر رہی تھی۔ میں نے چونکہ آتے ہی انہیں مکمل طور پر بند کر دیا تھا اس لئے مجھے ان کے کھل جانے یا ہوا کے اندر آنے کی کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ پھر بھی ہوا کے ساتھ اتنی گرج برس پر میں چونک سا پڑا اور دروازے کی جانب دیکھنے لگ گیا اور پھر میں جلدی سے بستر سے اترا اور کھڑکی کی طرف بڑھا، سردی کی بدولت کمرہ ٹھنڈک سے بھرتا جا رہا تھا۔ میں حیران و پریشان تھا کیونکہ جب میں آیا تھا اس وقت کسی بھی طوفان کا امکان نہ تھا لیکن اب موسم بہت غضبناک ہو چکا تھا۔ ہواؤں کا شور بہت تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ منظر رات کے اس پہر کو بہت ہولناک بنا رہا تھا۔

''اوہ میرے خدا۔ تنہائی کس قدر وحشت ناک ہوتی ہے؟'' میں سوچنے لگا۔ لیکن دل بار بار گواہی دے رہا تھا کہ کوئی اور وجود بھی یہاں ہے اور اس وجود کے ہونے پر مجھے حیرت تھی۔ خیر میں چادر جھاڑ کر بستر پر لیٹا اور سونے کی کوشش میں لگ گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خیر کافی کوشش کے بعد نیند محسوس ہونے لگی اور ابھی نیند کا جھونکا مکمل طور پر آ بھی نہ پایا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے دستک زور دار ہو گئی تو میری نیند بھک سے اڑ گئی۔ خوف و دہشت نے مجھے پھر سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دروازہ دھڑ دھڑ جنج اٹھا تو میں ڈر سے دہل پڑا رہا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد میرے کمرے سے منسلک دوسرے کمرے کی دیوار پر کوئی ہتھوڑے سے ضرب لگانے لگا۔ جیسے کوئی دیوار توڑ کر میرے کمرے میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں اپنی ساعت سے ان آوازوں کو دیواروں پر پہچاننے لگا کہ یہ آوازیں کون سی دیوار کے پیچھے سے آ رہی ہیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد جیسے ہی شور معدوم ہوا تو میری جان میں جان آئی شکر منایا کہ

اس شور سے مجھے نجات ملی۔

میرے خوف و ڈر میں ابھی تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ پھر اسی دیوار سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز بلند ہونے لگی جیسے کوئی اس عورت کو جان سے مارنے کے لئے تشدد کر رہا ہو۔ میں کھوجیوں کی طرح دیوار سے اپنا کان لگائے دوسری جانب کی باتیں سننے کی تگ و دو میں لگا رہا لیکن میں کچھ سن نہ پایا۔ لہٰذا خوف کے مارے میں اپنے بیڈ پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ میں دہشت کے مارے پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ''کیا میں اتنی بات پر خوف زدہ ہوں۔'' میں نے دل میں سوچا۔

لیکن نہیں..... یہ اتنی سی بات نہیں تھی۔ ماحول اتنا بھیانک اور خوف ناک تھا کہ میرا دل بند ہونے کو تھا۔

اچانک مجھے لگا کہ دیوار اب گری کہ تب..... پھر وہ شور بھی کچھ دیر بعد تھم گیا۔ اب فضا میں صرف سسکیاں گونج رہی تھیں۔ کچھ دیر یوں ہی خوف کے مارے گزر گئے اور جب اس کے بعد میری ہمت جواب دے گئی تو میں زور سے چیخ کر بولا۔ ''کون ہے؟ پلیز بند کرو، یہ رونا دھونا۔'' اور حیرت انگیز طور پر میرے ایسا کہنے سے تمام شور بند ہو گیا۔

لیکن وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اس کے بعد جو چیخ و پکار ہوا تو میرے کان کے پردے پھٹنے کے قریب ہو گئے، اتنی بھیانک چیخوں کو میرے لئے برداشت کرنا دوبھر ہو گیا۔ مارے غصے کے غضبناک حالت میں، میں بیڈ سے اٹھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر مجھے زمین پر تازہ خون کے قطروں کا اندیشہ ہوا۔ جیسے یہاں خون کی بارش ہوئی ہو۔

میں اپنے حواسوں پر قابو پا کر اس کمرے کا معائنہ کرنے لگا جہاں فرش پر خون کے قطرے اور ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دیواروں پر جا بجا لکیروں کا راج تھا۔ جیسے کیلوں کی دکان لگی ہو۔ کمرے میں عجیب بو پھیلی تھی جیسے کوئی گندگی کا ڈھیر ہو، لیکن یہ سب سوچنے اور محسوس کرنے کی باتیں تھیں جبکہ اس کے برعکس وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔

میں حیرت میں گھرا وہاں سے نکل کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ گھر کا پراسرار سا ماحول عجیب سی وحشت لئے ہوئے تھا۔ خیر اس کے باوجود میں سونے کی کوشش کرنے لگا اور آخر میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔

کافی دیر سونے کے باوجود جب میں بیدار ہوا تو گھڑی میں ابھی بھی وہی وقت تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا یعنی گھڑی دو بج کر چھ منٹ ہی بجا رہی تھی۔ ڈر کے مارے میں فوراً گھڑی کی جانب بڑھا، لیکن یہ کیا..... میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ گھڑی کے باہر بھی وہی سماں تھا۔ جب میں یہاں آیا تھا۔

اچانک گھر گرج چمک ہونے لگی تو میں..... اس وحشت زدہ پریشانی کی حالت میں صوفے پر بیٹھتا چلا گیا۔ ''یا خدا..... یہ کیسا معاملہ ہے؟'' میرے منہ سے نکلا۔

میں ایک گرداب بلا میں پھنس چکا تھا۔ جہاں میری سانسیں تو چل رہی تھیں لیکن میری زندگی کا دائرہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں کی ہر چیز ساکت ہو، اس ماحول میں کسی قسم کی کوئی حرکت محسوس نہیں کی جا سکتی تھی حالانکہ مجھے شک ہوا کہ یہاں کوئی تو ہے لیکن یہاں کا ماحول ویسا ہی ساکت تھا۔

اچانک اس ساکت ماحول میں ایک عجیب آواز گونجتی چلی گئی جو کسی بچی کی تھی۔ میں فوراً بے چین ہو کر جھٹ دروازہ کھول کر باہر کی جانب لپکا۔ جہاں میں نے ایک بچی کو پایا، اس کی حالت دیگر گوں تھی۔ آنکھیں بے رونق تھیں، جیسے ان آنکھوں میں جینے کی کوئی رمق نہ ہو۔ بچی ہاتھ میں ٹوٹا ہوا ایک کھلونا لئے رونے میں مشغول تھی۔ میں دم بخود ہو کر اسے تکے جا رہا تھا کہ ایک دم وہ بچی اچھل کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئی، بچی کی اس حرکت سے میں خوف زدہ ہو گیا لیکن جب بچی کی بے رونق آنکھوں میں سے خون کے آنسو چھلک

پڑے تو میں بے خوف ہو کر نرم پڑ گیا۔ ”تم گڑیا کہاں سے آئی ہو جبکہ دروازہ تو میں نے لاک کیا تھا۔“ میں اس بچی کو لئے اندر کمرے میں آ گیا اور اسے صوفے پر بیٹھا کر پوچھنے لگا مگر میرے اتنے سوال و جواب پر وہ کچھ نہ بولی۔

میں اور بھی سوال کرنے کے موڈ میں تھا کہ اچانک دوبارہ دیوار پر ہتھوڑے اور زنجیروں کی آوازیں گونجیں، آوازیں اسٹری اسٹینڈ کے پاس سے آ رہی تھیں۔ میں جیسے ہی آواز کے تعاقب میں بھاگا تو وہ آوازیں ایک دم معدوم ہو گئیں جیسے میرا وہم ہو۔

خیر جیسے ہی میں نے پلٹ کر صوفے پر بیٹھی بچی کی جانب دیکھا۔ تو وہ غائب تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اسے اپنے کمرے سے لے کر سارے گھر میں ڈھونڈتا ہوا آخر ایک بار پھر اسی کمرے میں داخل ہو گیا جہاں کیلیں اور زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایسا گمان ہوتا تھا جیسے یہ کوئی قید خانہ ہو اور ان زنجیروں میں کسی قیدی کو جکڑا جاتا ہو۔

اس گھر میں میرے ساتھ عجیب و غریب اور خوفناک واقعات پیش آ رہے تھے۔ سارا ماحول ایک انوکھا طلسم لئے ہوئے تھا جس نے مجھے خوف سے دو چار کر رکھا تھا۔ میں بڑی مشکل سے آگے بڑھتا ایک دم ٹھٹک کر رک گیا..... میں دم بخود سا سامنے فرش پر پڑے ہوئے ٹوٹے کھلونے کو خون میں لت پت تکے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں خوف کی دہشت سے پھٹ رہی تھیں۔ میں اس کھلونے پہ لگے خون پر نگاہ مرکوز کئے بالکل سپاٹ انداز میں چلتے ہوئے قریب گیا اور کھلونے کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ نہ جانے وہ بچی کہاں چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا جو یہ خون کے دھبے.....؟ میں اسی کشمکش میں گھر کر بلند آواز میں چیخ کر بچی کو پکارتا رہا مگر میری آواز کی ارتعاش دیواروں سے ٹکرا کر دوبارہ مجھ تک ہی پہنچتی رہی۔ جیسے میں مائیک میں بول رہا ہوں اور آواز گونج کر مجھ تک ہی پلٹ آتی۔

خیر میں دوبارہ اپنے کمرے میں تھا اس کے بعد میں پھر نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا تھا۔

دوبارہ جب میں جاگا تو ایک بار پھر اندھیری رات نے ہی میرا استقبال کیا یعنی پھر وقت وہی تھا۔ ”دو بج کر چھ منٹ“

میں اس مصیبت سے تنگ آ چکا تھا کہ ”آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ کوئی تو حل ہو گا اس منحوس گھر اور اس اندھیری رات سے نکلنے کا۔“ ان حالات سے تنگ آ کر یہاں سے جانے کا ارادہ کیا اور اپنا سامان پیک کر کے جیسے ہی میں کمرے سے نکل کر باہر آیا تو وہاں صرف راہداری تھی لیکن مین گیٹ کہیں نہ تھا۔ میں اپنا سامان پھینک کر پاگلوں کی طرح، یہاں وہاں دیواریں ٹٹولنے لگا لیکن سب کچھ بے کار تھا کیونکہ وہاں کسی گیٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”میری حالت ایسی تھی جیسے ایک قیدی کو قید کر دیا گیا ہو، بغیر کسی جرم کے۔“

آخر تھک ہار کر میں دوبارہ اپنے اسی منحوس کمرے میں آ گیا۔ ”اب میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں یہاں آیا تھا۔ لیکن کسی خیال کے تحت میں اپنے سامان میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ مگر کافی تلاش کے باوجود مجھے وہ نہ ملا تو میں خون کے آنسو رونے لگا، کیونکہ مجھے یقین تھا جب میں یہاں آیا تھا تو میرے ہاتھ میں میرا موبائل اور کلائی میں گھڑی بندھی تھی جو کہ اب ندارد تھی۔

”یا خدا..... مجھے اس عجیب و غریب آسیبی چکر سے رہائی دلا دے۔“ رو رو کر جب میری ہمت جواب دینے لگی تو میں زور زور سے چیخنے لگا۔ ”کوئی ہے۔ یہاں جو میری مدد کرے، پلیز! مجھے اس گھر سے باہر نکالو، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ پلیز! مجھے اس اندھیری رات سے بچالو، مجھے باہر نکالو، کوئی ہے..... پلیز! میری مدد کرو.....“ اور اس طرح چیختے چلاتے دھیرے دھیرے میں بے ہوش ہو گیا پھر مجھے علم نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

ہوش آنے پہ میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک

اس ساکت ماحول میں ایک عجیب سی آواز گونجی۔ جو کسی آدمی کی تھی۔ اور پھر میں لپک کر باہر راہ داری میں بھاگا تو دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھ میں ڈنڈا لئے وہاں براجمان تھا۔ اور اس کے سامنے ایک عورت فرش پر خون آلود تھی اور وہ آدمی ایک بچی کو لگاتار مار مار کر غرا رہا تھا۔ بچی ڈر کر سیڑھیوں کے پیچھے چھپ گئی لیکن عورت فرش پر تڑپتے ہوئے بچنے کی کوشش میں لگی تھی۔

مکروہ جلاد آدمی اس پر برس پڑا۔ ”کیا کہا تم نے تم مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ گی، نہیں..... نہیں..... میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہیں اپنے آپ سے کبھی دور نہیں کر سکتا، میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی اس آدمی نے ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے اس عورت کے دائیں پاؤں پر دے مارا، جس کی وجہ سے وہ عورت چیخنے لگی۔ ”پلیز! مجھے مت مارو..... پلیز! آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں، میں تنگ آ گئی ہوں روز روز کی مار سے۔ آج یا تو آر ہے یا پار۔“ وہ عورت گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔ ”میری سزا تو ٹھیک ہے۔ لیکن اب اس معصوم کو مارنے پر تل پڑے ہو۔“

پھر وہ عورت چیختی ہوئی جیسے ہی سامنے مین گیٹ کی طرف جانے لگی تو یک دم اس ظالم آدمی نے ڈنڈا سے عورت کے سر کا نشانہ باندھتے ہوئے ضرب لگائی تو وہ عورت وہیں ٹھہر گئی۔ اور اس کے سر سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ پھر وہ آدمی اس طرف بھاگا جدھر وہ بچی چھپی تھی۔ بچی اپنی ماں کی حالت دیکھ کر زار و قطار رو رہی تھی۔

اچانک اس سنگ دل آدمی نے اس بچی کو بالوں سے پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا، اور پھر اس کے سر کا نشانہ لے کر سر پر ضرب لگائی تو وہ معصوم ننھی سی جان اتنی زور آور ضرب سے دم توڑ گئی۔ ایک بار پھر وہاں خون ہی خون تھا۔

میں سکتے کی کیفیت میں وہ خونی منظر دیکھ کر دم بخود رہ گیا اور پھر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خوف و دہشت سے میں اپنی آنکھوں کو بند کر کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، جیسے میرا کوئی اپنا مر گیا ہو۔

چند منٹ بعد جب کچھ حوصلہ ہوا تو میں راہ داری میں کچھ نہ دیکھ پایا کیونکہ وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ عورت، آدمی اور بچی وہاں سے غائب تھے بلکہ دیواروں پر لگے خون کے دھبے ویسے کے ویسے ہی تھے۔

میں بوکھلا چکا تھا۔ پل دو پل بدلتی سچویشن سے میں اس کمرے کی طرف لپکا مگر دروازہ بند تھا۔ جیسے کسی نے لاک کیا ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں بری طرح پھول چکے تھے کہ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں لیکن خون کے نشانات ساری حقیقت کی داستان بیان کر رہے تھے۔ میں لحہ بہ لحہ غم سے بیحد پاگل ہوتا جا رہا تھا۔

آخر تھک ہار کر میں پھر اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹا تھا، گہری نیند نے پھر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا کہ اچانک میرے چہرے پر پانی کا ایک قطرہ گرا، پھر دوسرا، دوسرے کے بعد جیسے بارش برسنے لگی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ بارش کمرے میں موجود روشن دان سے آ رہی تھی۔ ایک بار پھر راہ داری سے اسی آدمی کی آواز گونجی، تو میں فوراً باہر نکلا تو دیکھا کہ وہی منظر دوبارہ دہرایا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت سارے لوگ مل کر بین کر رہے ہوں۔ ہر طرف شور سنائی دینے لگا۔ وہی ہولناک اور مکروہ آوازیں جس سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ مجھ سے جب برداشت نہ ہو سکا تو میں اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ان لوگوں پر میری چیخ و پکار کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور مجھے اپنی ہمت جواب دیتی محسوس ہونے لگی۔

میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”تم کیوں بلاوجہ ان کو مارنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ جو نہی میں اس آدمی کے پاس پہنچا تو وہ گھر اکر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ لیکن اس بار جیسے ہی اس ظالم آدمی نے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر اس عورت کے سر کا نشانہ بنانا چاہا تو میں نے ایک لحہ ضائع کئے بغیر آگے بڑھ کر وہ ڈنڈا اس آدمی کے ہاتھ سے چھین لیا، بلکہ چھینے کے ساتھ ہی تابڑ توڑ ڈنڈوں کی اس پر برسات کر دی، جس سے وہ آدمی تڑپنے لگا۔

عورت اور اس کی بیٹی زندگی ہوئی آواز میں

بولیں۔ ”مارو..... اس ظالم، باپ اور شوہر کو، یہ بہت ظالم ہے، مارو..... مارو.....“

میں کسی سحر میں جکڑے بے تحاشہ ڈنڈوں سے آدمی کو مارتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی مجھ سے زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ لیکن میں کسی اندیکھی قوت کے تحت اسے ڈنڈے مارتا رہا، اور آخر کار اس آدمی کا قصہ تمام ہو گیا۔

وہ عورت اور بچی اٹھ کر میرے بہت قریب آئیں اور کہنے لگیں۔ ”آج ہم آزاد ہیں اس جلاد کے ستم سے، ورنہ ہم روز جیتے اور مرتے تھے۔ بیٹا تمہارا بہت بہت شکریہ کہ آج تمہارے ہاتھوں ہماری رہائی ہو گئی۔ اب ہم ایک ابدی نیند سوئیں گے۔ بہت بہت شکریہ۔“

میں اپنے اس کارنامے کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر بہت پرسکون تھا۔ پھر میں اس عورت سے مخاطب ہوا۔ ”آپ کون ہیں؟ اور یہ سنگ دل، ظالم شخص کون تھا؟“

میں ابھی اتنا ہی بول سکا تھا کہ میری نظر اس آدمی پر پڑی تو میں حیران رہ گیا کیونکہ وہ آدمی فوجیوں کی وردی میں ملبوس خون میں لت پت مرا پڑا تھا۔

جبکہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ انکل احمد تھے جن کی فیملی کو میں جلد ہی پہچان گیا اور عورت آنٹی آسیہ تھیں اور وہ بچی ان دونوں کی بیٹی عائشہ تھی جو ان کے ظلم کی بھینٹ میں پس کر خاک ہو گئی۔

اپنی بیوی، بیٹی کو مارنے کے بعد انکل احمد نے انہیں اسی کمرے میں زنجیروں سے قید کر دیا تھا۔

بھلا مرنے کے بعد کوئی ان زنجیروں کو توڑ کر بھاگ سکتا ہے۔ لیکن انکل احمد نفسیاتی مریض تھے، جن کی سوچ میں یہ شامل ہو چکا تھا کہ ان کی بیوی ان کی غیر موجودگی میں کسی اور سے ملاقاتیں کرتی ہے اور وہ بچی ان کی نہیں بلکہ کسی نا کردہ گناہ کی نشانی ہے۔ جب وہ ان دونوں کو مار پیٹ کر تھک گئے تو انکل احمد نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یہی نہیں بلکہ انہوں نے خود بھی خودکشی کر لی۔ نتیجتاً وہ تینوں بدروح بن گئے۔

میں راہ داری سے ہوتا ہوا سامنے تک پہنچ گیا۔ جہاں مین گیٹ واضح تھا کیونکہ مین گیٹ اب مجھے نظر آ گیا تھا۔

میرے پیچھے دھماکہ ہوا، اور پھر لگاتار بہت سے دھماکے ہونے لگے۔ مجھے اس گھر اور اندھیری رات سے باہر نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔ میں بھاگتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا، پوری عمارت کے پرخچے اڑ گئے۔ مکان کی طرف سے بھیانک آوازیں ختم ہو چکی تھیں۔ اور بے شمار انسانوں کی چیخ و پکار اور رونے کی دلدوز آوازیں یک دم بند ہو گئیں۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا، وہ بھیانک منظر دیکھتا رہا۔ وہ سلسلہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر ہر طرف گھمبیر خاموشی طاری ہو گئی۔ اندھیری رات چھٹ چکی، تو صبح میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نہایت دشوار راہوں سے ہوتا ہوا، لاہور پہنچ گیا، جہاں میری شریک حیات فری میرا انتظار کر رہی تھی۔

جب میں فری سے ملا تو وہ کہنے لگی۔ ”رضا تم کدھر چلے گئے تھے؟“

وہ بے تابی سے گلے لگ گئی اور بولی۔ ”رضا میں آج انتظار کر کے تھک چکی ہوں اور اب تم رات کے دو بج کر چھ منٹ پر گھر پہنچے ہو، تمہیں ذرا بھی میری فکر نہیں۔“

میں اپنی جان بچ جانے کی غنیمت سے فری کو پیار کرنے لگا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس آسیبی اور خونی گھر میں کافی عرصہ گزار کر آیا ہوں۔ لیکن یہ میرا وہم تھا۔ میں صبح کا گیا رات کو گھر پہنچا تھا۔ ”چلو میری جان کی خلاصی تو ہوئی۔“

صبح اٹھتے ہی میں نے ایک نیک کام کی شروعات کر دی، میں دوبارہ وہاں گیا اور اس گھر کو نیست و نابود کر کے وہاں ایک مسجد تعمیر کروانے لگا جو یقیناً میری کوششوں سے عنقریب مکمل ہو جائے گی۔ لیکن میری امی کی ناگہانی موت کا راز آج تک نہ مکمل سکا کہ وہ کون سا خوف وڈر تھا۔ جس کی وجہ سے وہ سہم سہم کر مر گئیں۔

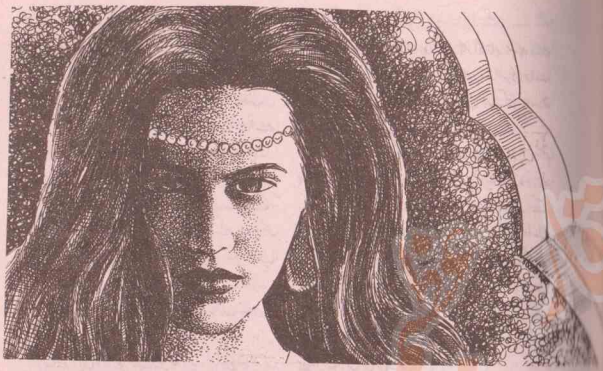

لاحاصل انتظار

ساجدہ راجہ۔ ہندواں سرگودھا

طوفانی جھکڑوں نے پوری بستی کو تھہ و بالا کر دیا تھا، بہت ھی نفسا نفسی کی گھڑی تھی، لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا کہ پوری بستی صفحہ ھستی سے مٹ جائے گی مگر ایک گھر ایسا تھا جہاں طوفان کا شائبہ تک نہ تھا آخر کیوں.....

خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اور عقل کو حیران کرتی لرزہ براندام دل فریفتہ کہانی

لان کی فالتو گھاس کاٹتے ہوئے لینا مصروف تھی، جب دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی تو اس نے مشین کو ایک طرف رکھا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئی، پھر دروازہ کھول دیا، سامنے ایک نہایت خوب صورت نوجوان ایک بوڑھی عورت کے ہمراہ کھڑا تھا، اس عورت کے بال بالکل سفید تھے، اس کے بوڑھے لیکن خوب صورت چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت نظر آتی تھی، جوانی میں یقیناً وہ بہت خوب صورت رہی ہو گی لیکن اب بڑھاپے اور جھریوں نے اس کی خوب صورتی کو چھپا لیا تھا لیکن وہ کیا ہے کہ ”کھنڈرات بتا رہے ہیں کہ عمارت بھی شاندار رہی ہو گی۔“

”ہیلو.....“ لینا نے انہیں خوش آمدید کہا۔

”ہائے.....“ نوجوان بھی جواباً بولا۔

”جی فرمایئے۔“ لینا نے نرم لہجے میں ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔

”دراصل ہمیں رہائش کے لئے کرائے کا ایک کمرہ درکار تھا تو ایجنٹ نے ہمیں آپ کے گھر کا بتایا۔“ نوجوان انکساری سے بولا۔

"اوہ....." لینا نے جلدی سے انہیں اندر آنے کا کہا۔ کچھ دن پہلے ہی لینا نے گھر کے ایک کمرے کو کرائے پر چڑھانے کی بات کی تھی کیونکہ ایک تو وہ فالتو پڑا رہتا تھا، دوسرا اس طریقے سے کچھ رقم ہاتھ آ جاتی۔

"نوجوان نے ایک بڑا سا بیگ اٹھایا ہوا تھا اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور سامان نہیں تھا۔ وہ دونوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ انہیں صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ کچن میں کافی بنانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد تین کپ ٹرے میں رکھے وہ واپس آ گئی۔ نوجوان اور اس بوڑھی کو کافی دینے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

نوجوان نے اس کا شکریہ ادا کیا، جسے اس نے سر ہلا کر قبول کیا۔

پھر بولی۔ "کیا آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گے۔ ویسے مجھے لینا کہتے ہیں اور میں ہی اس گھر کی مالک ہوں۔ ابھی شادی نہیں کی اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ ہے اور آپ؟" اس نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا تو اس نے نوٹ کیا کہ بوڑھی عورت بالکل خاموش بیٹھی تھی، اس نے کسی قسم کی گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

"اوہ..... سوری میں بھول گیا۔" نوجوان نے تعارف نہ کروانے پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ "میرا نام کرسٹیانو ہے اور یہ میری دادی ہیں انہیں میرا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔"

"چلیں میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھادوں۔" کافی پینے کے بعد لینا نے ان دونوں کو کہا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

لینا کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دونوں شکل سے ہی شریف نظر آتے تھے، دوسرا شور وغل کی کوئی بات نہیں تھی، وہ شروع سے ہی تنہا رہتی تھی اس لئے شور بالکل پسند نہیں تھا، سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آئے، چھت پر وہی ایک کمرہ تھا جو لینا نے کرائے پر دینا تھا۔ صاف ستھرا باتھ روم کی سہولت بھی چھت پر موجود تھی۔ پودوں اور پھولوں کے چند گملے بھی چھت پر رکھے ہوئے تھے، جن پر لینا خصوصی توجہ دیتی تھی اور ان پر کھلے پھول نہایت دلکش لگ رہے تھے۔ "او..... زبردست۔" کرسٹیانو نے توصیفی انداز میں پھولوں اور صاف ستھرے کمرے کو دیکھا۔

"تم نے ہر چیز کو خوب صورت طریقے سے سنبھال رکھا ہے، دادو یقیناً یہاں رہ کر آپ بہت خوشی محسوس کریں گی۔" کرسٹیانو نے میرا کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر بھی دلچسپی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

"کیا مطلب میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" لینا نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

دراصل بات یہ ہے کہ" کرسٹیانو نے تمہید باندھی۔ دادی بہت سوڈی مزاج کی ہیں، میں نے کرائے کے جتنے بھی گھر دکھائے انہیں کوئی پسند نہ آیا۔ آپ کے گھر آنے سے پہلے میری امید دم توڑ چکی تھی کہ دادی کو کوئی گھر پسند بھی آ سکتا ہے۔ لیکن یہاں آ کے یہ بہت خوش دکھائی دے رہی ہیں۔"

لینا نے میرا کی طرف دیکھا جو چھت سے دور نظر آنے والے سرسبز پہاڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کے تاثرات تھے۔

"او کے مس لینا۔ ایگین تھینکس۔ اتنا صاف کمرہ دینے پر..... اب ایڈوانس کی بات ہو جائے۔ لینا نے اسے ایڈوانس بتایا تو کرسٹیانو نے چند نوٹ اسے پکڑائے لینا نے انہیں گنا تو وہ ایڈوانس سے دوگنا تھے لینا کچھ شاید کرسٹیانو نے گننے میں غلطی کی ہے، اس نے مطلوبہ رقم رکھ کر باقی اس کے حوالے کی تو وہ بولا۔ "رکھ لیں مس لینا مجھے گننے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی چونکہ میری دادی یہاں آ کر بہت خوش ہیں تو میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔"

لینا نے ہچکچاتے ہوئے وہ رقم رکھ لی۔ پھر وہ نیچے اتر آئی کیونکہ اس نے کچھ کام نمٹانا تھا اس کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں کے لئے دوپہر کا کھانا بھی تیار کرے گی۔ آخر لینا نے سوچا.....!

دوپہر کا کھانا دونوں نے شکریہ کے ساتھ رکھ لیا لیکن کرسٹیانو نے بعد میں معذرت کر لی کہ وہ ان کے لئے کوئی تکلف نہ کیا کرے کیونکہ وہ اپنے کھانے کا انتظام خود کر سکتے ہیں۔

لینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد لینا کبھی نہ جان پائی کہ وہ لوگ کب اور کہاں سے کھاتے ہیں کیونکہ نہ تو چھت پر کوئی کچن تھا نہ اس نے کرسٹیانو کو کبھی ہوٹل سے کھانا لاتے دیکھا۔

ہو سکتا ہے وہ باہر سے کھا کر آتا ہو اور میرا کے لئے کوئی ہلکی پھلکی غذا لاتا ہو جسے شاید اس نے اتفاقاً نہ دیکھا ہو ویسے بھی وہ بوڑھی عورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا کھاتی ہوگی۔ اس نے سوچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ویسے بھی وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ کبھی دن میں ایک آدھ بار اور کبھی زیادہ بار بھی وہ اوپر کا چکر لگا لیتی جب کرسٹیانو گھر پر موجود نہ ہوتا۔

میرا نے اب خاموشی کا لبادہ اتار دیا تھا اور لینا سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی، لینا سے اپنے بارے میں بتانی لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی وہ میرا سے اس کے بارے میں کچھ نہ جان سکی، وہ جب بھی میرا سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتی تو نہ جانے کس طرح کرسٹیانو کہاں سے آن موجود ہوتا اور پھر باتوں کا رخ تبدیل ہو جاتا..... کرسٹیانو نے لینا سے کہہ دیا کہ وہ اسے کرس کہہ کر پکارا کرے کیونکہ گھر میں سب اسے کرس ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔

کرس بہت وجیہہ تھا اس کی عمر چھبیس ستائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی شرٹ کے خوب صورت آستینیں ہر وقت بولتی دکھائی دیتی تھیں، خوب صورت گولڈن بال اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ کرتے تھے لمبا قد اور کرتی جسم۔

کبھی کبھی تو تیس سالہ لینا کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی سی محسوس ہوئیں۔ خوب صورت تو وہ خود بھی بہت تھی اور اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے بچیس کی دکھائی دیتی تھی، اس کے آبشاروں جیسے گھنے بال پشت سے نیچے تک آتے تھے، اس کی عمر لڑکیاں یا عورتیں چھوٹے بالوں کو ترجیح دیتی تھیں لیکن لینا کو بچپن سے ہی لمبے بالوں کا شوق تھا اس لئے وہ اپنے بالوں کی بہت حفاظت کرتی تھی۔ کرس کا جب بھی لینا سے سامنا ہوتا تو وہ اس کے بالوں پر ستائش بھری نظر ڈالنا نہ بھولتا.....!

لینا نے اپنی طرف سے کبھی انہیں شکایت کا موقع نہ دیا، کرس نہ جانے کہاں کہاں کی آوارہ گردی کے لئے نکل جاتا اور لینا اس سارے وقت میں میرا کے پاس موجود رہتی، کبھی ایسا بھی موقع آتا کہ کرس رات کو آنہ پاتا تو لینا رات کو میرا کے پاس سو جاتی، ماں جانے کیوں لینا کو اس شفیق بوڑھی میرا کے پاس بیٹھ کر سکون سا ملتا تھا اور میرا بھی اس کی رفاقت میں خوش رہتی۔

ایک دن لینا نے غور کیا کہ جب سے وہ دونوں آئے تھے اس کے گھر میں ہر چیز کی فراوانی ہو گئی تھی، اسے پتہ بھی نہ چلتا کہ اس نے وہ کب خریدی.....؟ لینا سے ان دونوں کی آمد کی برکت سمجھ رہی تھی۔ مہینے کا کرایہ بھی کرس نے ڈبل ادا کیا اور کبھی نہ کبھی اسے کوئی قیمتی تحفہ بھی دے دیتا تو لینا شرمندہ ہی ہو جاتی۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی.....؟" ایک روز کرس نے لینا سے پوچھا تو لینا حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی کیونکہ ان کے درمیان ابھی بے تکلفی نہیں تھی کہ لینا سے وہ اس قسم کا سوال پوچھتا جب وہ خاموش رہی تو کرس سمجھ کر اسے برا لگ گیا ہے تبھی اس نے معذرت کی۔

"نہیں کرس۔ مجھے برا نہیں لگا بلکہ میں تمہارے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"ہوں.....؟ کیا میں نے اتنا مشکل سوال کر دیا.....؟"

"نہیں..... لیکن..... خیر میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ابھی تک مجھے کوئی اتنا اچھا نہیں لگا کہ اسے جیون ساتھی بنانے کا سوچتی۔ ہاں۔ اگر تم جیسا کوئی مل گیا تو سوچنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاؤں گی۔" لینا کی آنکھوں میں چھپی شرارت کو کرس اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لئے وہ بھی مسکرایا۔

"ویسے مس لینا بے شک آپ کو برا لگے گا لیکن میں منہ پر کہہ دینے کا عادی ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ کیوں.....؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن یہ چونکہ میرا پہلا تجربہ ہے یہ سوچھوں اچھا بھی لگ رہا ہے۔ اگر میں یہی بات تم سے پوچھوں تو..... تمہارا جواب کیا ہوگا؟" کرس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو لینا گڑبڑا گئی۔ وہ بھلا کیا کہتی۔

"بولا ناں..... میں منتظر ہوں۔" کرس بے تابی سے بولا۔

"تم مجھے اچھے تو لگتے ہو، لیکن کرس تم مجھ سے دو تین سال چھوٹے ہو۔ پھر یہ اچھا تو نہیں لگے گا کہ.....؟" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے کہا تو جواباً کرس قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "پھر بولا۔" کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تم سے چھوٹا ہوں۔ یاد ہو سکتا ہے میری عمر سو برس ہو پھر.....؟" اور لینا اس کی بات کو مذاق سمجھ کر ہنس پڑی اور یہ ایک طرح سے اپنی رضامندی کا اشارہ تھا۔ کرس کی نگاہوں میں اس کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

اس نے لینا کے نرم خوب صورت ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیا اور پھر تنظیما جھکا تو لینا ٹھٹھکا کر ہنس پڑی۔

صبح ہی صبح وہ جب کچن میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ اتنا صاف ستھرا کچن..... حالانکہ جب رات میں کچن سے گئی تھی تو ہر چیز الٹ پلٹ ہو رہی تھی وہ سارا دن کام کر کے اتنا تھک چکی تھی کہ اسے کچن سمیٹنا ایک ناممکن مرحلہ لگ رہا تھا۔ اس لئے وہ سونے چلی گئی کہ صبح اٹھ کر صاف کر لے گی لیکن اب اتنا صاف کچن دیکھ کر وہ حیران ہونے کے ساتھ تھوڑا خوف زدہ بھی ہو گئی۔ "کیا اس گھر میں بھوتوں کا بسیرا ہو گیا ہے؟" اس نے جلدی سے کافی بنائی اور چھت پر میز کے پاس آ گئی، نیچے اسے لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف سناٹا دندناتی آندھیوں اسے گھور رہی ہوں حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا یہ صرف اس کے اندر کا خوف تھا اور جو اسے باہر سے ڈرنے پر مجبور کرتا رہا تھا۔ میزا نے حیرانگی سے اس کی صورت دیکھی اور کہا "کیا ہوا؟" تو جواباً لینا نے اسے ساری بات بتا دی تو وہ مسکرانے لگی۔

"تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے لینا ڈیئر.....! اگر کوئی بھوت تمہارے سارے کام کر رہا ہے تو تمہارا اس میں کیا نقصان.....؟ الٹا تمہارا بھلا ہو جاتا ہے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے مگر مجھے بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔" لینا نے بے چارگی سے میزا کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

"ارے پاگل لڑکی۔ پریشان مت ہو، یہ سب کرس نے کیا ہے، رات اسے کافی کی طلب ہوئی تو وہ تمہاری طرف گیا، تم چونکہ سو رہی تھی اس لئے وہ خود کچن میں چلا گیا اور کچن کا حشر دیکھ کر پہلے اس کی صفائی کی پھر اپنے لئے کافی بنائی۔ دراصل وہ بہت نفیس طبیعت کا ملک ہے، بے ترتیبی اسے کبھی بھی پسند نہیں رہی۔"

اور لینا نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ "ارے ارے....." لیزا نے اسے شرمندہ دیکھ کر کہا..... "تم شرمندہ مت ہو، میں جانتی ہو کہ تم بہت نفاست پسند ہو اور اچھی لڑکی ہو، گھر کو بھی تم نے بہت اچھی حالت میں رکھا ہوا ہے، تھکاوٹ بھی ہو جاتی ہے کبھی کبھی، آخر کو انسان جو ہو۔" اور لینا ہلکی پھلکی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

سرشام ہی بادل گھر آئے، شدید گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی، ہر طرف گھپ اندھیرا پھیل گیا، کرس صبح سے ہی کہیں گیا ہوا تھا، اور میزا چھت پر اکیلی تھی، بارش بہت تیز تھی ساتھ میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک مزید ماحول کو خوفناک بنائے دے رہی تھی، لینا چاہتے ہوئے بھی اوپر جا نہیں پا رہی تھی، پتہ نہیں بوڑھی میزا کس حال میں ہو گی، اسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

وہ بار بار دروازے کے پاس آتی اور باہر کا خوفناک ماحول دیکھ کر واپس پلٹ جاتی۔ "خدا جانے یہ کرس کہاں چلا گیا۔ جانتا بھی ہے کہ بوڑھی دادی گھر پر اکیلی ہوں گی، میں اب ہر وقت تو اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" وہ غصے میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"پتہ نہیں وہ اتنی تیز بارش میں خود کہاں ہو گا؟" اسے

اب نئی فکر لگ گئی۔ "جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔"

وہ کچن میں آ گئی تاکہ کافی پی کر کچھ اعصاب کو نارمل کرے اور ہوا بھی ایسا ہی، کافی پی کر وہ خاصی نارمل ہو گئی۔

بارش تیز ہواؤں کے ساتھ جاری رہی، لینا کے گھر کے باہر موجود بڑے بڑے درخت تیز ہوا اور بارش کی بوچھاڑ کی بدولت کافی حد تک اس کے گھر کے اوپر تک جھک آتے اور پھر سیدھے ہو جاتے، لینا کو ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ درخت ٹوٹ کر اس کے گھر پر نہ گر جائیں لیکن وہ مضبوط درخت تھے اور ان میں قدرتی لچک موجود تھی، جس کی وجہ سے وہ آخری حد تک جھکنے کے بعد پھر سیدھے ہو جاتے تھے لینا نے اپنی توجہ ادھر ادھر سے ہٹا کر پھر کرس اور میزا کی طرف کر لی۔

"میزا تو چلو کمرے میں محفوظ ہے لیکن کرس نہ جانے کہاں ہو گا..... اسے بارش سے بچنے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی ملا ہو گا کہ نہیں۔" لینا یہی سوچتے ہوئے دروازے کی طرف آئی اور آہستہ سے دروازے کو کھول کر باہر جھانکا۔ موسم بدستور خراب تھا، اور جانے کے لئے کافی ہمت درکار تھی جو لینا نہیں کر پا رہی تھی۔ "میں کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟" پھر کچھ سوچ کر وہ کچن کی طرف چلی آئی، اس کا خیال تھا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے کرس کسی بھی ہوٹل میں نہیں جا پائے گا ناں وہ خود کھائے گا اور نہ اپنی دادی کے لئے کچھ لائے گا اس لئے اس کا ارادہ ڈنر تیار کرنے کا تھا تاکہ کرس اور میزا کو بھوکا نہ سونا پڑے۔

سب کچھ فریج میں موجود تھا اس نے مصالحہ لگے چکن کو اوون میں رکھا اور میٹھے میں ٹرائفل تیار کرنے لگی۔ آئس کریم کے علاوہ کیک بھی فریج میں موجود تھا، ساتھ میں اس نے براؤن رائس بنانے کو ترجیح دی۔ کھانا آخری مراحل میں تھا۔ اس لئے وہ کچن سے باہر نکل آئی تاکہ موسم کی صورتحال کا جائزہ لے سکے۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسی اندھیرے کو چیرنے والی بجلی کسی حد تک کم کرنے کے ساتھ ہی پراسرار بنا رہی تھی۔

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہو گا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہو گا۔ یا در کھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-0333-2327650

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

"کٹ..... کٹ....." جیسی آوازیں سن کر وہ خوف زدہ سی ہوگئی کیونکہ وہ آوازیں چھت سے آرہی تھیں اور کافی عجیب سی لگ رہی تھیں۔

لینا خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے چین بھی ہوگئی وہ بوڑھی میزا کے لئے پریشان تھی کہ نہ جانے اس پہ کیا بیت رہی ہوگی.....؟

مجھے تھوڑی ہمت کرنا ہوگی، مجھے اوپر جا کر لیزا کو دیکھنا ہوگا، ہوسکتا ہے وہ کسی پریشانی میں ہو، اگر اسے کچھ ہوا تو میں کرس کو کیا جواب دوں گی، وہ مجھ پر برہم ہوگا، اور اس کی ناراضگی، میں بھلا کیسے گوارہ کرسکتی ہوں۔" یہ سوچ کر لینا نے دھڑکتے دل کے ساتھ باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

ان چند دنوں میں وہ کرس کو اتنا سوچنے لگی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ اب کرس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے۔ اس سے جدائی کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

جونہی اس نے صحن میں قدم رکھا تو تیز ہوا کی وجہ سے قریبی درخت تیز چراہٹ کے ساتھ صحن میں جھک آئے، ساتھ ہی بادل اتنی زور سے گرجے کہ لینا کی چیخیں نکل گئیں تو کوئی بھاگ کر آیا اور اسے دبوچ کر اپنے ساتھ لگالیا، وہ مزید دہشت زدہ ہوگئی، ابھی اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے کرس کی آواز سنائی دی۔ "لینا ہوش کرو، میں ہوں کرس۔"

"کرس۔" لینا نے زیرلب دہرایا اور اس سے لپٹ گئی، اس کا جسم کسی خزاں رسیدہ شاخ کی مانند کانپ رہا تھا، کرس اسے اپنے ساتھ لگائے کھڑا رہا، یہاں تک کہ اس کی کپکپاہٹ ختم ہوگئی۔

موسم کی شدت کا احساس نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ لینا کو جب احساس ہوا تو وہ تیزی سے کرس سے الگ ہوگئی، اس کے چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی، کرس نے خاصی دلچسپی اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا اور اسے صوفے پر بیٹھا کر خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟" کرس نے نرمی سے لینا سے پوچھا تو اس نے جواباً ساری تفصیل اسے بتادی۔

کرس کے چہرے پر پیار بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔

"اوہ! لینا ڈارلنگ تم ہمارے بارے میں اتنی پریشان مت ہوا کرو، دادی اور میں اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

لینا نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بولی۔ "تم دونوں کے لئے میں نے ڈنر تیار کیا ہے، میں نے سوچا اس موسم میں تم ہوٹلوں میں کہاں خوار ہوتے پھرو گے۔" کرس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

"تم بیٹھو میں ذرا کچن میں جارہی ہوں۔" کرس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لینا کچن میں گئی، اس نے ٹیبل پہ کھانا لگانا شروع کردیا سارے کام نمٹا کر جب وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو کرس کے ساتھ میزا کو دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا، ابھی وہ یہی تو سوچ رہی تھی کہ میزا کو کیسے نیچے بلائے کیونکہ اتنی تیز بارش میں اس کا نیچے آنا خطرناک تھا کیونکہ اگر پیر پھسل جاتا تو.....

بوڑھی عورت تھی اسے بڑی مشکل ہوجاتی، لیکن اچانک اسے کرس کے ساتھ موجود دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گئی۔ "آپ کیسے نیچے آئیں؟ مجھے تو یہی فکر ہورہی تھی کہ آپ کیسے آئیں گی، بارش تو نہ جانے کب رکے اس وقت تک تو کھانا ٹھنڈا ہوکر بدمزہ ہوجاتا؟ لینا نے جلدی جلدی پوچھا تو جواباً ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، جبکہ جواب کرس نے دیا۔

"دراصل مجھے پتہ تھا کہ تم مجھ سے دادی کے بارے میں کہو گی کہ ان کو کیسے لایا جائے تو تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں انہیں لے آیا۔"

لینا حیران رہ گئی..... اتنی جلدی اتنی تیز بارش میں کیسے.....! لیکن وہ کچھ پوچھ نہ سکی۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا اور اس کے بعد کافی..... وہ دونوں اتنے لذیذ ڈنر کے لئے لینا کے شکر گزار تھے لینا نے انہیں ادھر ہی رات گزارنے کی دعوت دی جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ ٹھکرادی.....!!!

صبح جب لینا بیدار ہوئی تو اس کے ذہن میں یہی تھا کہ پورا گھر الٹ پلٹ ہوا پڑا ہوگا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا جب بھی آندھی یا بارش آتی قریبی درختوں کے پتے اور شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے صحن میں جمع ہوجاتیں تو لینا کا آدھا دن صفائی میں گزر جاتا۔ اس وقت بھی اسے یہی ٹینشن تھی کہ کیسے وہ صفائی کرے گی، حقیقتاً وہ سستی ہی محسوس کررہی تھی لیکن جب وہ باہر آئی تو اس کی حیرانی سوا چند ہوگئی کیونکہ پورا صحن صاف ہوا پڑا تھا، کہیں بھی رات والی بارش کے اثرات نہیں تھے۔ بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ابھی پورا صحن صاف کیا ہو، وہ حیرت سے باہر نکل آئی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ خود سے بولی۔ "پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا..... جب کچھ سمجھ نہ آئی تو وہ اندر آگئی اور اپنے لئے ناشتہ بنانے لگی۔ ناشتے کے بعد اس نے کچن کی صفائی کی اور ٹی وی کے آگے براجمان ہوگئی پھر اس سے بھی دل اکتا گیا تو میزا کے پاس چلی گئی میزا تو جیسے اسی کی منتظر تھی، کرس بھی اس کے پاس موجود تھا لینا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک آگئی جسے لینا نے بخوبی محسوس کیا اور اس کی نظریں حیا سے جھک گئیں وہ آہستہ سے چلتی ہوئی میزا کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس سے گفتگو شروع کردی لیکن اس کی زیادہ تر توجہ کرس کی طرف ہی تھی جو مسلسل اسے ہی دیکھے جارہا تھا جب سے ان کے درمیان پیار کا اظہار ہوا تھا لینا نہ جانے کیوں کرس سے کترانے لگی تھی اور یہ صرف شرم تھی ورنہ وہ اسے دل ہی دل میں بے حد چاہنے لگی تھی۔

"لینا بچے ہم کہیں جانے کا پروگرام بنارہے ہیں اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتی ہو۔" میزا نے گفتگو کے دوران اچانک لینا سے کہا۔

"کہاں میزا آنٹی.....؟" لینا نے سوالیہ نظروں سے میزا کی طرف دیکھا۔

دراصل بچے یہ شہر کی فضا مجھے خاص راس نہیں آئی تو اس سلسلے میں پہاڑی علاقے کی طرف جانے کا ارادہ ہے، تاکہ میں کچھ بہتر محسوس کرسکوں، وہاں گھنے جنگلات اور صاف ماحول ہے، مجھے یقین ہے میں بہتر محسوس کروں گی۔" میزا نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا تو لینا کے چہرے پر حیرانگی کے تاثرات پھیل گئے اور اس نے ان تاثرات کو زبان بھی دے دی۔

"لیکن آنٹی آپ کیسے ان علاقوں کا سفر کریں گی، آپ کو تو بہت مشکل ہوگی۔"

"اس کی بات پر میزا کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کسی بچے کی بات پر بڑوں کے چہروں پر پھیلتی ہے۔

"میری فکر مت کرو بچے، میں عادی ہوں ایسے علاقوں میں سفر کرنے کی، تم بس اپنی مرضی بتاؤ، ہمارے ساتھ جارہی ہو کہ نہیں....." میزا کی بات پر لینا نے سوالیہ نظروں سے کرس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ہاں کرنے کا کہا تو لینا مسکراتی اور میزا کو ساتھ چلنے کی رضامندی دے دی۔

دو دن بعد وہ مکمل تیاری کے ساتھ روانہ ہوئے اور مزید ایک دن کے سفر کے بعد وہ پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے۔ لینا آنکھیں پھاڑے حیرانگی سے ان مناظر کو دیکھ رہی تھی، اسے اتنے خوب صورت مناظر دیکھنے کا بھلا کہاں اتفاق ہوا تھا وہ تو گھر سے بہت کم باہر نکلتی تھی، کرس نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور مسکرانے لگا۔ اس دن سفر کی تھکن اتار کر دوسرے دن وہ سارا وقت جنگل اور پہاڑوں پر گھومتے رہے، لینا کئی بار تھکی اور ستانے کے لئے بیٹھی لیکن حیرت انگیز طور پر بوڑھی میزا کے چہرے پر تھکن کے آثار تک نہ تھے بلکہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ مزید پر جوش ہورہی تھی، کرس تو چلو ہم دقا لیکن اتنی بوڑھی عورت سے لینا کو ایسی پھرتی کرتوقع نہیں تھی۔

بہرحال وہ خود بھی یہاں آکر بہت خوش تھی اور کرس کی ہمراہی میں ان لمحات کو دل کھول کے انجوائے کررہی تھی، وہ دل ہی دل میں بوڑھی میزا کی شکر گزار تھی جس نے اسے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے کر گویا اس پر احسان کیا تھا، ورنہ وہ تو شاید زندگی بھر ان علاقوں کو نہ دیکھ پاتی۔

ایک بات جو ان دونوں میں لینا نے نوٹ کی وہ یہ تھی

کہ کوئی بھی جنگلی جانور حتیٰ کہ کوئی پرندہ تک ان کے قریب نہیں آرہا تھا بلکہ وہ ان کو دیکھتے ہی بھاگ جاتے، جب یہی سوال لینا نے کرس سے کیا تو وہ خاموشی سے مسکرانے لگا اور بوڑھی میزا نے اسے تسلی دی کہ ”یہ سب اس کا وہم ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے گویا اس احساس کو زائل کرنا چاہا لیکن وہ چاہ کر بھی اس بات کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔

وقت بہت اچھا گزر رہا تھا کرس کی والہانہ نظریں اور شوخ جملے اسے کسی اور ہی جہان کی سیر کروا رہے تھے، بوڑھی میزا بھی ان کی دلچسپی جان گئی تھی اور جان بوجھ کر ان سے دور دور چلتی تھی، تاکہ انہیں کھل کر باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

کرس کی اس اچھی عادت کا لینا کو دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے کبھی تنہائی کے لمحات کا غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کی تھی، یہ حسین سفر پتہ نہیں کتنے دن جاری رہتا اگر اس رات ایک واقعہ پیش نہ آتا عجیب و غریب واقعہ.....!

وہ سب گہری نیند میں تھے جب ایک نہایت بھیانک آواز ان کو نیند کی وادی سے کھینچ لائی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے، میزا اور کرس تو جلد ہی سنبھل گئے، لیکن لینا ابھی تک خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی، کرس نے اس کے کندھے پر تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا اور ادھر دیکھنے لگا جدھر سے آواز آئی تھی، لینا کی نظریں بھی ادھر اٹھیں اور پھر پلٹنا بھول گئیں۔

سیاہ رنگ، گھٹنوں تک لمبے جھاڑ جھنکاڑ جیسے بال، سیاہ توے جیسی رنگت اور سرخ بڑی بڑی آنکھیں جن میں دہشت ناچ رہی تھی، وہ جو بھی تھی بہت ہیبت ناک تھی اور اس کی وحشت بھری نگاہیں کرس پر جمی ہوئی تھیں۔

لینا ساکت سی اسے تکے جا رہی تھی، کرس کی نگاہوں میں پہلی بار نظر کی ہلکی سی جھنک نظر آئی۔ بوڑھی میزا سراسیمہ نگاہوں سے کبھی کرس کو تو کبھی اس ڈراؤنی عورت کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”پھر بھاگ گیا تھا تو.....تو.....کیا سمجھتا ہے راجو تا سے بچ جائے گا؟ میری دسترس سے نکل جائے گا، یہ بھول تیری اب دور ہوگئی ہوگی، نام اور حلیہ بدلنے سے اصلیت نہیں بدلتی لاگام.....شادی تو تیری راجو تا سے ہی ہوگی، اس بات کو اب سمجھ جا اگر تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تھوکتی بھی نا تجھ پر.....یہ دل کم بخت لگتا نہیں تیرے بنا اور تو اس آدم زادی پر عاشق ہو بیٹھا۔“ اس راجو تا نامی مخلوق نے لینا کی طرف اشارہ کیا تو لینا کی روح فنا ہونے لگی۔

پورے سو سال ہو گئے تیرے لئے خوار ہوتے، لیکن تو ں نہ سمجھا ہمیشہ مجھے چکماوے کر بھاگتا رہا لیکن میں ہر بار تجھے ڈھونڈ ہی لیتی ہوں، اک بات اور سن لے غور سے، اب میں نے ایک ایسی طاقت حاصل کرلی ہے کہ اب تو چاہ کر بھی مجھ سے دور نہیں بھاگ سکے گا، میں آج ہی اپنی دنیا میں لے جا کر تجھ سے شادی کرلوں گی، میں بدصورت ہوں تو کیا ہوا، طاقتور بھی تجھ سے بڑھ کر ہوں اور محبت بھی شدت سے کرتی ہوں اور اسی محبت کے کارن تجھے اب تک اتنی ڈھیل دی اور تو اپنی بوڑھی دادی کو لے کر یہاں وہاں خوار ہوتا رہا لیکن اب تیری یہ بھاگ دوڑ ختم۔

چل آدم زادی تو ں بھی اس کا خیال چھوڑ، یہ تیری طرح کا انسان نہیں یہ نافرمان جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، تجھے اس لئے معاف کررہی ہوں کہ تو ں حقیقت سے بے خبر تھی ورنہ راجو تا کی کوئی رقیب زندہ نہیں رہی۔ چل اپنی دنیا میں.....“ پھر وہ کرس کی طرف مڑی۔

چل لاگام.....بس اب میرا ہو جا.....“ یہی الفاظ لینا کے کانوں میں پڑے اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے گھر کے گیٹ کے پاس موجود تھی۔

کافی سال گزر گئے لیکن لینا کو ان سوالوں کے جواب نہ مل سکے کہ وہ سب کیا تھا.....؟ راجو تا کون تھی اور کرس کیوں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا؟

اور یہ بھی کہ لینا کا کیا قصور تھا کہ وہ آج بھی کرس کے انتظار میں بیٹھی تھی، ایک ناختم ہونے والے انتظار میں.....!!!لاحاصل انتظار میں.....!!!

خس کم.....

بشیر احمد بھٹی۔ بہاولپور

نوجوان کے ذہن میں اچانک شیطانی منصوبہ آیا تو اس نے اپنے مخالف کی جان لینے کی ٹھان لی مگر موت اس کے سامنے کھڑی قہقہے لگا رہی تھی اور پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ جان لینے والا اپنی جان دے بیٹھا

ایک بدنیت، بدکردار، حرص میں مبتلا شخص کی حیرت انگیز.....تحیر انگیز عجیب کہانی

ریڈروک بلا کا ذہین اور فطین شخص تھا۔ اسے مذہب سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے چرچ جاکے دعا میں شامل ہوتا تھا۔ فادر نے ایک دن دعا سے پہلے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”دنیا میں جتنے مذہب ہیں۔ سب میں کسی کو ناجائز قتل کرنا منع ہے۔ مذہب عیسائیت میں بھی یہ ناجائز قتل ہے۔ اگر تمہارے گال پر کوئی ایک تھپڑ رسید کرے تو تم اپنا دوسرا گال اس کے سامنے کردو۔“

فادر نے جب یہ کہا۔ تو ریڈروک کا ذہن الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ اسے ایک ماہ قبل کی فادر کی ایک اور بات یاد آگئی۔ فادر نے کہا تھا کہ ”جو کوئی تم سے زیادتی کرے تو تم بھی غصے کی حالت میں اتنی ہی زیادتی کرو۔“ اب فادر نے جو بات کہی تھی۔ وہ پہلی بات کی تضاد تھی۔ ”ایک گال پر تھپڑ کھا کے بدلے میں مارنے

والے کو تھپڑ رسید کرنا چاہئے۔ جبکہ دوسرا گال پیش کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ڈبل زیادتی کا مرتکب ہوگا۔ جو دونوں گالوں پر تھپڑ مارے گا۔ کیا وہ بدلے میں دو تھپڑ کھائے گا؟" یہ بات ریڈروک کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ الہامی کتاب میں درج تھا۔ فادر نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی۔

اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ راتیں یخ بستہ تھیں۔ ریڈروک اپنے مکان میں موجود تھا۔ یہ عالیشان مکان اس کی مرحومہ بیوی کی نشانی تھی۔ یہ یادگار مکان وہ ہر حالت میں اپنی ملکیت میں رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ یہ مکان اسے اپنی دسترس سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اٹلی میں بس سال گزار کے اس کی مرحومہ بیوی کا بھائی واپس آ چکا تھا۔ اب وہ تقاضا کر رہا تھا کہ یہ مکان جو دراصل اس کی مرحومہ بہن کی جائیداد ہے۔ اسے دی جائے تاکہ وہ اسے فروخت کر کے زندگی کے باقی ماند ایام خوشحالی میں گزار سکے۔

ریڈروک کی بیوی کا نام جینا تھا۔ اس کے بھائی کا نام جیکب تھا۔ جیکب نے شادی نہیں کی تھی۔ آوارہ منش آدمی تھا۔ ریڈروک سے جینا کی بھی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ دونوں بہن بھائی اولاد سے محروم تھے۔ ان کے والدین فرانس میں ایک کار حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ باقی رشتہ داروں کا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا۔ اس خاندان کا جیکب آخری فرد تھا۔ جو مچھلی کا کانٹا بن کے ریڈروک کے گلے میں اٹک گیا تھا۔ جیکب کا کردار آوارہ گردی اور بدمعاشی پر مبنی تھا۔ آوارہ عورتوں کے ساتھ رات گزارنا اور شراب پینا اس کی عادت میں شامل تھے۔ جیکب، ریڈروک سے یہ مکان ہتھیا کے فروخت کر کے دوبارہ اٹلی جانے کے پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ تاکہ وہاں باقی ماندہ زندگی عیاشی سے گزار سکے۔

ریڈروک اس وقت اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور فادر کی بات اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ "کسی کو ناجائز قتل کرنا ایسا جرم ہے جس کی معافی نہیں، جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے گویا ساری کائنات کا مزار کر دیا۔"

ایک طرف مذہبی معاملہ تھا تو دوسری طرف اس کا آوارہ منش سالا تھا۔ اسے راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔ اگر ریڈروک اس کا مرڈر نہ کرتا تو اس عیاش اور بدقماش شخص نے ریڈروک کا مرڈر ضرور کر دینا تھا۔

ریڈروک اپنی آرام دہ کرسی کو آگے پیچھے کر رہا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح اونٹ پر سوار شخص آگے پیچھے ہوتا ہے۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ریڈروک چاہتا تھا۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کہ اچانک تیز ہوا کے جھونکے سے کھلی کھڑکی کا پردہ لہرایا اور کمرے کی کھڑکی کا ایک پٹ دوسرے سے ٹکرایا۔ شاید آندھی آ گئی تھی۔ ریڈروک نے کھڑے ہو کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کا نیلگوں پانی سیاہ رات میں عجیب طرح کا نظر آ رہا تھا۔ سمندر اس مکان سے نصف فرلانگ کی دوری پر تھا۔ اگر ریڈروک جیکب کا مرڈر کر دیتا تو اسے سمندر کی لہروں کے سپرد کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ اس کی لاش کو اٹھا کے بڑی آسانی سے سمندر کے قریب پہنچتا اور اسے لہروں کی طرف اچھال دیتا۔ تیز و تند لہریں جیکب کو غائب کر دیتیں۔

اب سوال یہ تھا کہ اس گناہ سے بچنے کا کوئی سہل طریقہ اپنایا جائے۔ جیکب کا مرڈر بھی ہو جائے اور ریڈروک مذہبی طریقے سے مجرم بھی نہ کہلائے اور پھر....."

اچانک ایک عمدہ اسکیم ریڈروک کے ذہن میں آ گئی تو وہ مسکرا اٹھا۔ اسکیم بڑی لاجواب تھی۔ مذہبی طور پر یہ جرم قابل معافی ہو سکتا تھا۔ اس وقت ریڈروک کے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

بھی کبھار جیکب اس مکان میں آتا اور ریڈروک کے مقابل بیٹھ کر شراب پیتا تھا۔" کسی ایسے ہی موقع سے ریڈروک فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد ایک پراسرار تاریک رات میں جب جیکب آتا تو ریڈروک نے اپنی راہ کا یہ کانٹا ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ اس طریقے سے کہ جیکب خود ہی اپنی موت کا سامان اپنے لئے مہیا کر لے۔

☆.....☆.....☆

رات کے ایک بجے جیکب کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ریڈروک نے اس کی لاش اٹھائی اور بڑے آسان طریقے سے سمندر برد کر دی۔ جس وقت ریڈروک جیکب کی لاش کاندھے پر رکھ کے سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت ہر جانب پر ہول اور گھمبیر سناٹا طاری تھا۔ دور دور تک کسی انسان کی موجودگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ریڈروک اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ "اطراف میں کوئی بھی نہیں ہے۔ جو اس کے اس فعل کی نشان دہی کرے گا۔ جب دل مطمئن ہو تو تمام کام آسانی سے نمٹ جاتا ہے۔

ریڈروک نے جونہی جیکب کی لاش پانی میں پھینکی تو وہ آناً فاناً لہروں میں غائب ہو گئی۔ جیکب سفید لباس میں ملبوس تھا۔ ایک بار وہ تھوڑا سا بدن لباس دکھائی دیا۔ پھر ساحل کی طرف آنے والی لہروں نے واپس پلٹا کھایا تو جیکب کی لاش کو اپنے ہمراہ لے گئیں۔

ریڈروک ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ اگر کسی نے اسے یہ جرم کرتے دیکھا ہے تو وہ ضرور سامنے آ کے اسے ڈرانے دھمکانے اور حوالہ پولیس کرنے کی گیدڑ بھبکیاں ضرور دے گا۔

ریڈروک کے ذہن میں ایک خیال اور بھی تھا کہ اگر کسی ایک آدمی نے اسے لاش سمندر میں پھینکتے دیکھا ہے تو وہ فوری طور پر سامنے نہیں آئے گا۔ تاکہ اس سے کوئی نقصان نہ پہنچاؤں۔ اگر دو تین آدمی میرا یہ جرم دیکھ چکے ہیں تو وہ یا تو ابھی سامنے آ جائیں گے یا پھر بعد میں فون کال کے ذریعے مجھ سے رابطہ کر کے بلیک کر سکتے ہیں۔

ریڈروک ایک گھنٹے تک پتھر پر بیٹھا رہا۔ اس نے اس دوران چار پانچ سگریٹ پئے۔ کوئی بھی اس کے سامنے نہیں آیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

جیکب آنجہانی ہو چکا تھا۔ اب وہ مکان ریڈروک کا تھا۔ پھر وہ اس بات سے بھی مطمئن تھا کہ اس نے جیکب کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ بلکہ جیکب نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ ریڈروک کو ہلاک کر دے۔ پھر وہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔ اب ریڈروک کسی وقت بھی فادر سے مل کے اسے بتا سکتا تھا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ چمٹا سگریٹ جلا کے وہ کشتی لیتا ہوا مکان کی جانب چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

تین سال گزر گئے۔ جیکب کا مرڈر کیس پرانا ہو گیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ جیکب سمندری

ایک حکایت

ایک بزرگ اپنے گھر میں حقہ پی رہے تھے۔ چلم میں آگ نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے خادم سے کہا۔ "جا آگ لے کر آ۔" اس زمانے میں ماچس یا لائٹر وغیرہ تو ہوتا نہیں تھا۔ خادم واپس آ گیا۔ "نہیں سرکار! گھر میں آگ نہیں ہے۔"

"گھر میں نہیں ہے تو پڑوسی سے مانگ لے۔" خادم کچھ دیر میں پڑوسی کے یہاں سے بھی واپس آ گیا۔ "نہیں سرکار! پڑوس میں بھی آگ نہیں ہے۔"

"حد ہو گئی..... تو جا، محلے میں جا کر دیکھ لے۔" خادم محلے سے بھی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ "نہیں سرکار! محلے میں بھی آگ نہیں ہے۔"

اس بار بزرگ نے غصے میں حکم دیا۔ "جا، جا کر جہنم سے آگ لے آ۔"

خادم کچھ دیر بعد واپس آ کر کہنے لگا۔ "نہیں سرکار! جہنم میں بھی آگ نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے، آگ جہنم میں بھی نہیں ہے؟"

"ہاں سرکار!" جواب ملا۔ "آگ جہنم میں کہاں ہوتی ہے یہاں تو ہر شخص اپنے حصے کی آگ خود لے کر آتا ہے۔"

(الیس امتیاز احمد۔ کراچی)

مخلوق کی غذا بن گیا ہے۔ آخر کار ریڈروک نے ایک فیصلہ کرلیا کہ وہ چرچ کے فادر کے سامنے یہ مسئلہ رکھے گا۔ کیونکہ اس نے یہ مرڈر نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا ''عمر کے آخری حصے میں وہ اصل بات فادر کو بتا کے معاملے کی نزاکت کا اظہار کردے۔

اتوار کو وہ چرچ جا کے دعا میں شامل ہوتا تھا۔

منگل کی شب کو وہ فادر کے پاس پہنچ گیا۔ فادر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ ریڈروک نے فادر سے کہا۔ ''فادر میں ایک خاص بات دل میں لئے پھرتا ہوں۔ آپ یہ بات سن کے مجھے بتائیں کہ میں قاتل ہوں یا نہیں؟''

فادر نے چند کتابیں الماری میں رکھ کے کرسی سنبھال لی۔ جو سامنے رکھی تھی۔ پھر فادر نے ریڈروک سے کہا۔ تم آرام سے بیٹھو اور تفصیل سے تمام صورت حال سے مجھے آگاہ کرو۔''

ریڈروک نے کنکھار کر گلا صاف کیا اور فادر سے مخاطب ہوا۔ ''آج سے تین سال قبل ایک گہری شب کا ذکر ہے۔ میری مرحومہ بیوی کا بھائی جیکب میرے گھر آیا اور شراب نوشی کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم دونوں اکثر آمنے سامنے بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے۔ میں اپنے کمرہ خاص میں گیا اور ایک بوتل اٹھا لایا۔ بوتل میں نے میز پر رکھ دی اور دو شیشے کے گلاس لانے کے لئے دوبارہ اپنے کمرے میں گیا۔

اس رات میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ آج میں اپنے گلاس میں زہر ڈال کے مے نوشی کروں گا اور دنیا سے رخصت ہوجاؤں گا۔ پھر یہ مکان میرے سالے کا ہوجائے گا۔ میں نے الماری سے دو گلاس اٹھائے۔ انہیں صاف پانی سے دھویا، ایک گلاس میں سفید سفوف نما زہر ڈال دیا جام کا پیندا اچھا لیا تھا۔ زہر پانی کے قطروں میں بے رنگ ہوگیا۔

میں دونوں گلاس لے کر اس کمرے میں آ گیا۔ جس میں جیکب موجود تھا۔ میں نے ایک خالی گلاس اس کے سامنے رکھا اور دوسرا گلاس جس میں زہر تھا۔ اپنے سامنے رکھ لیا۔ جیکب نے بوتل کھول کے اپنا گلاس بھرا، پھر میرا گلاس بھی بڑھا کے بھر دیا۔ اسے بالکل محسوس نہیں ہوا کہ میرے گلاس کے پیندے میں زہریلا سفوف موجود ہے۔ اب ہمارے سامنے وہ گلاس پڑے تھے۔ شراب سے لبالب بھرے گلاس میرا گلاس زہریلا تھا۔

جیکب کی نیت میں بے ایمانی تھی۔ مجھے ہرگز علم نہ تھا کہ وہ میری زندگی کا خاتمہ کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ اس کا پلان کچھ اور تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے کہا۔ ''برادر سگریٹ نہیں ہے۔ شراب کے ساتھ اسموکنگ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر سگریٹ تمہارے پاس ہیں تو لے آؤ۔''

میرے کمرۂ خاص میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر موجود تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سگریٹ کا پیکٹ میرے کمرے میں ہے۔ لے آتا ہوں۔'' میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دروازے کے قریب والی کھڑکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کی درز سے میں نے اس کمرے میں دیکھنا شروع کردیا۔ جس میں جیکب موجود تھا۔ میری عدم موجودگی میں جیکب کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے۔ کہنے کو تو وہ مجھے برادر کہتا تھا لیکن اس کی نیت میں فتور تھا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ اس کا ڈھکن ہٹا کے اپنے پیگ میں کوئی زہریلا سفوف ڈالا اور پھر ڈبیہ کا ڈھکن بند کر کے اسے جیب میں رکھ لیا۔

پیگ کو ہلا کے اس نے زہر شراب میں ملا دیا۔ پھر اس نے میرا پیگ اٹھا کے اپنے سامنے رکھا اور اپنا زہریلا پیگ میرے پیگ کی جگہ رکھ دیا۔ اس نے یہ کام چند لمحے میں کرلیا تھا۔ اب اس کی دانست میں اس کا کام مکمل ہوچکا تھا۔ اس نے میرے لئے گڑھا کھود لیا تھا۔ جس میں وہ خود گرنے والا تھا۔

فادر اب یہ بتائیں کہ اس کام میں جیکب کی نیت کھل کر میرے سامنے آگئی تھی تو میں کیوں کر اس کا لحاظ کرتا۔ اس طرح تو خود میری شخصیت مشکوک ہوجاتی۔

میرا زہر بھرا پیگ اب اس کے سامنے رکھا تھا جو اس نے خود اپنے لئے تجویز کیا تھا۔ بدلے میں اس نے اپنا زہریلا پیگ میرے پیگ کی جگہ رکھ دیا تھا۔

میں نے خود اس دنیا سے جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ جیکب مجھے مارنا چاہتا ہے تو میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اب میرے دل میں الٹا انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے خاموش رہنے کا تہیہ کرلیا۔ جیکب نے خود اپنے راستے کا تعین کرلیا تھا۔ پھر میں اسے کیوں روکتا۔ وہ میرا سچا دشمن تھا۔

تقدیر کے کاموں میں مخل ہونا ویسے بھی گناہ ہے۔ جب کاتب تقدیر نے اس کی موت کا فیصلہ لکھ دیا تھا تو میں اسے یعنی جیکب کو کیوں اس کام سے روکتا۔'' میں نے اسے مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مجھے مارنے آیا تھا۔ ایسے میں تو بھی ہوسکتا تھا کہ میں خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھوں۔ خود سے کچھ نہ کروں۔

میں نے سگریٹ کیس اور لائیٹر اٹھایا اور واپس اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں جیکب موجود تھا۔ میں نے لائیٹر اور سگریٹ میز پر رکھے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیکب چہرے مہرے سے کافی مسرور نظر آرہا تھا۔ اس نے پیگ اٹھایا اور میری جانب کیا۔ میں نے اپنا پیگ اٹھا کے اس کے پیگ سے مس کیا۔ اور پھر وہ فوراً ہی آدھا پیگ چڑھا گیا۔

پھر اس نے ایک سگریٹ جلائی۔ دو چار کش لے کر اس نے پیگ خالی کرکے دوبارہ بھر لیا۔ میں نے اپنا پیگ رکھ دیا تھا۔

وہ زہر جو جیکب نے حلق سے نیچے اتار لیا تھا اس زہر نے تین منٹ بعد اثر دکھانا تھا۔ میں نے تین منٹ تک اسے باتوں میں لگائے رکھنا تھا کہ میں وہ پیگ پینے سے فی الوقت بچا رہوں۔ جیکب زہر مہلک میں اتار چکا تھا۔ جبکہ میرا زہریلا پیگ ابھی تک اپنی جگہ رکھا تھا۔

جیکب بار بار میرے پیگ کی جانب تک رہا تھا۔ وہ اس سوچ میں مبتلا تھا کہ آخر میں شراب سے اجتناب کیوں کر رہا ہوں۔ وہ تین منٹ تک مزید دو پیگ چڑھا گیا۔

واش بیسن دور تھا۔ ورنہ میں اپنا پیگ اس میں انڈیل دیتا اور پھر تین منٹ بعد جیکب کے معدے میں درد کا ایک طوفان سا اٹھا۔ وہ بے چین ہوا تھا۔ اس نے اچانک اپنا پیٹ تھام لیا اور کھڑا ہو کے درد سے دہرا ہوگیا۔ پھر اس نے تکلیف سے چلانا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیبل کو ایک جانب سے پکڑ کے اوپر اٹھایا اور اسے الٹانے کی کوشش کی۔ اس کی اس حرکت سے میرا پیگ نیچے گر گیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں زہریلی شراب پینے سے بچ گیا تھا۔

جیکب نیچے گر گیا۔ اس کی زبان سے مغلظات ابل پڑیں۔ جو میرے لئے تھیں۔ دس منٹ میں جیکب ایڑیاں رگڑ رگڑ کے بے حس ہوگیا۔ وہ مر چکا تھا۔

میں نے اسی رات اس کی لاش سمندر برد کردی۔

فادر اب بتائیں کہ میں تو بے قصور ہوا ناں۔ کیونکہ جیکب نے میرا جام بدل کے اپنی موت کا خود سامان پیدا کیا تھا۔'' ریڈروک نے سلسلہ کلام ختم کرتے ہوئے کہا۔

فادر ریڈروک کی گفتگو کے دوران اپنی جگہ سے کھڑا ہوچکا تھا۔ جب اس نے یہ سارا واقعہ سنا تو دھم سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس قتل کا ذمہ دار ریڈروک کو ٹھہرائے یا جیکب کو، فادر ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے ریڈروک سے کہا۔ ''اس کیس کی نوعیت عجیب ہے۔ ویسے جیکب اپنی موت کا خود ذمہ دار ہے۔ گاڈ فادر اور یسوع مسیح تمہاری حالت پر رحم فرمائیں۔ بہرکیف اگر تم اپنا مکان اپنی موت کے بعد چرچ کے نام کردو تو شاید تمہارا چھٹکارا ہوجائے۔ ویسے بھی تمہاری موت کے بعد یہ مکان کسی کی وراثت میں نہیں جاسکتا۔'' ریڈروک نے فادر سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی وصیت میں یہ مکان چرچ کے نام کردے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ فادر کے کمرے سے نکل گیا۔ اب وہ دلی طور پر مطمئن تھا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:109

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

شہزادی سسی نے جب خواب میں دیکھا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ وادی سکران کا شہزادہ تھا۔ اور جب سسی کو پتہ چل گیا کہ وہ سکران کا شہزادہ ہے تو سسی بے قراری سے اس کا انتظار کرنے لگی، ایک مرتبہ سسی نے سکران کے ایک تجارتی قافلے کو اپنے علاقے میں زبردستی روک لیا اور شرط لگائی کہ جب تک تمہارا خیر خواہ سکران کا شہزادہ نہیں آئے گا اس وقت تک میں تم لوگوں کو آزاد نہیں کرسکتی۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق قافلے کا سردار سکران گیا اور عاجزی کرکے شہزادہ پنوں کو بمعہ صبور میں لے آیا۔ پنوں کو دیکھ کر سسی نہال ہوگئی اس کے دل کی مراد پوری ہوگئی۔ وہ شہزادہ پنوں پر نچھاور ہونے لگی اور شہزادہ نے جب سسی کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنا دل ہار بیٹھا۔ اور پھر اس نے اپنے والد بادشاہ وقت سلطان علی خان کے جلد بلانے پر بھی وہ سکران نہیں گیا تو اس کے والد بن فکرمند ہوگئے اور ان کا دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ خیر سلطان نے تجارتی قافلے کے سرداروں سے مشورہ کیا، جو شہزادہ کو بمعہ صبور لے گئے تھے۔ سرداروں نے سلطان کو یقین دلایا کہ ہم کسی صورت بھی پنوں کو بمعہ صبور سے واپس ضرور لائیں گے۔ وہ دونوں بمعہ صبور واپس آگئے اور ایک رات خواہش ظاہر کی کہ شہزادی سسی اور پنوں ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھائیں تو دونوں نے ان کی بات مان لی۔ ان دونوں نے کھانے میں خواب آور خوف ملا دیا اور اس طرح کھانا کھاتے ہی سسی اور پنوں گہری نیند میں چلے گئے تو ان دونوں نے پنوں کو اغوا اور رات کے اندھیرے میں اونٹ کے محمل پر بے ہوش پنوں کو سوار کرکے لے چلے۔ پھر جب پنوں کی آنکھ کھلی تو وہ سسی کے غم میں جیسے پاگل ہوگیا اور اونٹ سے اتر کر یہاں ہاں صحرا میں بمعہ صبور کی طرف دوڑنے لگا اور ادھر یہی حال سسی کا تھا، وہ بھی پنوں کی یاد میں عالی شان محل سے نکل کر صحرا میں دوڑنے لگی۔ تپتا صحرا جان لیوا سورج کی تپش اور موت سے ہمکنار کرتی جھلسا دینے والی ہواؤں نے دونوں کو حال سے بے حال کردیا اور دونوں بے آب و گیارہ وسیع صحرا میں ایک جگہ دیوت تلے دب کر اپنی جان ہار بیٹھے۔ حکیم وقار اپنے مطب کے عملہ سمیت پکنک یا سیر و تفریح کے لئے دلی سے تھوڑی دور شانتی پور آگئے۔ رولوکا بھی حکیم وقار کے ساتھ تھا۔ شانتی پور بہت ہی سرسبز و شاداب تھا مگر حالات کی ستم ظریفی نے شانتی پور کو ویران کردیا تھا۔ اس جگہ موجود حویلی خاص طور پر وہاں جانے والے لوگوں کے لئے مرکز خیال ہوتی تھی، ہر فرد اس حویلی کی بناوٹ اور نقش و نگار میں کھو جاتا تھا لیکن رات کا اندھیرا پھیلتے ہی حویلی ڈراؤنی شکل اختیار کرلیتی تھی ہر طرف خوف کا بسیرا ہوجاتا، لیکن کسی فرد کو بھی کوئی نقصان نہ ہوتا، حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک مندر تھا۔ رولوکا رات کے وقت اپنی نظریں مندر پر ٹکائے بیٹھا تھا کہ ویران مندر میں گہری دودھیا روشنی پھیل گئی جسے دیکھ کر رولوکا چونک گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

اور پھر رولوکا کے ذہن میں سوچوں کا طوفان سر ابھارنے لگا کہ سینکڑوں سال سے ویران اور بنجر مندر میں رات کے اس پہر روشنی کیسے ہوئی، یا پھر کوئی مندر میں آیا تو نہیں جس نے روشنی کردی ہو؟ مگر پھر فوراً ہی یہ خیال رد ہوگیا۔

رولوکا کے دماغ میں آیا کہ یہ کوئی بہت اہم راز لگتا ہے، اس علاقے میں ویسے بھی آبادی نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر گاؤں ہیں بھی تو یہاں سے کوسوں دور، رات کے بارہ بجے کوئی اس طرح مندر میں نہیں آسکتا۔

رولوکا پھر چونکا کیونکہ روشنی مزید بڑھ گئی تھی اور اب تو مندر میں چہل پہل بھی نظر آنے لگی تھی۔ اب تو رولوکا کے دل میں آیا کہ ”مندر میں جاکر ضرور دیکھنا چاہئے کہ اصل کہانی کیا ہے؟ اور یہ کون لوگ ہیں جو کہ رات کے اس پہر مندر میں آئے ہیں اور کیوں آئے

ہیں؟"

رولو کا نے ارادہ کیا مگر پھر نہ جانے کیوں اچانک اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور سوچنے لگا۔ "صبح کے وقت حویلی کے ملازم رامو یا شامو سے اصل حقیقت معلوم کروں گا۔" حویلی میں جو دونوں ملازم تھے وہ صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال پر مامور تھے ان میں ایک کا نام رام دیال اور دوسرے کا نام شام پرشاد تھا اور ان دونوں کو لوگ رامو اور شامو کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بجلی تو تھی نہیں اور نہ ہی لوگ اس قدر گرمی محسوس کرتے تھے، بس یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ لوگوں نے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال رکھا تھا۔ ان دنوں میں گھر بھی اس طرح بنائے جاتے تھے کہ جس میں ہوا کا گزر رہے، گھر کچھ زیادہ ہی کھلے ہوتے تھے اور صحن تو اتنا بڑا ہوتا تھا کہ گھر کے مرد عورتیں بچے سوتے تھے، مرد حضرات رات میں گھر سے باہر اپنی نیند پوری کرتے تھے۔

وہ حویلی بھی کچھ اس طرز کی بنی ہوئی تھی کہ کسی بھی کمرے میں گرمی کا نام و نشان نہ تھا، ہر کمرے میں فراٹے کی ہوا آتی تھی۔

حکیم وقار اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور مطب کے دیگر ملازم الگ کمروں میں محوِ خواب تھے۔ حکیم وقار اپنے ملازمین کے ساتھ تین روز کے لئے سیر و تفریح یا پکنک منانے آئے تھے۔ حکیم وقار اپنے ملازمین کے ساتھ ہر سال یا پھر دوسرے سال ضرور کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے یا پکنک منانے آیا کرتے تھے۔ ہر سال جگہیں الگ الگ منتخب کرتے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے اور تمام لوگوں نے ٹل کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

اس جگہ کا نام شانتی پور تھا۔ ویسے تو زیادہ تر علاقہ ویران تھا۔ مگر کہیں کہیں ایسی ہریالی نظر آتی تھی جو کہ سیاحوں کا دل موہ لیتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ حویلی کی تعمیر اور حویلی میں جو نقش و نگار بنائے گئے تھے وہ خاص طور پر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔

اس علاقے میں سیر و تفریح کے لئے آنے والے یہ سوچنے سے قاصر تھے کہ اس قدر خوب صورت اور دیدہ زیب دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والا علاقہ آخر ویران ہوا تو کیوں ہوا، اور ایسا ہونے میں اصل وجہ کیا ہے، اس علاقے سے لوگ نقل مکانی کیوں کر گئے اور اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں نہ کہیں جا بسے۔

پھر رولو کا نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور سوچا۔ "خواہ مخواہ میں بھی کن چکروں میں پڑ گیا۔ یعنی شہر کے اندیشے میں قاضی دبلا، صبح ہونے پر رامو سے معلوم کروں گا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ رات کے پہر کچھ لوگ مندر میں پوجا پاٹ کے لئے آتے ہوں، اور اگر ایسا ہے تو وہ لوگ دن کی روشنی میں کیوں نہیں آتے؟" اور پھر رولو کا اپنی جگہ سے اٹھا اور حویلی کی چھت پر چلا گیا۔

حویلی کی چھت پر کئی چارپائیاں پڑی تھیں کیونکہ حویلی میں ٹھہرنے والے اگر گرمی محسوس کرتے تو چھت پر آ کر آرام کر لیتے تھے۔

ایک چارپائی پر رولو کا بیٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ رولو کا اس طرح کوئی آدھا گھنٹہ تک لیٹا رہا، نیند کی وجہ سے اس کے پپوٹے بھاری ہو چکے تھے کہ پھر اچانک بہت ہی دل آویز بھینی بھینی خوشبو قریب سے ہی آتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے علاوہ بھی چھت پر کوئی موجود ہے، بلکہ کئی افراد موجود ہیں۔ پھر اس کی سماعت سے سرگوشیاں ٹکرانے لگیں۔

اب تو رولو کا سے رہا نہ گیا اور اس نے بغیر کوئی آہٹ اور حرکت کئے اپنے پپوٹوں کو وا کر دیا اور جو منظر اس کے سامنے تھا اسے دیکھ کر حیران ہی نہیں بلکہ ایک اچنبھے میں پڑ گیا۔

پوری چھت پر ہلکی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی، روشنی اتنی تھی کہ ہر چیز بہت ہی صاف اور واضح طور پر نظر آتی تھی۔

رولو کا نے دیکھا کہ اس کی چارپائی سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بہت ہی سجا سجایا مرصع تخت موجود ہے

اور اس پر زیورات سے لدی ایک بہت ہی حسین بلکہ اتنی حسین کہ شاید رولو کا نے اس سے پہلے اس جیسا حسن نہ دیکھا تھا۔

اس عورت کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی، اس کے ارد گرد کئی دیگر عورتیں باادب کھڑی تھیں ایسا لگتا تھا کہ تخت پر کوئی ملکہ یا شہزادی براجمان ہے اور اس کے قریب اس کی خدمت گار ہیں۔

اتنے میں ایک آواز سنائی دی۔ "دیوی جی! آپ نے شمشتی شالی منش کو دیکھ لیا۔ یہ آپ کی بہت بڑی اچھا تھی..... اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

یہ سن کر اس اپسرا کے لب ہلے تو ایسا لگا کہ اس جگہ ترنم سے بکھر گئے ہوں۔ "ہاں میں نے اس کا درشن کر لیا، بھگوان کی کرپا سے یہ بالک اس جگہ آ گیا اور اب یہ بالک اس علاقے سے سارے پاپوں کو شتم کر دے گا، بھگوان نے اسے اوتار بنا کر بھیجا ہے۔

الیشور کے نزدیک وہ منش زیادہ پسندیدہ ہے جس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، الیشور نے منش کو سنسار میں پیار و محبت کے لئے پیدا کیا ہے، ناں کہ خون خرابے کے لئے، یہ علاقہ کس قدر رکھ شانتی والا تھا مگر ایک دشٹ نے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے الیشور کی دھرتی پر پاپوں کا جال بچھا دیا، لوگوں کو کشٹ کرتا رہا، بلکہ الیشور کے احکام کو بھی بھول گیا۔ اپنی خواہش کے لئے دیوتا کا نام بدنام کیا، لوگوں کو دھوکہ دیا، لوگوں سے چھل کیا اور پھر آہستہ آہستہ یہ سارا علاقہ ویران ہوتا چلا گیا..... سرسبز و شاداب ہرا بھرا علاقہ بنجر ہو گیا..... لوگوں کی شانتی چھن گئی، لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے..... خراب یہ علاقہ بہت جلد اپنی اصلی حالت میں آ جائے گا۔

میں نے اس بالک کو دیکھ لیا تو مجھے چین آ گیا..... میں الیشور سے پرارتھنا کروں گی کہ الیشور اس بالک کو اور بھی زیادہ شکتی شالی بنا دے تاکہ یہ مجبور، بے کس اور پریشان حال لوگوں کے دکھ درد میں کام آئے، اور ظالموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دے.....

داسیوں اب تخت کو اوپر اٹھاؤ..... اب چلنے کا سمے ہو گیا ہے۔" اور پھر اس آواز کے ساتھ ہی تخت خود بخود ہوا میں معلق ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کافی اوپر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رولو کا فوراً اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس تخت اور اس پر براجمان اپسرا کے متعلق سوچنے لگا اور پھر اس کی تمام باتوں پر غور کرنے لگا۔

کافی دیر کے بعد رولو کا اس نتیجے پر پہنچا کہ "اس طلسماتی حسینہ کی باتوں کے مطابق اس پورے علاقے پر یقیناً ظلم ہوا ہے اور سینکڑوں سال پہلے یہ کنواں کا خون بہایا گیا ہوگا..... یہی وجہ ہے کہ لوگ اس علاقے سے نقل مکانی کر گئے..... اور یہی نہیں بلکہ اس خوب صورت حویلی کے مکین بھی مر کھپ گئے۔ میں صبح کے وقت اس حویلی اور اس علاقے کے متعلق رامو یا شامو سے ضروری بات کروں گا۔" اور پھر رولو کا اپنی چارپائی پر لیٹ گیا.....

خیر صبح کا اجالا ہر سو مسلط ہو گیا، حکیم وقار سمیت سارے لوگ اٹھ گئے اور پھر ناشتے کا دور چلا، ناشتے سے فارغ ہو کر سارے ملازمین گھومنے پھرنے کے لئے نکل پڑے۔

رولو کا اور حکیم وقار کمرے میں بیٹھے تھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے کہ رامو آ گیا..... آتے ہی رامو بولا۔ "پرنام صاحب جی۔"

رامو کی بات سن کر حکیم وقار مسکرائے اور بولے۔

"رامو ٹھیک تو ہو..... طبیعت تو ٹھیک ہے نا..... اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

رامو بولا۔ "صاحب جی بہت بہت دھنے واد..... صاحب جی..... میں بھگوان کی کرپا سے ٹھیک ہوں..... اور پرارتھنا کرتا ہوں کہ بھگوان سب کو سکھ شانتی سے رکھے۔"

پھر رولو کا بولا۔ "رامو کاکا..... آپ مونڈھے پر بیٹھو..... مجھے آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔"

یہ سن کر رامو..... نیچے فرش پر بیٹھنے لگا تو..... رولو کا پھر بولا۔ "رامو کاکا آپ مونڈھے پر بیٹھیں..... سنسار

میں سارے لوگ برابر ہیں..... بس صرف انسان کے عمل سے چھوٹائی بڑائی ہے۔ اور میری نظر میں اچھا وہ ہے جو کہ نیک ہے اور اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔"

خیر یہ سن کر رامو نے مونڈھا کھینچا اور سامنے بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ "جی صاحب! آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں..... پوچھیں۔"

رولو کا نے بغور رامو کو دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "رامو کاکا..... میں نے اس علاقے اور حویلی کو دیکھ کر اندازہ لگایا ہے کہ اپنے وقت میں یہ سارا علاقہ بہت ہی سرسبز اور شاداب ہوگا، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہوگی، یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے والے ہوں گے۔

پھر یہ جو اتنی خوب صورت حویلی ہے اس حویلی کے مکین بہت ہی شوقین اور خوش مزاج ہوں گے کیونکہ ایک شوقین آدمی ہی اتنی خوب صورت چیز بنا سکتا ہے، شوقین کے ساتھ ساتھ وہ بہت زیادہ ہمدرد بھی ہوں گے جو کہ لوگوں کا خیال رکھتے ہوں گے.....

مگر ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ اس علاقے میں پھر یہ جان لیوا ویرانی کیوں آئی ہے۔ سارا علاقہ بے آب و گیاہ ہوگیا..... لوگ مرکھپ گئے..... جو بچے انہوں نے دلبرداشتہ بلکہ خوف کی وجہ سے علاقہ ہی چھوڑ دیا..... حویلی ویران ہوگئی..... یقیناً حویلی پر بھی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہوگا..... حویلی والے بھی اپنے خوفناک انجام کو پہنچ گئے ہوں گے۔

رامو کاکا اگر آپ کو اس بارے میں کچھ پتہ ہو تو برائے مہربانی بتائیں کہ ایسا کیا ہوا تھا؟"

رولو کا کی بات سن کر رامو نے ایک لمبا سانس کھینچا..... اور بولا۔ "جی صاحب جی۔"

اتنے میں حکیم وقار رولو کا سے بولے۔ "حکیم صاحب! یہ آپ نے کیسے اندازہ لگالیا کہ یہاں پر لوگوں کے ساتھ ظلم ہوا ہوگا.....؟"

حکیم وقار کی بات سن کر رولو کا بولا۔ "حکیم صاحب میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یقیناً یہاں پر ناقابل برداشت ظلم ہوا ہوگا اور جو کچھ بھی ہوا ہوگا وہ صرف اور صرف اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آہستہ آہستہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔"

اتنے میں رامو بولا۔ "صاحب جی..... آپ کا اندازہ ٹھیک ہے..... شروع سے تو مجھے معلوم نہیں بلکہ میں نے اپنے بڑے اور میرے پتا نے اپنے بڑے اور اسی طرح تمام باتیں پرکھوں سے چلی آرہی ہیں.....

صاحب جی..... میرا اور شاموکا کھرانہ جنم جنم سے اس حویلی کے مکینوں کی خدمت گار رہے ہیں..... اور آج بھی ہم خدمت کررہے ہیں..... تھوڑا بہت جو انکم ہوجاتا ہے اس سے اپنا گزر بسر کرتے ہیں..... اس حویلی کے اصل مالکوں کے کئی رشتے دار ہیں جو کہ کبھی کبھار آتے ہیں اور حالات کے متعلق معلوم کرتے ہیں اور اگر زیادہ انکم ہو تو اس میں سے ہمیں خرچ کے لئے دیتے ہیں اور اگر کم انکم ہو تو وہ اپنے پاس سے ہمارے لئے رقم دے جاتے ہیں۔

صاحب جی! یہ تو سب کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ علاقہ کسی وقت میں بہت ہی خوب صورت ہوگا اور رہتا کچھ ہونے کے بعد بھی یہ علاقہ اور یہ حویلی دیکھنے کے قابل ہے۔

صاحب جی..... جہاں تک مجھے معلوم ہے..... قریب جو مندر ہے وہ ناگ مندر ہے..... اس پورے علاقے میں ایک ہی مندر ہے۔

اس علاقے میں لوگ اپنی خوشی سے اپنا وقت گزارتے تھے، ہر آدمی کے من میں خوشی کے لڈو پھوٹتے تھے۔ سارے لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے..... اس علاقے کو دیکھ کر دوسرے علاقے اور گاؤں والے دانتوں تلے انگلیاں داب لیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پورے علاقے پر ایشور نے خاص کرم کر رکھا ہے اور یہ ایشور کی خاص کرپا ہے کہ یہ علاقہ اس قدر دل موہ لینے والا ہے۔

اس حویلی کے مالک ٹھاکر بلرام سنگھ بہت ہی دیالو، رحم دل، غریب پرور، دوسروں کا درد محسوس کرنے اور بھگوان سمان تھے۔ چھوٹے بڑے سب کے ساتھ ہنس بول کر وقت گزارتے تھے، ذرا بھی کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو ان کا من بیاکل ہوجاتا اور پھر اسے پاس بلا کر اس کی تکلیف معلوم کرتے اور یہی نہیں بلکہ اس کی مدد بھی کرتے تھے۔ وقت اسی طرح ہنس کھیل کر سکھ شانتی سے گزر رہا تھا۔

مندر کے بڑے پجاری جی کا دیہانت ہوگیا..... بڑے پجاری جی بھی بھگوان سمان تھے..... بڑے پجاری جی کے بعد ان کا بڑا بیٹا مندر کا پجاری بنا..... وہ بھی اچھے دل کا مالک تھا..... لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے والا، خیر بانٹی خوشی وقت گزارتا رہا کہ پھر نہ جانے ایک سال بعد اس گاؤں پر کس کی نظر لگ گئی۔

وہ پونم کی رات تھی، پورے علاقے کو چاندنی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، ہر من میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، خوشی کے مارے لوگ پھولے نہیں سمارہے تھے۔ کافی رات گئے تک سارے لوگ ہنستے کھیلتے رہے۔

پھر رات کے آخری پہر تھک ہار کر سارے لوگ نیند تلے چلے گئے.....

رات کٹی اور پھر صبح کا سورج طلوع ہوا..... لوگ پوجا پاٹ کے لئے مندر گئے کہ اتنے میں ایک آدمی جس کا نام شنکر تھا..... ہانپتا ہوا آیا اور ٹھاکر صاحب کے پاس بیٹھ کر بولا۔ "ٹھاکر جی! میری پتنی چندن نہ جانے کہاں غائب ہے..... میں نے ایک ایک گھر دیکھ لیا..... مگر چندن کا کوئی پتہ نہیں۔"

شنکر کی بات سن کر ٹھاکر صاحب بولے۔ "شنکر گھبراؤ نہیں..... پوجا سے فارغ ہو کر سب مل کر چندن کو تلاش کریں گے۔"

خیر جی پوجا کے بعد سارے گاؤں والے مل کر چندن کو تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ تلاش کرتے کرتے مندر کے پیچھے اس کنوئیں کے پاس پہنچے جو کہ برسوں سے بند پڑا تھا، اس کنوئیں میں چندن کی لاش پڑی تھی..... لوگوں نے اسے کنوئیں سے نکالا تو لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ چندن کا حال دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ خون کی ایک بوند بھی اس جگہ تو کیا اس کے کپڑوں پر بھی موجود نہیں تھی۔

بس جی کیا بتائیں! جوان چھوکری تھی، اس کے ساتھ کسی نے انیائے بھی کیا تھا۔

صاحب جی! چندن کو دیکھ کر ہر آنکھ میں آنسو تھے..... ہر آدمی کا کلیجہ پھٹ گیا تھا..... اس کے گھر والے تو غم سے پچھاڑ کھا رہے تھے۔ اس کی ماں تو اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔

خیر روتے دھوتے گاؤں والوں نے اسے چتا پر لٹا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چندن جل کر راکھ ہوگئی۔

پورے علاقے پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے پجاری جی کو بلایا اور بولے۔ "پنڈت جی..... ہمارے گاؤں میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے..... اگر مجھے پتہ چل جائے کہ یہ کس ظالم نے کیا ہے تو میں ظالم کو زندہ آگ میں جلادوں گا..... آپ سے میری بنتی ہے کہ آپ اپنے علم اور منتروں سے معلوم کریں کہ ایسا کس پاپی نے کیا ہے، اور یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔"

ٹھاکر صاحب کی بات سن کر پجاری جی بولے۔ "ٹھاکر صاحب آپ فکر نہ کریں، میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ یہ بہت انیائے ہوا ہے..... میں ضرور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو بتادوں گا۔"

اور یہ بول کر پنڈت جی اٹھے اور ٹھاکر صاحب کو پرنام کرتے ہوئے مندر میں چلے گئے۔

گاؤں کا ہر آدمی چوکنا ہوگیا تھا۔ کوئی شک کرتا تو کس پر کیونکہ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ گاؤں میں لڑکے لڑکیاں جوان ضرور ہوتے تھے مگر مجال ہے کہ کوئی جوان کسی لڑکی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ بہرحال ہر آدمی ایک دوسرے پر نظر رکھنے لگا مگر

لاکھ سوچ بچار اور کوشش کے وہ پاپی سامنے نہ آیا جس نے کہ چندن کا گلا کاٹا تھا اور اس کے ساتھ انیائے کیا تھا۔

اماوس کی راتیں آئیں اور گزر گئیں اس کے بعد پھر نیا چاند ہوا..... اور پھر پونم کی رات آ گئی..... پونم کی رات کیا ہوتی ہے کہ دل میں خود بخود خوشی کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ لوگ خوشی سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

پونم کی رات گزر گئی..... اور پھر صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

گاؤں کی ایک اور جوان لڑکی اپنے گھر سے غائب تھی، پورا گاؤں سوگ میں ڈوب گیا..... جب تلاش کیا گیا تو وہ لڑکی بھی چندن کی طرح اس کنوئیں میں پڑی ملی۔ اس کا گلا بھی کٹا ہوا تھا اور اس کے ساتھ بھی انیائے کیا گیا تھا۔

ہر آدمی حیران و پریشان تھا، ہر کسی کی نیند ختم ہو کر رہ گئی تھی..... پورا گاؤں رو رہا..... مگر اس کے باوجود بھی کوئی سامنے نہیں آیا۔

اب تو ہر کسی کے دل میں ڈر بیٹھ گیا..... جتنے بھی ایسے گھرانے تھے جہاں جوان لڑکیاں تھیں اس گھر کی تو نیندیں بھی اچاٹ ہو کر رہ گئی تھیں.....

اس کے بعد پھر پونم کی رات آنے والی تھی۔ ٹھاکر صاحب نے پورے گاؤں میں جوان لڑکوں کو پہرے پر لگا دیا..... روزانہ رات میں لڑکے کے پہرہ دینے لگے..... اور خاص طور پر ٹھاکر صاحب نے چار جوان اس کنوئیں کے پاس کھڑے کر دیئے۔

پونم کی رات آئی..... سارے لوگ بے فکر ہو کر سو گئے کہ آج تو پورے گاؤں میں سخت پہرہ تھا..... خیر رات گزر گئی اور پھر صبح ہوتے ہی ہر آنکھ اشکبار تھی..... ایک اور لڑکی غائب تھی۔ سب نے تلاش کیا تو وہ لڑکی اس کنوئیں سے کافی دور اسی حالت میں ملی۔

کوئی ایسا نہ تھا جو کہہ حیران نہ تھا کہ اتنے سخت پہرہ کے ہوتے ہوئے وہ لڑکی گھر سے کیسے نکلی اور پھر اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ کیسے ہوا۔

جب کاٹنے والے نے اس کا گلا کاٹا پھر اس کے ساتھ جو ظلم کیا تو اس لڑکی کی چیخ کیوں نہ نکلی اور ایسا کرنے والا تو اکیلا ہی ہوگا۔

پورے گاؤں میں اگر کوئی زیادہ پریشان تھا تو وہ ٹھاکر صاحب تھے۔ ان کی تو رات کی نیند اور دن کا آرام و چین ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹھاکر صاحب ہر وقت چپ چپ رہنے لگے تھے۔ بلکہ وہ تو مندر بھی نہیں جاتے تھے۔ انہوں نے پنڈت جی سے کہہ دیا تھا کہ ”پنڈت جی میرا من بہت بیاکل ہو گیا ہے..... گاؤں میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی وجہ سے میرا من کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا ہے۔ بس میں صرف اور صرف اس فکر میں ہوں کہ وہ پاپی جلد از جلد میرے سامنے آ جائے تو میں اسے زندہ آگ میں ڈال دوں۔ پنڈت جی آپ میری فکر نہ کیا کریں..... آپ اپنے وقت پر پوجا پاٹ شروع کر دیا کریں۔“

ٹھاکر صاحب کی بات سن کر پنڈت جی بولے۔ ”ٹھاکر صاحب میں کئی جاپ کر چکا ہوں۔ کئی منتر منتر آزما چکا ہوں۔ مگر ابھی تک وہ پاپی مجھے نظر نہیں آیا..... ایسا لگتا ہے کہ کوئی بہت ہی شکتی شالی بھگتی ہوئی خونی آتما ہے جو کہ ایسا کر رہی ہے۔

آپ فکر نہ کریں میں ابھی بھی امید کر رہا ہوں کہ میں بہت جلد اس پاپی انسان یا پھر اس خونی آتما کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“ اور یہ بول کر پنڈت جی چلے گئے۔

اس کے بعد پھر اماوس کی رات آئی..... پورے گاؤں پر گھٹا ٹوپ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والا اندھیرا مسلط تھا۔ پورے گاؤں پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ خیر صبح کا سورج طلوع ہوا۔

اچانک پورے گاؤں میں پھر کہرام مچ گیا..... کیونکہ گاؤں کا ایک بہت ہی کبرو جوان غائب تھا..... لوگوں نے تلاش کیا تو وہ جوان اس کنوئیں میں موجود تھا..... اس کا گلا بھی کٹا ہوا تھا پورے جسم اور کپڑوں پر ایک بوند بھی خون موجود نہیں تھا۔

پورا گاؤں سہم گیا تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، لوگ اتنے غمزدہ تھے کہ ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر سکتے تھے۔ جس گھر کا جوان بچہ ہلاک کیا گیا تھا وہی گھر نہیں بلکہ ہر گھر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، ایسا لگتا تھا کہ ہر گھر کا ایک فرد ختم ہو گیا ہے۔

سارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، سب کے سب ایک دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی اور ایک دوسرے کے غم کو اپنا غم مانتے تھے۔

اس مرتبہ ٹھاکر صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے تھے، ٹھاکر صاحب بہت مضبوط دل کے مالک تھے، مگر وہ غم ہی ایسا تھا کہ ان سے ضبط نہ ہو سکا۔

صاحب جی! یہ بات تو حقیقت ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا، یہی دنیا کی ریت اور اٹوٹ نظام ہے کہ کچھ دنوں رو دھو کر لوگ اپنے سینہ پر پتھر رکھ لیتے ہیں، اور پھر دنیا داری میں لگ جاتے ہیں اور پھر ایسا ہی ہوا، چند دن بعد لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے، نہ چاہتے ہوئے بھی زندہ رہنے کے لئے تھوڑا بہت کھانے پینے لگے تاکہ زندہ رہیں۔

یہ غم ابھی دو دن نہ ہوا تھا کہ پھر پونم کی رات آ گئی، اب تو جیسے لوگوں کو پونم کی رات سے ایک طرح کی چڑ ہو کر رہ گئی تھی، جسے دیکھو وہ گھبرانے لگا تھا، ہر کوئی حیران و پریشان اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا تھا، اس ڈر سے کہ کہیں اس رات میں بھی گاؤں کی کوئی جوان پتری غائب نہ ہو جائے اور اس کے ساتھ بھی نا قابل یقین اور نا قابل برداشت خونی واقعہ رونما ہو جائے۔

گاؤں میں بہت سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ اس رات تو خاص طور پر ٹھاکر صاحب بھی ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے گھوڑے پر ادھر ادھر چکر لگاتے رہے۔

مگر پھر وہی ہوا جو ہونا تھا..... کسی کو رات میں کانوں کان خبر نہ ہوئی اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو گاؤں کی ایک خوب صورت جوان پتری غائب تھی۔

اس مرتبہ وہ پتری بہت دور نہیں بلکہ مندر کے پچھواڑے درختوں کے جھنڈ میں حال سے بے حال مری پڑی تھی۔ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا تھا جیسا کہ اس سے پہلے لڑکیوں کے ساتھ ہوتا آیا تھا۔

اس لڑکی کا کریا کرم کرنے کے بعد گاؤں کے سارے لوگ ٹھاکر صاحب اور پنڈت جی سر جوڑ کر بیٹھ گئے تاکہ کوئی ایسا اپائے کیا جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہ ہونے پائے۔

خیر جتنے منہ اتنی باتیں، ٹھاکر صاحب سب کی سنتے رہے، پنڈت جی بھی اپنی کہہ کر خاموش ہو گئے تو ٹھاکر صاحب کھڑے ہوئے اور روہانسی آواز میں بولے۔

”سجنو! جتنا مجھے دکھ ہے! کاش کے میرے بس میں ہوتا تو میں اپنا سینہ چیر کر دل دکھا دیتا۔ میری رات کی نیند اور دن کا چین سکون برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے بھگوان سے کہہ دیا ہے کہ ”اے بھگوان جب تک میں خونی پاپی کا انت نہ کر دوں اس وقت تک چین سے نہ رہوں گا اور نہ ہی پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں گا۔

سجنو! میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ چاہے اس پاپی کو کیفر کردار تک پہنچانے میں چاہے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے..... جس دن اس خونی پاپی کا انت ہو گا اس روز میں اپنے اندر شانتی محسوس کروں گا۔ آپ سب پرارتھنا کریں کہ اس خونی پاپی کا جلد سے جلد انت ہو جائے۔

میرے دل میں یہ بات بھی بیٹھ گئی ہے کہ میرا اپنا جیون بھی شاید اس پاپی کو ختم کرنے میں ختم ہو جائے اور اگر ایسا ہوا تو مجھے بڑی خوشی ہو گی کہ چلو اس خونی کا تو انت ہوا۔“

ٹھاکر صاحب کی باتیں سن کر کئی لوگ رونے لگے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”ٹھاکر صاحب آپ کے بدلے ہماری جانیں چلی جائیں..... اور آپ کو بھگوان ہمارے سروں پر سایہ بنا کر رکھے۔“

تھوڑی دیر بعد سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ٹھاکر صاحب اپنی حویلی میں آ گئے، پنڈت

جی مندر میں چلے گئے۔

تیسرے دن جب لوگ سو کر اٹھے تو پتہ چلا کہ ٹھاکر صاحب سورج نکلنے سے پہلے ہی کہیں چلے گئے ہیں، حویلی میں بھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔

یہ سن کر گاؤں کے سارے لوگ پریشان ہوگئے کہ ٹھاکر صاحب گئے تو کہاں گئے۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ٹھاکر صاحب کہیں جائیں اور کسی کو خبر تک نہ ہو۔

خیر یہ تو لوگوں کو معلوم تھا کہ ٹھاکر صاحب ضرور کسی نہ کسی کام سے ہی کہیں گئے ہوں گے۔ سارے لوگ اپنے تئیں باتیں کرنے لگے تھے۔

اور پھر یہ ہوا کہ تیسرے دن دوپہر کے ٹائم ٹھاکر صاحب واپس آگئے۔ ٹھاکر صاحب کو دیکھ کر لوگ خوش ہوگئے، ٹھاکر صاحب آئے اور اب بھی چپ چاپ تھے، ان کے چہرے سے غم صاف طور پر جھلک رہا تھا۔

دو دن اور گزر گئے اور تیسرے دن جب لوگ پوجا کے لئے صبح کے وقت مندر گئے تو معلوم ہوا کہ پنڈت جی مندر میں موجود نہ تھے۔

ایک مرتبہ پھر لوگ حیران و پریشان ہوگئے۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہوسکتا ہے پنڈت جی بغیر بتائے کہیں چلے گئے ہوں گے۔

مگر تھوڑی دیر بعد یہ پتہ لگ گیا کہ پنڈت جی بھی اسی کنوئیں میں مردہ پڑے تھے۔ جس کنوئیں میں اس سے پہلے گاؤں کی لڑکیاں ملتی تھیں۔

اب تو خوف اور ڈر نے پورے گاؤں والوں کو جکڑ لیا، کیونکہ جب پنڈت جیسے شکتی شالی کے ساتھ ایسا ہوگیا تو عام آدمی کی بات کیا ہوسکتی ہے۔

اگر کوئی بھلی ہوئی خوبی آتما تھی تو کیا اس آتما نے پنڈت جیسے منش کو کیسے قابو کیا اور پنڈت جی کا گلا کاٹ ڈالا۔

لوگ ٹھاکر صاحب کے پاس گئے تو ٹھاکر صاحب تو پہلے ہی سے غمزدہ تھے۔ لوگوں کو دیکھ کر بولے۔

''سجنو! آپ لوگ بس پرارتھنا کرتے رہو، بھگوان کی رام لیلا بھگوان ہی جانے۔

ہم سب مل کر بھگوان سے پرارتھنا ہی کرسکتے ہیں۔ اب پنڈت جی تو رہے نہیں، اب ان کی جگہ مندر کے بڑے سیوک سے کہوں گا کہ وہ پوجا پاٹ کرادیا کریں۔ اب آپ لوگ جاکر آرام کریں، میں بہت تھک گیا ہوں..... اب میں بھی تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

ٹھاکر صاحب کی بات سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

پنڈت جی کے بعد پونم اور اماوس کی راتیں آئیں مگر یہ دیکھ کر لوگ خوش ہوگئے کہ گاؤں سے نہ کوئی جوان اور نہ ہی کوئی لڑکی غائب ہوئی۔

لوگ بہت خوش تھے اور خاص طور پر ٹھاکر صاحب تو بہت ہی خوش تھے، ٹھاکر صاحب کے چہرے پر خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ اور پھر تین ماہ گزر گئے، تین ماہ میں پونم کی راتیں آئیں اور گاؤں کی کوئی بھی لڑکی نہ غائب ہوئی اور نہ ہی ہلاک ہوئی اور یہی نہیں اماوس کی راتیں بھی آتی رہیں مگر کوئی بھی جوان ہلاک نہ ہوا۔

گاؤں کے سارے لوگ خوش تھے، جب پونم کی چوتھی رات یعنی تین ماہ بعد چوتھے مہینے میں پونم کی رات آئی، اس رات سارے لوگ جشن منا رہے تھے کہ اب ہمارے گاؤں سے مصیبت ٹل گئی۔

کافی رات گئے تک گاؤں میں ہلا گلا ہوتا رہا اور پھر لوگ تھک ہار کر اپنے اپنے گھروں میں جاکر سو گئے۔

مگر یہ کیا.....!! صبح کا سورج طلوع ہوا تو لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا ہوجائے گا، لوگوں کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی، لوگ اپنا دل مسوس کر رہ گئے۔

گاؤں سے تین جوان لڑکیاں غائب تھیں، اور وہ تینوں اسی سابقہ حالت میں مردہ پڑی تھیں، یہ دیکھنا تھا کہ گاؤں کے سارے افراد اپنا سر پیٹنے لگے۔

اور پھر ٹھاکر صاحب پر تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان پر سکتہ سوار ہوگیا ہو۔ روتے روتے لوگوں کی آنکھیں

سوج گئیں۔ دوسرے گاؤں والوں نے بھی جب یہ سنا تو غم سے اپنی انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ کئی گاؤں کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور سب کے غم میں شریک ہوئے۔

اس کے بعد اماوس کی راتیں آئیں تو ہر رات دو جوان غائب ہونے لگے اور صبح کے وقت ان کی لاشیں بہت بری حالت میں کہیں نہ کہیں ملتیں۔

یہ دیکھ کر ٹھاکر صاحب نے کئی شکتی شالی پنڈت اور سادھوؤں سے رابطہ کیا مگر کسی سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوسکا۔ جو بھی آتا ایک دو رات گاؤں میں ٹھہرتا اور پھر چلا جاتا اور یہ بول جاتا۔ ''ایسا کیوں ہورہا ہے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے، مگر یہ سب یقیناً کسی خوفی آتما کا کیا دھرا ہے۔''

اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ہر پونم کی رات اور اماوس کی رات میں کئی کئی جانیں جانے لگیں..... یہ دیکھ کر کچھ لوگ تو اس گاؤں سے اپنے رشتہ داروں کے گھر چلے گئے۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ سارے گاؤں والے گاؤں خالی کرکے کہیں چلے جائیں اور یہ بھی نہیں تھا کہ ہر کسی کا رشتہ دار کسی اور گاؤں میں رہتا ہے۔

دن رات لوگ ایشور اور دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں پرارتھنا کرنے لگے۔

رات سے غائب ہونے والے ایسے غائب ہوتے کہ ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی، ایسا لگتا کہ جیسے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوکر گھر سے غائب ہوجاتے۔

اور پھر ایک پونم کی رات ایسی آئی کہ لوگوں کو اگشت بندان کردیا، لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ لوگوں کے دماغ کو مفلوج کرکے رکھ دیا، لوگوں پر سکتہ طاری ہوگیا، لوگوں کی آنکھیں پتھرا گئیں، دیکھنے والوں نے اپنا منہ اور کلیجہ پیٹ لیا، اپنے بال نوچ ڈالے، کئی لوگوں کی تو نالیں کپکپانے لگیں، کچھ تو ایسے بھی تھے کہ لگتا تھا کہ ان کے جسم سے لہو بوند بوند کرکے نچوڑ لیا گیا ہو۔

ٹھاکر صاحب تو برسوں کے بیمار لگتے تھے، ان پر چپ سوار ہوگئی، ان کی آنکھیں جیسے بے نور ہوگئیں، ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے چھن گئی تھی، نہ وہ کسی کی سنتے تھے اور نہ کسی سے کچھ بولتے تھے، اس دن تو ان کی آنکھوں سے جیسے آنسو بھی خشک ہوکر رہ گئے تھے۔

ٹھاکر صاحب کی اپنی پتنی مدھو، ناگ مندر میں مردہ حالت میں پڑی ملی تھی۔

مدھو کا گلا نہیں کٹا تھا، اور نہ ہی اس کے ساتھ انیائے ہوا تھا، وہ ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے چاروں شانے چت مردہ پڑی تھی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں۔

ایسا لگتا تھا کہ اس کے جسم سے بھی لہو نچوڑ لیا گیا ہو۔

ٹھاکر صاحب کی پتنی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح قرب و جوار کے سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ بڑے بڑے لوگ آئے، سب نے ٹھاکر صاحب کو دلاسے دیئے، مگر ٹھاکر صاحب کی اپنی حالت غیر تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے سننے اور کہنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہوچکے ہیں۔

اس کے بعد تو ایسا ہوا کہ گاؤں کے لوگ چوری چھپے اور دوسروں کی نظر بچا کر یہ گاؤں چھوڑنے لگے، اور ایسا کرنے والوں سے کوئی کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ یہ تو سب کا حق تھا کہ وہ اپنی جان کے لئے ایسا کچھ کرے کہ اس کی جان بچ جائے، اور یہ سب صرف اور صرف اس گاؤں میں رہنے والوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اب تک جتنے بھی لوگ گاؤں چھوڑ کر گئے تھے وہ آرام و سکون کی اپنی زندگی گزار رہے تھے، جن لوگوں کے کھیت کھلیان گاؤں میں تھے، وہ بھالم بھاگ صبح کے تڑکے گاؤں میں آجاتے اور دن بھر اپنا کام کاج نمٹا کر اندھیرا ہونے سے پہلے گاؤں سے چلے جاتے تھے۔

مدھو کی موت کے بعد تو لوگوں نے ناگ مندر جانا بھی چھوڑ دیا تھا، کسی صبح بھی مندر سے گھنٹی بجنے کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ لوگوں کے دلوں پر خوفناک ڈر نے

اپنا تسلط جمالیا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے جتنے رشتہ دار حویلی میں تھے وہ بھی کسی نہ کسی بہانے حویلی چھوڑ کر جا چکے تھے، جو خاص خونی رشتے دار تھے صرف وہی اب تک حویلی میں مقیم تھے اور اپنی سکھ شانتی کے لئے بھگوان سے دن رات پرارتھنا کرتے رہتے تھے۔

ویسے بھی حالات دن رات خراب سے خراب تر ہوتے جارہے تھے۔ گاؤں کا ہر فرد سہما ہوا ڈرا ڈرا رہتا تھا، گاؤں میں کچھ ایسے بھی افراد تھے جنہوں نے اپنے جوان لڑکے اور لڑکیوں کو اس گاؤں سے دور کسی اور گاؤں میں اپنے رشتے داروں کے گھر بھیج دیا تھا۔

اور پھر ایک صبح جو منظر نظر آیا اس نے لوگوں کو خون کے آنسو رلا دیا، لوگوں کی رہی سہی ہمت ختم ہوگئی، لوگوں نے حتمی فیصلہ کرلیا کہ اب اس گاؤں میں رہنا عقلمندی نہیں بلکہ سراسر بے وقوفی ہے، اور جان بوجھ کر موت کو گلے لگانا ہے۔

ٹھاکر بلرام سنگھ ناگ مندر میں مردہ پائے گئے، وہ بھی چاروں شانے چت پڑے تھے، ان کی آنکھیں پھٹی پڑی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کی آنکھوں میں خوف ٹھونس ٹھونس کر بھر دیا گیا ہو۔

ٹھاکر صاحب کی مرتیو کے بعد حویلی چند دنوں میں ہی خالی ہوگئی۔ حویلی کے مکین سر پر پاؤں رکھ کر اس گاؤں سے دور چلے گئے، کبھی اس گاؤں میں نہ آنے کے لئے۔

اور پھر حویلی والوں کی دیکھا دیکھی گاؤں والوں نے بھی اس گاؤں کو چھوڑنا شروع کردیا، اور ایک ایک کرکے سارے لوگ روتے پیٹتے اپنے پرکھوں کی جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

کچھ ایسے لوگ رہ گئے جو عمر رسیدہ تھے اور اپنا بلکا پھلکا کام کرسکتے تھے، اور پھر جو معصیت گاؤں پر ٹوٹی تھی، وہ دشٹ یا خونی آتما عمر رسیدہ اور شادی شدہ لوگوں کو کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس وجہ سے ایسے لوگ گاؤں میں ٹھہرے رہے تاکہ آرام سکون سے اپنا انتظام کرکے جاسکیں۔

ٹھاکر صاحب کی مرتیو کے ٹھیک اکیسویں رات، وہ رات بھی پونم کی رات تھی۔

ناگ مندر سے پائلوں کی جھنکار اور ناچ گانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں، پائل کی جھنکاروں کے ساتھ وقفے وقفے سے کسی شخص کے چیخنے کی دردناک آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

اجاڑ اور ویران مندر میں عجیب طرح کی روشنی پھیل گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مندر میں ناگ دیوتا کو خوش کرنے کے لئے کوئی ناری پائل پہن کر ناچ رہی ہے۔

وہ بہت ہی مدھر آواز تھی، جسے سن کر دل میں عجیب خواہش پیدا ہورہی تھی اور سننے والے کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ اس مدھر آواز کو بن کر جیسے بے خود سا ہورہا ہے۔

صبح کے وقت پتہ چلا رام دیال کے بیٹے سے کہ وہ اس آواز کو بن کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا، اور وہ مندر کی طرف بڑھتا چلا گیا، لیکن جب وہ مندر سے تھوڑی دور رہ گیا تو اس کے قدم خود بخود رک گئے، کیونکہ بقول اس کے کہ ایک ان دیکھی شیشے کی دیوار اس کے راستے میں حائل ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے وہ مندر تک نہ پہنچ سکا۔ ویسے بھی رام دیال کا پتر دماغ کا کچھ کمزور تھا۔

اس کے بعد ہر مہینہ پونم کی رات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویران مندر میں آدھی رات کے بعد مندر میں دل کو لبھانے والی روشنی دکھائی دیتی ہے، پھر تھوڑی دیر بعد پائلوں کی جھنکار سنائی دینے لگتی ہے، اور پھر یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی کسی شخص کے چیخنے کی آواز بھی آتی ہے، جیسے کہ اس چیخنے والے شخص کو ناقابل برداشت اذیت دیا جاتا ہو۔

بس صاحب جی! اس وقت سے لے کر ابھی تک یہ واقعہ ناگ مندر میں رونما ہوتا ہے، آج تک کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، رات سے مندر میں روشنی کیسے اور کیوں ہوتی ہے؟ پاؤں میں پائل باندھ کر کون ناری ناچتی ہے اور پھر مندر میں اذیت اور تکلیف

دہ کون شخص ہے جو کہ گلا پھاڑ کر چیختا ہے؟

صاحب جی! بس مجھے صرف اتنا ہی پتہ ہے اور اب بات آپ کو اور بتادوں کہ یہاں آنے والے کبھی بھی کسی سیاح یا پکنک منانے والوں کے ساتھ کوئی بھی ایسا ویسا واقعہ رونما نہیں ہوا، ہاں یہ ضرور ہے کہ جب کبھی لوگ آتے ہیں اور وہ پونم کی رات ہوتی ہے تو اس مندر میں ہم کسی کو بھی نہیں جانے دیتے بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ باہر سے حویلی کے مین دروازے پر تالا ڈال دیتے ہیں۔

رات سے مندر سے جو آوازیں آتی ہیں تو ان کے متعلق لوگ پوچھتے ضرور ہیں، تو ہم یہ بتاوے ہیں کہ رات سے پونم کی رات میں ایک خاص پوجا ہوتی ہے جس میں صرف خاص لوگ ہی شرکت کرتے ہیں۔

بس صاحب جی! میں نے ساری حقیقت آپ کے سامنے رکھ دی۔ اب مجھے اجازت دیں، میں چلتا ہوں، کچھ کام نمٹانے ہیں۔" اور پھر رامو نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

رامو کے جانے کے بعد حکیم وقار بولے۔ "عجیب بات اس نے بتائی ہے، اور کیا اس واقعہ کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہے؟"

حکیم وقار کی بات سن کر رولو کا بولا۔ "حکیم صاحب یہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس راز سے پردہ اٹھ جائے تاکہ اس علاقے اور یہاں کے لوگ دوبارہ سے خوشی خوشی اپنی زندگی گزار سکیں، اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ ویران مندر میں ہر پونم کی رات روشنی کیوں ہوتی ہے؟ وہ کونسی عورت ہے جو ناچتی ہے اور وہ کون ہے جو اذیت میں مبتلا ہو کر چیختا ہے؟"

رولو کا مزید دو روز تک حویلی میں حکیم وقار اور دیگر لوگوں کے ساتھ رہا۔ تیسرے روز تمام ملازمین نے مکھوم پر کہ بہت مرہ اٹھایا اور پھر خوشی خوشی واپس آگئے، دلی واپس آکر رولو کا شانتی پور میں موجود ناگ مندر اور حویلی کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ ابھی پونم کی رات آنے میں کوئی ایک ہفتہ باقی تھا۔

خیر وہ چند روز بھی گزر گئے اور چودھویں یعنی پونم کی رات آگئی، رات کا کھانا حکیم وقار کے ساتھ رولو کا نے کھایا اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا، کیونکہ ابھی آدھی رات ہونے میں کوئی چار گھنٹے باقی تھے۔

خیر رات کے بارہ بجتے ہی رولو کا اپنے بستر سے اٹھا اور اپنی مکمل تیاری کرلی۔ کیونکہ اب رولو کا نے غائب حالت میں شانتی پور کے ناگ مندر میں پہنچنا تھا۔

رولو کا نے اپنے عمل کے ذریعے خود کو مکمل طور پر پوشیدہ کرلیا تھا کہ جب وہ مندر میں پہنچے تو مندر میں موجود کسی بھی طریقے سے اس کا پتہ نہ چلے اور مندر میں موجود چاہے وہ کوئی بھی آتما تھی یا کوئی بھی اور ہستی رولو کا کے بارے میں بالکل بھی پتہ نہ چلے کہ کوئی زندہ شخص مندر میں موجود ہے۔

خیر رات بارہ بج کر تیس منٹ پر رولو کا غائبانہ طور سے ناگ مندر میں موجود تھا۔

رولو کا مندر میں ناگ کے مجسمے کے دائیں طرف ہو کر کھڑا ہوگیا۔ رولو کا اپنے تئیں ہر طرح سے محفوظ تھا اور اپنی جگہ سے ساری ہونے والی کارروائی واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

پورے مندر میں گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اس ویران اور اجاڑ مندر کے تصور سے ہی مرجاتا۔

رات کے ٹھیک ساڑھے بارہ بجے تو اچانک ناگ کا جو پتھر کا مجسمہ تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں ایسی سرخ ہوگئیں جیسے کہ دو دہکتے ہوئے چھوٹے انگارے رکھ دیئے گئے ہوں۔

پھر چند سیکنڈ بعد ناگ کے منہ سے سفید روشنی نکل کر سامنے ایک دائرہ کی شکل میں پڑی تو رولو کا یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دائرہ کے بیچوں بیچ ایک گٹھری نما چیز پڑی تھی۔

مگر یہ کیا! اس گٹھری نما چیز میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ گٹھری نما چیز کچھ اور نہیں بلکہ ایک لڑکی تھی۔ اس

لڑکی نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر کو اٹھایا، پھر اس نے اپنا سر دائیں بائیں گھمایا اور پھر یک ٹک ناگ کے مجسمے کو دیکھنے لگی۔

پتھر کو تراش کر ناگ کا مجسمہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ جیسے وہ ناگ کنڈل مارے بیٹھا ہو۔ پھر نظر آیا کہ ایک شخص جو کہ داڑھی مونچھوں سے مبرا تھا، وہ ناگ کے سامنے اس مجسمے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔

پھر اتنے میں پورے مندر میں دودھیا روشنی پھیل گئی، تو رولو کا نے دیکھا کہ سامنے ایک شخص زنجیروں میں جکڑا پڑا ہے، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

اچانک ناگ کے آگے بیٹھے ہوئے شخص کی آواز سنائی دی۔ ”مدھو اٹھ اور میرے ساتھ ناگ دیوتا کو بھی خوش کر، تو یہ بھی جانتی ہے کہ میرا حکم نہ ماننے پر تجھے کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

مدھو کا نام سن کر رولو کا یکدم چونک گیا۔ کیونکہ شانتی پور کی حویلی میں راموکی زبانی یہ نام سن رکھا تھا۔ مدھو تھا کہ بلرام سنگھ کی پتری تھی۔ جو کہ سینکڑوں سال پہلے ایک رات ناگ مندر میں مردہ پائی گئی تھی۔

رولو کا کے ذہن میں فوراً آیا۔ ”تو کیا مدھو کی آتما کو قید میں رکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ سینکڑوں سال سے چل رہا ہے۔“

پھر رولو کا سوچنے لگا۔ ”ناگ کے آگے بیٹھا ہوا شخص کون ہے؟ اور یہ شخص جو کہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے یہ کون ہے؟“

کہ اتنے میں ناگ کے سامنے بیٹھے شخص کی کرخت آواز سنائی۔ ”چل اوئے مدھو! اب زیادہ ناٹک نہ کر، اپنا کام شروع کر، کیا تجھے میری شکتی کے متعلق معلوم نہیں کہ میں کس قدر شکتی شالی ہوں، دیکھ میں آتما بن کر بھی بہت زیادہ شکتی شالی ہوں، اور یہ تیرا باپ بلرام سنگھ، اگر یہ میری بات ان دنوں مان لیتا تھا آج اس حالت کو نہیں پہنچتا۔

اس نے میری بات نہیں مانی، ارے میں نے تو صرف یہ کہا تھا۔ ”ٹھاکر اپنی پتری مدھو کو ناگ دیوتا کی داسی بنا دو..... نہیں تو تم سب بہت کشٹ میں پڑ جاؤ گے۔ مگر اس نے میری بات ماننے کے بجائے رات کے اندھیرے میں مجھے مروا دیا۔ اور پھر یہ بھی نہیں بچا اور تو بھی نہ بچتی۔

مدھو! اب سے بربادنہ کر اور اپنا ناچ شروع کر۔“

اتنے میں اس شخص کی آواز سنائی دی جو کہ زنجیروں میں جکڑا پڑا تھا۔ ”مدھو پتر اس دشٹ پاپی کی بات نہ مان، چاہے یہ میری آتما کو جلا کر راکھ کر دے۔ پتر کاش کہ میں اس پاپی کا گلا دبوچ سکتا۔

ناگ دیوتا نے بھی اس دشٹ پاپی کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ یہ لوگوں کے ساتھ انیائے کرے، ناگ دیوتا میری بات پر دھیان دو۔

کیا ایک دشٹ آپ کے نام کا جاپ کر لے تو کیا وہ اتنی شکتی شالی بن جاتا ہے کہ وہ ایشور کے بنائے ہوئے قانون کی دھجیاں بکھیر دے، لوگوں پر ظلم و زیادتی کرے، لوگوں کا خون بہائے، کنواریوں کے ساتھ انیائے کرتا رہے۔

ناگ دیوتا یہ تمہارا کیسا انصاف ہے!

مدھو پتر میری بات مان لے، چاہے یہ پاپی مجھ پر کتنا ہی ظلم کرے۔“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ناگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے اپنا دایاں ہاتھ جھٹکا تو اس کے ہاتھ سے چنگاریاں سی نکلیں اور سامنے کو بڑھتے ہوئے بلرام کے جسم سے ٹکرا گئیں۔ چنگاریوں کا اس کے جسم سے ٹکرانا تھا کہ اس کے منہ سے کربناک آواز نکلی۔ جسے سن کر رولو کا بھی تڑپ اٹھا۔

اور پھر اپنے پتا کی کربناک آواز سنتے ہی مدھو اٹھ کھڑی ہوئی اور سامنے بیٹھے شخص کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”میں ناچنا شروع کرتی ہوں۔ بھگوان کے لئے میرے پتا کو اور کشٹ نہ دو۔“ پھر وہ ناچنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا ناچ زور پکڑ رہا تھا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ جنونی طور پر ناچنے لگی۔ اس کے پاؤں میں بندھی پائلوں کی جھنکار سے پورا مندر گونجنے لگا۔

پھر اس شخص کی آواز سنائی دی۔ ”بلرام اگر تو ابھی دنوں میری بات مان لیتا تو آج تیری اور تو تیری کی آتما شانتی میں رہتی۔ دیکھ تیری ضد نے کیا سے کیا کر دیا، میرے ساتھ ساتھ تم دونوں بھی مارے گئے، ارے میں تو مر کر بھی شکتی شالی ہوں..... مجھ میں اتنی شکتی ہے کہ کوئی بھی مجھے مات نہیں دے سکتا۔

میں تجھے ہر پونم کی رات میں یہاں بلاتا ہوں اپنے من کی اچھا پوری کرتا ہوں اور یہ تیرا پاپ سوائے اذیت بھگتنے اور تجھے ناچتا دیکھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تم دونوں ہمیشہ میری قید میں رہو گے۔

تم دونوں میرے لئے ایسے کھلونے ہو کہ میں جب چاہتا ہوں کھیلتا ہوں اور پھر اپنی اچھا پوری کرتا ہوں۔“ وہ بولے جا رہا تھا اور مدھو ناچنے میں مگن تھی، اسے اپنے اردگرد کا کوئی بھی ہوش نہ تھا، وہ جنونی رقص میں مصروف تھی، اب وہ لڑکھڑانے بھی لگی تھی، اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ پتھریلے فرش پر تیورا کر گر پڑی اور جیسے ساکت ہو گئی۔

پورے مندر میں سکوت طاری ہو گیا۔ ناگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی نگاہیں مدھو پر مرکوز تھیں۔

دراصل یہ وہی شخص تھا جو کہ شانتی پور میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد مندر کا پنڈت بنا تھا، اس کا نام گوپی چند تھا۔

گوپی چند بہت ہی آوارہ طبیعت اور عیاش شخص تھا۔ جو کہ آدھی رات کے بعد اپنے منتروں کے ذریعہ گاؤں اپنے بیروں کو بلاتا اور پھر ان بیروں کے ذریعے گاؤں میں موجود خوب صورت لڑکیوں کو اٹھوا لیتا اور پھر رات کے اندھیرے میں ان لڑکیوں کے ساتھ اپنا منہ کالا کرتا اس کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ یعنی ان مرنے والوں کا سارا خون اس کے بیر پی جاتے تھے۔

چونکہ رات کے اندھیرے میں لڑکیوں کو بیر اٹھاتے تو وہ یا لڑکی کسی کو نظر میں نہیں آتے اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر وہ بیر اپنا کام پورا کرتے اور لڑکی پنڈت کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔

خیر ناچتے ناچتے مدھو مندر کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی تھی، وہ اپنا سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ چونکہ وہ بھی ایک آتما تھی مگر پنڈت اپنے عمل سے مدھو کی آتما کو ٹھوس جسم میں تبدیل کر دیتا تھا اور اس طرح وہ جنونی ناچ پیش کرنے کے لئے مجبور تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے پنڈت کی آتما اپنی شکل بدلنے لگی اور پلک جھپکتے ہی ایک بہت بڑے موٹا ناگ میں تبدیل ہو گئی اور بے سدھ پڑی مدھو کے شریر کے سمت بڑھنے لگی۔

مدھو کے بالکل قریب وہ ناگ پہنچا اور اپنا بھاڑ جیسا منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگا، وقت کے ساتھ ساتھ اس کی سانسیں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ اس کی سانسیں اتنی زور آور ہوئیں کہ مدھو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس کا جسم آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے سانپ بنے پنڈت کے قریب پہنچ گیا۔

پھر اس ناگ نے اپنا منہ مدھو کے سر پر ٹکا دیا۔ اس کا بھاڑ جیسا منہ کھلتا ہی چلا گیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے مدھو کا جسم اس ناگ کے منہ میں سرکتا ہوا آگے کو بڑھنے لگا، اب ناگ مدھو کے جسم کو جسم نگل رہا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مدھو کا پورا جسم ناگ کے منہ میں چلا گیا۔

رولو کا کے لئے وہ منظر بہت ہی اچنبھے والا تھا۔

ادھر مدھو کا باپ بلرام اپنی جگہ زنجیروں میں بکڑے بے سدھ ہو چکا تھا۔ اب ناگ مڑا اور آہستہ آہستہ ناگ دیوتا کے مجسمے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر متواتر رینگتا ہوا، پتھر کے ناگ کے منہ میں اتر گیا۔

اور پھر اچانک پورے مندر میں گھپ اندھیرے چھا گیا۔ اور جب رولو کا کو اطمینان ہو گیا کہ اس وقت پورا ناگ مندر کسی بھی آتما سے خالی ہو چکا ہے تو رولو کا اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور پھر نہ جانے رولو کا نے کیا چکر کیا کہ ایک کونے سے روشنی پھوٹنے لگی، اس روشنی میں رولو کا نے پورے مندر کا بغور جائزہ لیا۔ مندر میں موجود ایک ایک چیز کو بغور دیکھتا رہا، پھر رولو کا پتھر کے

بنے ناگ کے قریب آیا اور گنگی باندھ کر پتھریلے ناگ کو دیکھنے لگا کہ اچانک رولوکا کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی، پھر چند منٹ بعد رولوکا اپنی جگہ سے غائب ہو چکا تھا، اور پھر مندر کے کونے سے پھوٹتی روشنی بھی غائب ہو گئی۔

پلک جھپکتے رولوکا اپنے کمرے میں موجود تھا۔ منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے چینج کر کے اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک بستر پر بیٹھا، اس کے بعد بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے مندر میں ہونے والے واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔ ”مندر کا پنڈت کس قدر ظالم بے حس، نفسانی خواہشات کا غلام کہ زندہ رہتے ہوئے لڑکیوں کے ساتھ ظلم کرتا رہا اور مر کر بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ ان کی روحوں کو قیدی بنا کر اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔

میں کسی بھی حالت میں پنڈت کی روح کا خاتمہ کروں گا تاکہ بلرام اور اس کی بیٹی کی روح کو چین نصیب ہو؟“ رولوکا نے مصمم ارادہ کر لیا۔

ابھی پونم کی رات آنے میں چند دن باقی تھے اور رولوکا اس رات کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وقت آگے کو بڑھتا رہا اور آخر کار پونم کی رات آ ہی گئی۔

وقت سے پہلے رولوکا مندر میں پہنچ گیا اور اپنی کارروائی کر کے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

ٹھیک رات کے ساڑھے بارہ بجنے ہی مندر میں موجود پتھریلے ناگ کی دونوں آنکھیں جیسے انگارہ اگلنے لگیں۔ اور پھر چشم زدن میں پنڈت نمودار ہوا اور ناگ کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ دو منٹ تین منٹ اور پھر منٹ پر منٹ گزرتے رہے، لیکن ناگ کے منہ سے سفید روشنی نہیں نکلی۔

اب پنڈت غلیظ میں آ چکا تھا۔ اس کی کرخت آواز مندر میں گونجنے لگی۔ ”ناگ دیوتا! یہ کیا ہو رہا ہے، کیا میری تپسیا میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میں زندہ تھا تب بھی تمہارا سیوک تھا اور مر کر بھی میری آتما تمہاری خوشی کے لئے نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہے۔

ناگ دیوتا! میرا یہ منتر بے کار ہو رہا ہے، ناگ دیوتا ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا میری خواہش آج دم توڑ دے گی، کیا میں ناراض ہو جاؤں گا؟..... ناگ دیوتا کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی دشٹ میرے پیچھے لگ گیا ہو؟ ناگ دیوتا میری مدد کرو۔“

مگر پنڈت کی آواز مندر میں گونجتی رہی، ناگ دیوتا کی خاموشی شاید کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ پھر پنڈت کی آواز گونجی۔ ”مدھو! کدھر ہے؟ ترنت میرے سامنے آنکھیں تو میں تیرے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ دنیا بھر کی تمام آتمائیں تجھے دیکھ کر تھرا جائیں گی۔ مدھو جلدی کر، ورنہ تیرے پتا بلرام کی آتما کو جلا کر ختم کر دوں گا، تجھے نہیں پتہ میں کتنی شکتی کا مالک ہوں۔

مدھو..... مدھو..... جلدی سے آ جاؤ ورنہ.....“

اور پنڈت کی آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ اچانک پورے مندر میں تیز روشنی پھیل گئی۔ جسے دیکھ کر پنڈت مزید پریشانی کا شکار ہو گیا اور پھر کرخت آواز میں بولا۔ ”ارے یہ سب کیا ہے..... آج یہ کیا ہو رہا ہے..... ؟ اگر کوئی مورکھ ہے تو میرے سامنے آئے۔“ اور پھر اس کی آواز دبتی چلی گئی، آواز میں کرختگی نہ رہی۔

پورے مندر میں روشنی پھیلنے ہی مندر کی ہر چیز واضح نظر آنے لگی..... اس وقت مدھو کی آتما تھی اور نہ ہی زنجیروں میں جکڑی ہوئی بلرام کی آتما تھی۔

پنڈت کے تیور پاگلوں جیسے ہو رہے تھے۔ اب اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو گئی تھیں، وہ بار بار مندر کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا اور خاص طور پر ناگ کے مجسمے کو بھی دیکھ لیتا تھا، اب ناگ کی دونوں آنکھوں سے روشنی غائب تھی، اور یہی نہیں پتھریلے ناگ کا منہ بھی اب آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا، جسے دیکھ کر پنڈت کے چھکے چھوٹ گئے، اور پھر چھلانگ لگا کر پنڈت پتھریلے ناگ کے مجسمے کی طرف بڑھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی، ناگ کا کھلا ہوا منہ بالکل بند ہو چکا تھا۔ اب تو پنڈت کی حالت دیدنی تھی، وہ پاگلوں کی طرح مندر میں پھر

لگانے لگا۔ وہ بار بار ناگ کے مجسمے کے پاس آتا اور گنگی باندھ کر دیکھنے لگتا..... پنڈت کے سارے حربے ناکام ہو گئے تھے۔ پھر گرجدار آواز میں بولا۔

”ارے کوئی ہے تو میرے سامنے آ، پھر میں دیکھتا ہوں کہ تو کس قدر شکتی شالی ہے، ارے چھپ کر تو بزدل حملہ کرتے ہیں، اگر مرد کا بچہ ہے تو اپنی شکل دکھا۔“ اس کی گرجدار آواز پورے مندر میں گونجتی رہی اور پھر چشم زدن میں دھوئیں میں تبدیل ہو کر مندر کے روش دان کے راستے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد رولوکا نے نہ جانے کیا پڑھ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی پر پھونک ماری تو انگلی سے چنگاریاں نکل کر روشندان کی طرف بڑھیں اور پھر تمام چنگاریاں روشن دان کے راستے باہر کو نکل گئیں۔

ایسا لگتا تھا کہ رولوکا نے اپنی کوئی خفیہ طاقت کو پنڈت کے پیچھے بھیج دیا تھا تاکہ پنڈت طیش میں آ کر مندر میں واپس نہ آ جائے۔

پنڈت کے نکلتے ہی مندر میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ اب رولوکا نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو مندر کے ایک کونے سے واضح اور تیز روشنی پھوٹنے لگی تھی۔

اس کام سے یہاں فارغ ہو کر رولوکا نے آواز لگائی۔ ”مدھو تم جلدی سے یہاں حاضر ہو جاؤ۔“ اور پھر پلک جھپکتے ہی مدھو کی آتما حاضر ہو گئی..... وہ دھوئیں کی شکل میں آئی تھی، پھر سارا دھواں اکٹھا ہو کر ایک ٹھوس وجود میں تبدیل ہو گیا..... اب رولوکا کے سامنے مدھو موجود تھی۔

پھر رولوکا نے آواز لگائی۔ ”بلرام سنگھ بے فکر ہو کر آ جاؤ۔“ تو چند سیکنڈ میں بلرام کی آتما بھی حاضر ہو گئی اور پھر اس نے بھی ایک ٹھوس وجود اختیار کر لیا تھا۔

ان دونوں کو دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”آپ دونوں گھبرائیں اور نہ ہی پریشان ہوں۔ اب پنڈت کی روح یہاں سے کافی دور جا چکی ہے۔ اب اس کا مندر میں داخلہ قطعی نہیں ہو سکتا۔ وہ لاکھ کوشش کرلے مگر مندر کے آس پاس بھی نہیں آ سکتا، کیونکہ میں نے اس کے پیچھے جاگتے الو کو لگا دیا ہے اور یہ جاگتا الو کسی پل بھی اسے چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔

آپ لوگوں کے ساتھ پنڈت نے بہت برا کیا، آپ لوگوں کو ظلم و زیادتی کی چکی میں پیستا رہا، اس نے پورے گاؤں کو ویران اور بنجر بنا دیا، گاؤں کے سارے لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے، آپ کا خاندان تتر بتر ہو گیا، پنڈت اپنی نفسانی خواہشات کا غلام تھا، اب اس کے خاتمہ کا وقت آن پہنچا ہے۔

آپ دونوں اپنے دل میں ذرہ برابر بھی خوف نہ لائیں، اب آپ دونوں پنڈت کی گرفت سے آزاد ہیں، اب آپ لوگ بے خوف و خطر اپنی اصل منزل کی طرف لوٹ جائیں۔“

رولوکا کی بات سن کر مدھو بولی۔ ”مہا پرش آپ نے ہمیں آزادی دلائی، اس کے لئے آپ کا بہت بہت دھنے واد، میں پرلوک میں جا کر آپ کے لئے ایشور سے ضرور پرارتھنا کرتی رہوں گی۔“

اس کے بعد بلرام سنگھ بولا۔ ”شکتی شالی مہا پرش میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری مدد کی اور ہماری آتماؤں کو شانتی سے ہمکنار کیا۔ اچھا اب ہم چلتے ہیں، پرلوک میں جانے کا سے بہت رہا ہے۔“ اور یہ بول کر دونوں آتمائیں مسکراتی ہوئی خوشی خوشی مندر سے نکلتی چلی گئیں۔

یہ دیکھ کر رولوکا کو دلی سکون ملا..... اور پھر رولوکا کے منہ سے نکلا..... ”پنڈت گوبی چند تو کہاں تک بھاگے گا، میں بھی تجھے اتنا بلکان کر دوں گا کہ تو چین و سکون کے لئے پل پل ترسے گا۔“ اور یہ بول کر رولوکا نے حکیم وقار کے مطب کا خیال کیا تو پلک جھپکتے ہی غائب ہو کر اپنے کمرے میں موجود تھا۔

ویسے بھی پنڈت کی آتما کو کئی عام آتما نہیں تھی۔ وہ بہت شکتی شالی تھی، وہ جب چاہتی ہر روپ میں آ جاتی تھی۔

ادھر پنڈت کی آتما نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کوئی بہت ہی پہنچا ہوا منش اس کی راہ میں

روڑے اٹکا رہا ہے..... پھر اس نے سوچا کہ یہ چند دن کی پریشانیاں ہیں وہ تھک ہار کر میرا خیال دل سے نکال دے گا، تو میں مدعو سے وہ سلوک کروں گا کہ وہ تمرا کر وہ جائے گی اور پھر بلرام سے بھی نمٹ لوں گا۔"

دن اور رات میں وہ کئی کئی روپ بدلنے لگا۔ وہ کبھی انسانی شکل اختیار کر لیتا اور پھر چند پرند کا وجود بھی اختیار کر لیتا یہ سوچ کر کہ "میرے پیچھے آنے والا خود ہی تھک جائے گا۔"

ادھر رولو کا کو پنڈت کی تمام خبریں مل رہی تھیں، وہ جب بھی کوئی روپ بدلتا تو فوراً رولو کا کے کارندے اسے بتا دیتے۔ جا گتے الو کے بجائے اور مزید کارندے بھی پنڈت کے پیچھے لگ گئے تھے۔

مگر ایک دن پنڈت کو موقع مل ہی گیا۔ رولو کا کا ایک کارندہ فاختہ کی شکل میں ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا پنڈت کی خبر گیری کر رہا تھا کہ چند سیکنڈ کے لئے وہ غافل ہوا کہ پنڈت نے ایک باز کی شکل اختیار کی اور پلک جھپکتے ہی فاختہ پر جھپٹا اور اس فاختہ کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

یہ صورت حال دیکھتے ہوئے رولو کا کے کارندے بہت بلیٹس میں آگئے اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ بالکل وقت ضائع کئے بغیر پنڈت کو نیست و نابود کر دیں..... اور جب یہ خبر رولو کا تک پہنچی تو رولو کا کو گویا دکھ ہوا..... مگر پھر رولو کے منہ سے اپنے کارندوں کو حکم دیا "کوئی بھی بلیٹس میں نہ آئے بلکہ وقت کا انتظار کرے اور بغیر میرے حکم کے کوئی بھی قدم نہ اٹھائے۔"

رولو کا کا حکم سنتے ہی کارندے نارمل حالت میں آگئے اور چوکس ہو کر پنڈت کی نگرانی کرنے لگے۔

ادھر پنڈت کو سب سے زیادہ حیرانی اور پریشانی یہ تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی ناگ دیوتا سے رابطہ ہو کر نہیں دے رہا تھا۔

اس کے بعد پنڈت نے پروگرام بنایا کہ "ان خفیہ طاقتوں کو گھیر گھار کر انہیں ناگ مندر لے جاؤں کیونکہ ناگ مندر تو میرا ہے اور پھر اس جگہ میرے علاوہ کسی اور کا کوئی منتر جنتر چل نہیں سکتا۔" اور یہ سوچ کر وہ ناگ مندر کی طرف بڑھنے لگا۔

مگر یہ کیا..... ناگ مندر تو دور کی بات..... پورے شانتی پور کے گرد ایک بہت ہی مضبوط اور طاقتور حصار قائم تھا۔ اور اس حصار کو توڑنا پنڈت کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ دل مسوس کر اس جگہ سے پلٹا اور ایک جنگل میں پہنچ گیا۔

دراصل واپس جاتے ہوئے رولو کا نے شانتی پور اور مندر کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر دیا تھا۔ رولو کا کو یہ معلوم تھا کہ پنڈت دوبارہ پلٹ کر شانتی پور یا پھر مندر میں ضرور آئے گا اور پھر اس طرح پنڈت کا شانتی پور سے واسطہ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

جنگل میں پہنچ کر پنڈت آگے ہی آگے بڑھتا رہا، اس وقت پنڈت ایک باز کی شکل میں تھا اور یہی نہیں بلکہ پنڈت بھی ہر وقت اپنے گرد ایک مضبوط حصار قائم رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے رولو کا کے کارندے اس کے قریب نہیں پھٹک سکتے تھے۔

رولو کا کا بھی یہی حکم تھا کہ "کوئی بھی کارندہ پنڈت پر جھپٹے نہیں بلکہ اسے بھگاتا رہے، پنڈت ایک جگہ بیٹھنے نہ پائے، اسے ہر وقت دھرکا لگا رہے کہ پتہ نہیں مجھ پر کب دشمن جھپٹ پڑے، اور مجھے قید کر لے یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے نیست و نابود کر دے۔"

پنڈت باز بن کر جب جنگل میں داخل ہوا تو وہ خبر فوراً رولو کا کے پاس پہنچ گئی کہ پنڈت باز بن کر جنگل میں داخل ہو گیا ہے۔

رولو کا نے فوراً اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ کوئی بھی پنڈت کے پیچھے جنگل میں داخل نہ ہو، بلکہ جنگل سے باہر رہ کر پنڈت کی نگرانی کی جائے۔

ادھر اڑتے ہوئے پنڈت نے جب نیچے نظر ماری تو یہ دیکھ کر خوش ہو گیا کہ جنگل کے بیچوں بیچ ایک قبیلہ آباد ہے اور پھر پنڈت ایک درخت پر آن بیٹھا اور پھر پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ ایک درخت کی آڑ میں اپنے آپ کو جنگلی کے روپ میں ڈھال لیا اور پھر اسے خیال آیا کہ پتہ نہیں وہ کون سی زبان بولتے ہوں۔ یہ سوچتے

ہی اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں گونگا بن جاؤں۔ اور یہ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ جنگلی قبیلہ کے پاس تھا۔ ایک طرف جنگلیوں کے بچے کھیل کود رہے تھے۔ وہ بھی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

جب بچوں کی اس پر نظر پڑی تو بچے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے، کیونکہ وہ ان کے قبیلے کا نہیں تھا۔ کافی دیر میں ایک بوڑھا اس طرف نکل آیا اور اجنبی پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا اور پھر اپنی زبان میں کچھ بولا تو پنڈت جو کہ اس وقت جنگلی کے روپ میں تھا، اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ "میں بول نہیں سکتا یعنی میں گونگا ہوں۔"

بوڑھا جنگلی بہت رحم دل تھا اسے اجنبی پر بہت ترس آیا کیونکہ پنڈت نے ہاتھ کے اشارے سے یہ بتایا تھا کہ میں بہت بھوکا بھی ہوں۔

بوڑھا مسکرانے لگا اور پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو پنڈت اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بوڑھا اسے لے کر ایک جھونپڑی کے قریب پہنچا اور پھر کسی انجانی زبان میں بلند آواز سے کچھ بولا تو اس کی آواز سنتے ہی کئی عورتیں اپنی اپنی جھونپڑی سے نکل آئیں اور کئی مرد بھی تھے۔

بوڑھے نے پنڈت کو سایہ میں بیٹھایا اور پھر ایک عورت کو مخاطب کر کے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ عورت فوراً اٹھتی ہوئی ایک جھونپڑی میں جا گھسی۔

اور پھر چند منٹ بعد ہی وہ عورت جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پلیٹ نما برتن تھا اور اس برتن میں بھنا ہوا گوشت تھا۔

گوشت دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ گوشت پرندوں کا ہے۔

بوڑھے نے عورت کے ہاتھ سے برتن لے کر پنڈت کے آگے رکھ دیا اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم اسے کھاؤ۔

اور پھر تو پنڈت اس گوشت پر ٹوٹ پڑا اور چند منٹ میں ہی سارا گوشت چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے پانی پیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے ہی بوڑھے اور دیگر لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد دو سے سارے لوگ بوڑھا سمیت ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتیں پنڈت کے متعلق ہی تھیں۔ ایک شخص بولا۔ "کاکا جی! آپ نے کوئی تصدیق نہ کی اور اسے یہاں لے آئے، ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے کسی دشمن قبیلے کا ہو اور ہم میں اس نیت سے آیا ہو کہ ہماری اندرونی طاقت کا اندازہ لگائے۔"

یہ سن کر بوڑھا بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں دشمن اس طرح کے نہیں ہوتے، مجھے لگتا ہے یہ کسی کا ستایا ہوا ہے اور اپنی راہ بھٹک گیا ہے، اس کے چہرے پر صاف لکھا ہے جو تم لوگ بھی محسوس کر سکتے ہو، یقیناً اندرونی طور پر یہ بہت سہما ہوا ہے اور خوف زدہ ہے، اور ہو سکتا ہے اپنی جان بچانے کے لئے اس طرف بھاگ آیا ہو، ویسے بھی کسی مصیبت زدہ کو پناہ دینا کار ثواب ہے، اور ویسے بھی ہمارے ویچ ڈاکٹر کئی روز کے لئے گئے ہیں، جب وہ آئیں گے تو خود ہی اس کا پتہ چلا لیں گے۔" خیر بوڑھا اور دیگر لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے رہے اور پنڈت کی باتیں سنتا رہا، وہ اندر ہی اندر خوش بھی ہوتا رہا کہ میں نے گونگا بن کر سب کو بے وقوف بنا دیا۔ پنڈت صاف طور پر جنگلیوں کی زبانیں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہے ہیں۔

اس کے بعد شام کا وقت ہوا تو ان لوگوں نے اسے کھانا دیا، جس میں بھنا ہوا گوشت تھا، ویسے بھی جنگل میں جنگلیوں کا کھانے کا انحصار زیادہ تر جنگلی جانوروں پر ہوتا ہے کہ جنگلی بے شمار جانوروں کا شکار کرتے ہیں اور انہیں بھون کر کھاتے ہیں۔

ادھر رولو کا کے کارندے جنگل کے باہر پنڈت کی نگرانی کر رہے تھے اور پل پل کی خبریں رولو کا کو پہنچا رہے تھے۔

لیکن اندرونی طور پر پنڈت بہت زیادہ حال سے بے حال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگلیوں کا ویچ ڈاکٹر بہت زیادہ پہنچا ہوا ہوتا ہے، اگر ویچ ڈاکٹر نے آ کر جانچ لیا کہ یہ ایک آتما ہے جو کہ اب بھی بہت زیادہ شکتی شالی ہے تو نہیں ویچ ڈاکٹر قید نہ کر لے۔

لہٰذا وچ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے کوئی نہ کوئی اپائے ضرور کرنا پڑے گا، ابھی اس کے پاس مزید تین دن رہتے تھے کیونکہ چوتھے روز وچ ڈاکٹر نے آنا تھا۔

رات میں بوڑھے کے ساتھ بھی وہ بچوں کے بستر پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آنے والے حالات و واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔ دھیرے دھیرے رات گزرتی رہی اور صبح کے سفیدے نے سر ابھارا کہ اچانک ایک کہرام مچ گیا۔ ایک نوجوان کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ سانپ بہت ہی زیادہ زہریلا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان کا جسم نیلا پڑنے لگا۔ یہ دیکھ کر سارے جنگلی بدحواس ہوگئے کہ اب وہ کریں تو کیا کریں، کیونکہ ان کا سب سے زیادہ عقلمند اور پہنچا ہوا وچ ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ اور ویسے بھی ہر جگہ جنگلیوں میں وچ ڈاکٹر ہی ہوتا ہے جو کہ زیادہ عقلمند اور دانا گردانا جاتا ہے، وچ ڈاکٹر کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے، کوئی بھی وچ ڈاکٹر کی بات رد نہیں کرسکتا۔

چونکہ پنڈت کی آمد ابھی بہت پہنچی ہوئی تھی، وہ چٹکی بجاتے بہت کچھ کرسکتی تھی لیکن اگر وہ ظاہر ہوجاتی تو اس کے ساتھ برا ہوسکتا تھا۔

خیر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکے کے پاس تقریب آیا، لڑکے کی حالت وقت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ خراب ہورہی تھی، اور اگر فوری کوئی علاج نہ کیا جاتا تو لڑکا موت کے منہ میں چلا جاتا۔

اس نے اشارے سے بتایا کہ میں اس لڑکے کا علاج کرسکتا ہوں، آپ لوگ گھبرائیں نہیں اس کے اشارے کو دیکھ کر سب کے سب خوش ہوگئے کہ یہ لڑکے کی جان بچاسکتا ہے۔

اور اس نے اشارے سے ہی یہ بھی بتایا کہ میں چند منٹ میں حاضر ہوتا ہوں، اس کے بعد وہ جنگل میں ایک طرف کو بھاگتا ہوا چلا گیا۔ اس جگہ موجود سارے لوگ اسے جنگل میں جاتا دیکھتے رہے اور اپنے تئیں اپنے دیوتا سے دعا بھی کرتے رہے کہ لڑکا جلد از جلد ٹھیک ہوجائے۔

خیر چند منٹ ہی گزرے تھے کہ پنڈت تیزی سے آتے ہوئے نظر آیا، اس کے ہاتھ میں ایک عجیب طرح کی جڑی بوٹی تھی۔ وہ قریب آیا اور اشارے سے بتایا کہ اس بوٹی کو پتھر پر کچل کر اس کا رس نکالا جائے اور یہ رس لڑکے کو پلایا جائے۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق چشم زدن میں اس بوٹی کو پتھر پر کچل کر اس کا رس نکالا گیا اور لڑکے کے منہ میں ڈالا گیا۔ اس رس کا لڑکے کے حلق سے نیچے اترنا تھا کہ لڑکے نے الٹی کرنا شروع کردی۔

اب یہ حالت تھی کہ لڑکے کی الٹیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں، الٹی کرتے کرتے لڑکا بدحال ہوگیا اور پھر اس کی الٹیاں رک گئیں، تو پنڈت نے پھر اشارہ کیا کہ مزید بوٹی کا رس لڑکے کے منہ میں ڈالا جائے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا گیا۔

رس کا حلق کے نیچے جانا تھا کہ لڑکے نے دوبارہ الٹیاں شروع کردیں اور پھر ایک وقت آیا کہ لڑکا بے سدھ ہوکر رہ گیا۔

اب پنڈت نے اشارے سے بتایا کہ اب لڑکا خطرے سے باہر ہے۔ اس کے بعد آدھا گھنٹہ بعد لڑکا اٹھ کر بیٹھا تو لوگوں کی جان میں جان آئی، کیونکہ سانپ کا سارا زہر الٹی کے ذریعہ نکل چکا تھا۔ اس بوٹی نے سارا زہر الٹی کے ذریعہ باہر نکال دیا تھا اور زہر کی جگہ بوٹی کے رس نے لی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لڑکا بھلا چنگا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر ان جنگلیوں نے پنڈت کو کندھے پر اٹھالیا اور خوشی خوشی اس کی آؤ بھگت شروع کردی۔ کیونکہ پنڈت نے لڑکے کی جان بچالی تھی۔

پنڈت کے دل میں یہ بات بھی تھی کہ وچ ڈاکٹر کے آنے تک مجھے یہاں رکنا پڑے گا کیونکہ اگر میں جنگل کی حدود سے باہر نکلا تو دشمن کے کارندے یقیناً مجھے نقصان پہنچاسکتے ہیں وہ جان گیا تھا کہ دشمن کے کارندے کسی صورت بھی جنگل میں نہیں آسکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وچ ڈاکٹر مجھ سے زیادہ شکتی شالی نہ ہو۔ اور اس کا پتہ تو اسی صورت چلے گا جب وچ ڈاکٹر

سامنے آئے گا۔

خیر تین دن گزر گئے، ان تین دنوں میں پنڈت کی بہت زیادہ آؤ بھگت ہوتی رہی، چوتھے روز جنگلیوں کا وچ ڈاکٹر آگیا تو ان جنگلیوں نے اپنے وچ ڈاکٹر کا بہت والہانہ استقبال کیا۔ اور اپنے وچ ڈاکٹر سے پنڈت کے بارے میں نہ جانے کیا کیا بتایا۔

سب کی باتیں سن کر وچ ڈاکٹر پنڈت کی طرف بڑھا۔ اس وقت شام کے سائے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ اور ویسے بھی جنگل میں بہت جلد شام کے سائے پھیل جاتے ہیں چونکہ ہر طرف اونچے اونچے درخت ہوتے ہیں اور سورج کی کرنیں چنوں سے چھن کر نیچے نہ آتی ہیں۔

وچ ڈاکٹر، پنڈت کے قریب آیا اور پھر نہ جانے اس نے کونسی نوکیلی چیز پنڈت کی کمر میں اچانک چبھوئی اور ایسا کرنے سے پنڈت کے منہ سے بے خیالی میں نکلا۔ "ہائے..... ظالم نے ماردیا۔" آواز بلند تھی۔

پنڈت کو اچانک خیال آیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پنڈت کا راز فاش ہوچکا تھا۔

لوگ جان گئے تھے کہ پنڈت گونگا نہیں اور وہ وقت دور نہیں تھا کہ پنڈت کو وچ ڈاکٹر قید کرکے اپنا غلام بنالیتا، پنڈت نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور پلک جھپکتے ہی سانپ کا روپ دھار لیا اور تیزی سے جھاڑیوں میں رینگتا ہوا ان جنگلیوں کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ وچ ڈاکٹر بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

اب اپنی جان بچانے کی فکر پنڈت کو ہوگئی تھی کیونکہ وچ ڈاکٹر نے ایک جھٹکے سے اس کی پول پٹی کھول کر رکھ دی تھی۔

پنڈت تیزی سے سانپ کے روپ میں جنگل سے باہر نکل گیا کیونکہ اب وہ جنگل میں رہتا تو وچ ڈاکٹر کا علم پنڈت کو ڈھونڈ لیتا۔ پنڈت سمجھ گیا تھا کہ وچ ڈاکٹر مجھ سے کہیں زیادہ پہنچا ہوا ہے۔

ادھر رولوکا کے کارندے پنڈت کی تاک میں چوکس تھے کہ کب پنڈت جنگل کی حدود سے باہر نکلے اور وہ اس پر جھپٹ پڑیں۔

اور جب پنڈت جنگل کی حدود سے باہر نکلا تو اس کو پتہ چل گیا کہ دشمن کے کارندے اس کی تاک میں ہیں اور عنقریب اس پر جھپٹ پڑیں گے اور پھر جیسے ہی جاگتا الو اس کی طرف جھپٹا تو وہ آناً فاناً ایک بل میں گھس گیا، لیکن بل کے اندر جاتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس سے فاش غلطی سرزد ہوگئی ہے کیونکہ اگر بل کا منہ بند ہوگیا تو وہ بل میں گھٹ کر رہ جائے گا لہٰذا اس نے اپنے آپ کو گاڑھا دھوئیں میں تبدیل کرکے فوراً بل سے باہر کو نکل گیا اور تیزی سے ایک سمت بڑھا۔

اب وہ غائب حالت میں تھا۔

ادھر رولوکا نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا کہ "اب پنڈت کے بالکل قریب نہ رہو بلکہ اچھا خاصا فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرو اور اس پر کڑی نظر رکھو کیونکہ پنڈت جتنا زیادہ بلکان ہوکر تھک جائے گا اتنا ہی اس پر قابو پانا آسان ہوگا۔"

لہٰذا رولوکا کے کارندوں نے رولوکا کے اشارے کو مدنظر رکھتے ہوئے پنڈت کا پیچھا کرنا شروع کردیا لیکن اس کا خاص خیال رکھا کہ ان کے اور پنڈت کے درمیان فاصلہ کافی رہے۔

پنڈت کی آمد بہت زیادہ گھبرائی ہوئی بدحواس تھی، اسے پل پل دھڑکا لگ چکا تھا کہ کہیں میں دشمن کے شکنجے میں پھنس نہ جاؤں۔ پنڈت نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح چاروں طرف سے گھر کر رہ جاؤں گا۔

پنڈت آناً فاناً بھاگتا ہوا ہمالیہ کی ترائی میں پہنچ گیا اور پھر اس جگہ جب اسے جائے پناہ نہ ملی تو بغیر سوچے سمجھے ایک گپھا میں گھس گیا۔

گپھا کے اندر گھپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا مگر اس اندھیرے میں دو آنکھیں ایسی تھیں جو کہ دہکتی ہوئی انگارہ کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ان انگارہ برساتی آنکھوں کو دیکھ کر پنڈت مزید حواس باختہ ہوگیا، اب اس کے لئے نہ اگلتے بنتا تھا اور نہ ہی نگلتے، وہ

دونوں طرف سے بری طرح پھنس چکا تھا۔

کہ اتنے میں اس کی آواز بلند ہوئی۔ ”ناگ دیوتا مجھ پر دیا کرو، میری بپتا سنو! اور مجھے اس کشٹ سے بچالو، دکھن نے مجھے بلکان کر کے رکھ دیا ہے، اب پورے سنسار میں ایک تم ہی ہو جو مجھ پر دیا کر سکتے ہو، مجھے فوراً بچالو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں اور تم سے بنتی کرتا ہوں..... مجھ بیاکل پر دیا کرو۔“

اتنے میں گھما کے ایک کونے سے ایک کھر کھراتی اور کرخت آواز سنائی دی۔ ”مورکھ تو نے میری تپسیا میں بھنگ ڈال دیا، تو نے میرے گیان اور دھیان میں مل چل مچادی، میرے دل و دماغ اور سوچ کے تار کو جھنجھنا کے رکھ دیا، تو نے بغیر سوچے سمجھے اپنی شانتی کے لئے مجھے بیاکل کر کے رکھ دیا..... ارے مورکھ میں تو کرشن بھگوان کے چرنوں میں پڑا اپنے لئے آشیرواد مانگ رہا تھا کہ تو نے میرے دھیان کو کشٹ کر دیا۔

جہاں تک میرا گیان کہتا ہے کہ تو نے جیوت رہ کر بھی لوگوں کو بیاکل کئے رکھا..... لوگوں کو سکھ شانتی پہنچانے کے بجائے دکھ دیتا رہا..... اور خود اپنے من کی شانتی کے لئے دوسروں کو دھتکارتا رہا..... معصوم اور بھولے بھالے لوگوں کو ہر طرح سے کشٹ دیتا رہا..... اور اب خود سکھ شانتی کے لئے دیوتاؤں کو پکار رہا ہے، ارے دیوتاؤں کا تو وچار یہ ہوتا ہے کہ سنسار میں ہر طرف سکھ شانتی کا میلہ لگا رہے، منش خوش رہیں اور روکھی سوکھی کھا کر ایشور کے گن گاتے رہیں۔

مورکھ تو نے دیوتاؤں کا اپمان کیا..... اپنے علم اور گیان سے تو نے جو شکتی حاصل کی اس شکتی کے ذریعے تو نے غلط کام کئے اور رات کے اندھیرے میں کسی کی عزت کو عزت نہ سمجھا..... لوگوں کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کیا تھا۔ اب یہاں کیا لینے آ گیا ہے۔ جا چلا جا..... یہاں سے نکل جا..... تو نے دیوتاؤں کی دی ہوئی شکتی کو کھلواڑ سمجھا..... تو نے اچانک یہاں آ کر میرے گیان دھیان میں بھی مداخلت کر بیٹھا۔“

یہ سن کر پنڈت گڑگڑانے لگا۔ ”مہاراج مجھ پر دیا کریں..... مجھ سے بھول ہوگئی..... میں واقعی سزا کا مستحق ہوں..... میں آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ دیتا ہوں..... میں آپ کو کرشن بھگوان کا واسطہ دیتا ہوں..... میں ایشور کا واسطہ دیتا ہوں..... آپ مجھے دکھن سے بچالیں..... دکھن میرے پیچھے لگ گیا ہے..... آپ جو سزا دیں گے میں وہ بھگتنے کے لئے تیار ہوں مگر آپ کی بڑی کرپا ہوگی کہ مجھے دکھن سے بچالیں۔

مہاراج..... میں ناگ دیوتا کا سیوک رہا ہوں..... بس مجھ سے بھول ہوگئی..... اس بھول کی وجہ سے لگتا ہے ناگ دیوتا بھی مجھ سے ناراض ہیں..... میں لاکھ کوشش کر چکا ہوں..... میں ناگ دیوتا کو پکار پکار کر تھک چکا ہوں..... ناگ دیوتا کی طرف سے کوئی بھی سنوائی نہیں ہو رہی۔“

”چل تو دیوتاؤں اور ایشور کا واسطہ دے رہا ہے۔ تو میں تیرے لئے کوئی اپائے کرتا ہوں تاکہ تو بچا رہے..... ورنہ تیرا نشٹ ہونا نشچیت ہے، اور سن جب تک میں نہ بولوں اس وقت تک تو کچھا سے نکلنا نہیں..... اور یہ بھی سن لے کہ اگر میری اپنی پریشانی آڑے آ گئی تو میں تجھے چھوڑ دوں گا..... کیونکہ کبھی کبھی نیکی گلے پڑ جاتی ہے..... اور دوسروں کا بھلا کرنے والا آٹے میں گھن کی طرح پس جاتا ہے۔ آگے تیری قسمت کہ تجھے تیری کرنی کا کیا بھوگ ملتا ہے۔

تھوڑا سے تو اپنی جگہ خاموش رہ..... میں اپنے گیان دھیان سے کرشن بھگوان اور دیگر دیوتاؤں سے رابطہ کرتا ہوں، پھر تجھے بتلاتا ہوں۔“ اور اس کے بعد آواز آنا بند ہوگئی۔

پھر چند منٹ ہی گزرے تھے کہ گھما کے کونے سے آواز ابھری۔ ”گوپی چند..... میرا گیان تیرے چکروں میں آگے نہیں بڑھ رہا ہے..... اور یہ میرے ساتھ پہلی مرتبہ ہو رہا ہے..... میرا شکتی شالی دھیان سکڑ کر رہ گیا ہے..... میں نے بہت کوشش کی کہ میرا دھیان کرشن بھگوان یا پھر ناگ دیوتا کے پاس جائے مگر مجھے ناکامی ہوئی..... خیر تو نے دیوتاؤں کا واسطہ دیا ہے تو ایک راستہ

میں تجھے بتا رہا ہوں..... تو وہاں چلا جا..... ہوسکتا ہے کہ تیرے لئے کوئی اپائے نکل آئے..... وہیں سے میری بات سن اور بدھی میں باندھ لے۔

یہاں سے سندر بن جو کہ بنگال کے دکھن میں ہے..... اس جگہ تو چلا جا..... سندر بن میں کافی آگے جانے کے بعد ایک دلدلی علاقہ آئے گا..... تو اس دلدلی علاقے سے بھی آگے نکل جانا..... تو تجھے ایک کٹیا نظر آئے گی، اس کٹیا کے چاروں طرف بہت بڑے بڑے گیندے کے پودے لگے ہیں اور ان پر بڑے بڑے پھول کھلے ہوئے ہوں گے بس یہ گیندے کے پھول ہی اس کٹیا کے خاص پہچان ہیں۔

تو اس جگہ پہنچ کر سیدھا کٹیا کے اندر نہیں جانا بلکہ گیندے کے گیارہ پھول توڑ کر ان سے ایک مالا بنانا اور پھر اس پھول کی مالا کو اس کٹیا کے دروازے پر رکھ دینا..... دوسری صبح وہ پھول مرجھا جائیں گے..... یہ دیکھ کر پھر تو اور گیارہ پھول توڑنا اور ان پھولوں سے مالا بنا کر پھر اس کٹیا کے دروازے پر رکھ دینا..... دوسری صبح وہ پھول پھر مرجھا جائیں گے اس کے بعد پھر سے تو نے پھول توڑنے اور مالا بنا کر دروازے پر رکھنا ہے اس طرح تو نے پورے گیارہ دن ایسا کرنا ہے اور پھر بارہویں دن ان کٹیا کے اندر سے ایک بہت ہی خوفناک اجگر اپنی آنکھوں سے قہر برساتا نکلے گا اور پھر تجھ پر نظر پڑتے ہی..... اس کی آنکھوں سے شعلے نکل کر تیری طرف بڑھیں گے..... مگر تو گھبرانا نہیں۔ دراصل ایسا یوں ہوگا کہ تجھے ڈرا دھمکا کر اس جگہ سے بھگانا ہوگا..... جب تو نہیں ڈرے گا تو تھوڑی دیر بعد وہ اجگر ایک سادھو کا روپ دھارے گا، اور وہی اصل ہوگا۔

اس کے بعد وہ گیانی سادھو تجھ سے اصل مقصد پوچھے گا کہ تو اس جگہ آیا تو کیسے؟ اور تجھے اس جگہ کا پتہ کس نے بتایا..... تو میرا نام لینا کہ ”مہاراج رام پرشاد نے مجھے آپ کے چرنوں میں بھیجا ہے..... آپ مجھ پر دیا کریں اور مجھے دکھن سے بچالیں۔“

بس اب تو یہاں سے چلا جا کیونکہ میرا سے نشہ

ہو رہا ہے..... اور ایسا نہ ہو کہ تجھے وہاں تک پہنچنے میں دیر ہو جائے اور اگر دیر ہوگئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا دشمن تجھے راستے میں ہی خاتمہ کر دے۔“

خبر یہ سننے کے بعد پنڈت بچھا سے نکلا اور سر پر پاؤں رکھ کر سندر بن کی طرف اڑان بھرنے لگا۔ پنڈت کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی۔

لیکن اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار رولوکا کے کارندے تھے۔ پنڈت ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ رولوکا کے کارندوں نے اسے پھر سے بلکان کرنا شروع کر دیا اور آگے بڑھنے کا راستہ روک دیا..... کسی صورت بھی پنڈت اب آگے کو نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ پنڈت کے آگے ایک ایسی دیوار حائل ہوگئی تھی جو کہ دکھتی نہ تھی لیکن اپنی جگہ ٹھوس حالت میں موجود تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دیوار شیشے کی ہو۔ اس حالت کو بھانپ کر پنڈت آگے جانے کے بجائے پیچھے کو مڑا اور پھر بھاگتا ہوا سی کھیمے میں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔

اس کو پیچھے کو پلٹتا دیکھ کر جاگتے الو نے کچھ نہ کہا کیونکہ جاگتے الو کا اصل مقصد بھی پنڈت کو پریشان کرنا تھا۔ پنڈت کی آتما تیزی سے گھبا کے اندر سما گئی۔

جب وہ دوبارہ گھما میں حاضر ہوا تو اس وقت مہاراج رام پرشاد کا پارہ عروج پر تھا..... انہوں نے بہت ہی کرخت آواز میں دہاڑتے ہوئے کہا..... ”مورکھ تو پھر یہاں آ گیا..... میں نے تجھے منع کیا تھا کہ کسی صورت دوبارہ یہاں کا رخ نہ کرنا..... مگر تو نے دوبارہ یہاں آ کر..... برسوں کی میری تپسیا خاک میں ملادی..... ارے مورکھ تیرے جانے کے بعد میں نے پھر سے اپنا گیان وہیں سے شروع کر دیا تھا جہاں سے کہ میں نے آگے جانا تھا۔

تر نت تو یہاں سے نکل جا نہیں تو میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا..... اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ تیرا دشمن بھی یہاں تک پہنچ جائے..... ارے مورکھ تیرا دشمن تجھ سے کہیں زیادہ طاقتور ہے..... تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے دشمن کو کچھ معلوم نہیں..... وہ تیرے ایک ایک پل کی خبر

رکھ رہا ہے..... تو ترنت یہاں سے نکل اور کلکتہ چلا جا..... وہاں ناگ دیوتا کا بڑا مندر ہے..... وہاں جا کر اپنا ماتھا ناگ دیوتا کے چرنوں میں ٹیک دینا..... اور اپنی پتا گڑ گڑا کر بتانا..... مجھے امید ہے کہ اس جگہ ناگ دیوتا تجھ پر دیا کردیں گے یا پھر تجھے کوئی راستہ بتادیں گے..... اب تو زیادہ سے بربادنہ کر اور یہاں سے نکل جا..... نہیں تو ایسا نہ ہو جائے کہ میں تیرے ساتھ.....“ اور بات ادھوری رہ گئی۔

کیونکہ اچانک ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونجا میں سناٹی دیا..... جس سے پورا گھر لرز گیا تھا۔ دھماکے کی آواز سنتا تھا کہ پنڈٹ پر لرزہ طاری ہوگیا اور پھر تیزی سے وہ گھاسے نکل کر پچھم کی طرف اڑان بھرا۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس کے راستے میں اندیکھی ایک شیشے کی دیوار حائل ہوگئی..... یہ دیکھ کر وہ دائیں سمت کو مڑا..... مگر اس طرف بھی وہ دیوار حائل تھی..... پیچھے بھی ایسا ہی تھا..... اس کے بعد وہ بائیں سمت مڑا تو اس طرف دیوار نہیں تھی..... یہ دیکھ کر وہ خوش ہوگیا اور طوفان کی تیزی سے اسی سمت کو آگے بڑھنے لگا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا..... اس کے دل میں آگیا تھا کہ اب رکنا نہیں ہے..... چاہے کچھ بھی ہوجائے.....

رولوکا کے کارندے تو ویسے بھی اس کے پیچھے لگے پڑے تھے..... پنڈت جان گیا تھا کہ کہیں پر بھی رکنا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا..... اب اس نے اپنی رفتار کو مزید بڑھادیا تھا..... اور پھر آگے کو بڑھتے ہوئے وہ ایک جگہ پہنچ گیا۔

وہ ایک مندر تھا..... اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بلکہ ترنت اس مندر میں سما گیا..... اس مندر میں سماتا تھا کہ ترنت اس مندر کا دروازہ فوراً بند ہوگیا..... یہ دیکھ کر پنڈت کو شانتی ملی کچھ تو اپائے ہوا..... اور جب پنڈت کے ہوش ذرا ٹھکانے پر آئے تو، وہ یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہوگیا کیونکہ وہ مندر کوئی اور نہیں بلکہ شانتی پور کا ناگ مندر تھا۔

اب تو پنڈت پر لرزہ طاری ہوگیا..... وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دوبارہ وہ اسی مندر میں آجائے گا اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا..... یہ وہ جاننے سے قاصر تھا..... پھر اس کو خیال آیا کہ ”ہوسکتا ہے ناگ دیوتا نے میرے حق میں یہ اچھا فیصلہ کیا ہو۔“

مگر یہ کیا!!..... مندر میں موجود ناگ دیوتا کا مجسمہ تو فرش پر کئی ٹکڑوں میں پڑا تھا..... یہ دیکھ کر وہ بدحواس ہوگیا..... اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے..... اس کی سمجھ میں کسی صورت بھی نہیں آرہا تھا کہ ”ناگ دیوتا کا مجسمہ گر کر ٹوٹا کیسے.....؟“

اور یہ تو ناممکن تھا کہ خود بخود ناگ دیوتا کا مجسمہ گر کر ٹوٹ گیا ہو..... پنڈٹ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی..... لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کی حالت سنبھل کر نہیں دے رہی تھی..... اس نے فلک شگاف آواز نکالی..... ”ناگ دیوتا..... ناگ دیوتا میری سہائتا کرو..... ناگ دیوتا ترنت میری مدد کو آؤ..... ناگ دیوتا تمہارا سیوک کشٹ میں ہے..... ناگ دیوتا مجھ پر دیا کرو.....“

مگر اس وقت اس جگہ اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا..... اس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر اس کی ساعت سے ٹکراتی رہی..... اس کے دل میں یہ بات عیاں ہوگئی تھی کہ اب میرا بچنا ممکن نہیں..... ہر حال میں میرا خاتمہ ہو کر ہی رہے گا..... اب وہ سمجھ چکا تھا کہ اسے گیر گھار کر دوبارہ اس مندر میں لایا گیا ہے تاکہ وہ گھٹ گھٹ کر ختم ہوجائے۔

وہ ناگ دیوتا کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے پاس بیٹھ گیا..... اور ناگ دیوتا کے مجسمے کا ٹوٹا ہوا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

اتنے میں ایک بھاری اور کرخت آواز اس کی ساعت سے ٹکرائی..... ”پنڈت گوپی چند..... اب تو بتا کہ یہاں سے بھاگ کر کہاں جائے گا..... اب یہاں سے نکلنا تیرے بس کی بات نہیں..... کیا تو اب اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔“

(جاری ہے)

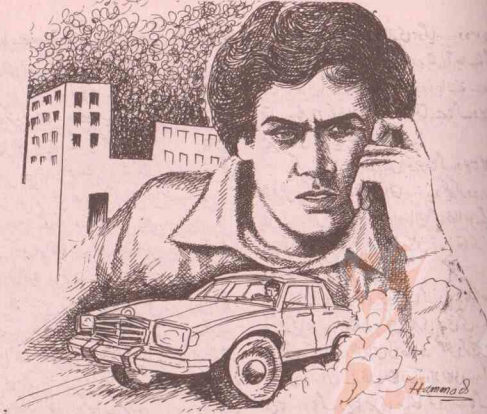

تصویر کا شاہکار

رفعت محمود۔ پنڈ ملہور اوپلنڈی

نوجوان موج مستی میں چلتا جارہا تھا کہ اچانک اسے پتا چلا کہ چند منٹ بعد اس کی موت واقع ہونے والی ہے، سارے شواہد موجود تھے کہ واقعی اس کی موت ہونے والی ہے کہ اچانک موت نے اس سے منہ موڑ لیا آخر کیوں.....

موت کے شکنجے میں تڑپتے ہوئے ایک نوجوان کی لرزہ براندام..... دل شکستہ کہانی

اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری زندگی کا سب سے عجیب و غریب دن ہے تو یہ حیرانی کی بات نہ ہوگی۔ بلکہ میں تو ابھی تک دریائے حیرت میں غرق ہوں۔ اسی لئے واقعات کہانی کی شکل میں لکھ رہا ہوں کہ ذہن میں ابھی تک ان کے نقوش ہیں۔ ویسے میں یہ کہہ دوں کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی بیتا ہے لیکن ابھی تک ذہن ان کو تسلیم نہیں کررہا ہے۔

میرا نام جمیل ہے اور میری عمر چالیس سال ہے، میری صحت قابل رشک ہے۔ تمام عمر میں کم ہی بیمار ہوا ہوں۔ میں یہ سب کچھ اس لئے بتارہا ہوں کہ اسے میرے کمزور ذہن کا شاخسانہ نہ سمجھ لیا جائے۔ پیشے کے لحاظ سے میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ میں تخلیقی مصور نہیں بلکہ کمرشل آرٹسٹ ہوں، اپنے فن سے میں بہت زیادہ تو نہیں کماتا لیکن کبھی بھوکا بھی نہیں رہا، کوئی آگے پیچھے

نہیں اور نہ مجھ پر بیوی بچوں کی کوئی ذمہ داری ہے اس لئے جو تھوڑا بہت کماتا ہوں، وہی میرے لئے بہت ہوتا ہے میں جب کام میں مصروف ہوتا ہوں تو مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ پسینہ جس تو کیا مجھے دوپہر کے کھانے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔

اس دن چار بجے میں نے اس تصویر کو مکمل کرنے کے بعد اس پر ایک نگاہ ڈالی تو میں نے اس میں کئی خامیاں محسوس کیں، میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں نے خود کو کبھی بھی تخلیقی مصور نہیں سمجھا لیکن میں اس تصویر کو اپنا ایک تخلیقی شاہکار قرار دینے کو تیار تھا۔

یہ تصویر ایک ایسے خونی مجرم کی تھی جس کو عدالت نے چند دن پہلے ہی موت کا حکم سنایا تھا۔ یہ مجرم بہت موٹا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے گوشت کی تہیں لٹک رہی تھیں جن کی وجہ سے اس کی گردن گوشت کے بہت بڑے لوتھڑے جیسی نظر آرہی تھی اس کے سر پر بال بالکل نہیں تھے اور کھوپڑی لشکارے مار رہی تھی۔ اس نے اپنی موٹی اور بھدی انگلیوں سے جیل کی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ نگاہیں سامنے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے لیکن اگر کسی چہرے سے مایوسی ناامیدی اور محرومی کے آثار عیاں ہو سکتے تھے تو وہ یہی چہرہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گوشت کے اس پہاڑ کو برقرار رکھنے والی قوت ہی ختم ہو گئی ہو۔

میں کافی دیر تک تصویر کو گھورتا رہا۔ گھورتے گھورتے مجھے ایسے لگا کہ جیسے تصویر کا منظر میرے ہاتھوں میں زندہ ہو گیا ہو اس حد تک کہ میں مجرم کے ڈوبتے دل کی مدھم ہوتی دھڑکنیں بھی سن سکتا تھا۔

میں نے تصویر اٹھائی اور گھر سے نکل پڑا۔ ایک اچھی تصویر کی تکمیل سے خوشی کی جس لہر نے جنم لیا تھا اس کی ترنگ میں، میں یونہی شہر سے باہر نکل آیا۔

جب شام کے سائے پھیلنے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ میں ایک ناموس علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ تاحد نگاہ خشک علاقہ تھا لیکن وہیں ایک مکان تھا جہاں پتھر سے ہتھوڑے کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ایک انجانی قوت میرے اندر سر ابھار رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے میری طرف پشت کئے ایک شخص سنگ مرمر کی سل پر کام کر رہا تھا۔

میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جیسے میرا دل رکتا ہوا محسوس ہوا۔ کیونکہ وہ میری تصویر والا شخص تھا۔ وہی گوشت کی تہیں لٹک رہی تھیں وہی گنجا سر جس پر اس وقت پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور وہی چہرہ اس وقت میرے سامنے تھا اس نے ایسے مسکرا کر مجھے دیکھا جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہم دوست ہوں۔ ”شہر میں بہت خراب موسم ہے یہ جگہ مجھے نخلستان نظر آتی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”نخلستان!“ وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ”اس گرمی نے تو جان نکال دی ہے۔ اس موسم میں بارش ہوتی تھی وہ بھی نہیں ہو رہی۔ اب تو۔“

”یہ سنگ مرمر کی سل تو بہت خوب صورت ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”واقعی یہ بہت خوبصورت ہے اس کی سطح کافی چکنی ہے۔ سب سے خاص چیز یہ ہے کہ اس میں خراشیں نہیں ہیں۔“

”اس کا کیا بنا رہے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے ہنس کر کہا۔ ”آپ شاید یقین نہ کریں۔ لیکن یہ کتبوں کی نمائش کے لئے ہے۔“

”کتبوں کی نمائش!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”جس طرح مصوری کی نمائش ہوتی ہیں۔ مجسموں کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہم سنگ ساز بھی قبر کے کتبوں کی نمائش کرتے ہیں۔ ایسے ایسے خوب صورت کتبے نظر آتے ہیں کہ دیکھ کے مرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور کیا پتھر گرمی اور سردی کی شدت برداشت کر سکتا ہے۔ اس پتھر پر کندہ کاری خوب صورت نظر آتی ہے اور کس طرح پتھر اپنی چمک برقرار رکھتا ہے۔“ وہ اپنے پتھروں کے

سچے موتی

☆ خوابوں کی تعبیر ضرور ڈھونڈو، مگر یہ نہ ہو کہ تعبیر ڈھونڈتے ڈھونڈتے تم خواب ہی کھو بیٹھو۔

☆ سچا دوست وہ ہے جو تمہارا پہلا آنسو دیکھے، دوسرا پونچھے اور تیسرے آنسو کو روک دے۔

☆ ڈوبتا سورج، بجھادینا فضا کو تاریک ضرور کرتے ہیں مگر تاریک رکھ نہیں سکتے۔

☆ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باہر سورج طلوع ہو رہا ہوتا ہے مگر ہمارے اندر اماوس کی تیرگی رچی ہوتی ہے۔

☆ جس کا کوئی نہیں، اس کا اللہ ہے اور جس اللہ ہے اس کا سب کچھ ہے۔

(ساحل دعا بخاری۔ محبوب شاہ)

بارے میں بولا۔

میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا، میرا ذہن الجھا الجھا سا تھا اس شخص سے ملاقات مجھے عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنے ذہن کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس شخص سے میں پہلے بھی مل چکا ہوں اور کسی وجہ سے اس کی شکل میرے ذہن میں رہ گئی ہو اور میں نے تصویر بنا ڈالی لیکن اس کے ساتھ یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ میں نے بغور دیکھے بھی اس کی تصویر بنا ڈالی ہے۔

وہ سیل کو الٹا کے اسے رگڑ رہا تھا۔ کافی دیر کے بعد اس نے کام ختم کیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ”اب یہ کام بھی ختم ہو گیا اور آپ اس کو دیکھیں۔“ میں پہلی بار اس تحریر کو دیکھ رہا تھا اس پر لکھا اور ایک شعر بھی لکھا ہوا تھا۔ لیکن میری نگاہیں، اپنے نام اور تاریخ وفات کو دیکھ رہی تھیں جو آج ہی کی تھی، میں خاموشی سے کتبے کو گھور رہا تھا اور وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ سردی کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ نام آپ کو کس نے بتایا تھا؟“ میں نے ایک دم پوچھا۔

”کسی نے بھی نہیں۔ مجھے کوئی نہ کوئی نام تو لکھنا ہی تھا۔ میرے ذہن میں یہی نام آیا تو میں نے اس کا کتبہ بنا دیا ہے کیوں کیا بات ہے؟“

”عجیب اتفاق ہے، یہ میرا نام ہے، پیدائش کی تاریخ بھی درست ہے اور.....“

”اور موت کی بھی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”موت کی.....!! اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”کمال ہے۔“ وہ حیرانی سے بولا۔

”اصل کمال تو یہ ہے۔“ میں نے تصویر اس کے سامنے کر دی۔

”اوہ خدایا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”ہو سکتا ہے تم نے مجھے پہلے کہیں دیکھا ہو؟“ وہ جیسے خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔

”اور ہو سکتا ہے تم نے کہیں سے میرا نام سن لیا ہو۔ میں ایک مصور ہوں۔“

مگر ہم دونوں ہی اپنے اپنے دل میں اسے جھوٹ سمجھ رہے تھے اور پھر ہم دونوں کی نگاہیں کتبے پر جا ٹھہریں۔ جس کی دو تاریخوں میں سے ایک درست تھی اور دوسری آج ہی کے دن کی تھی۔

تاریکی پھیل چکی تھی صرف ہمارے سروں پر ایک کمزور سا بلب ہلکی روشنی بکھیر رہا تھا۔

”اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہوں۔“ وہ جیسے کھویا کھویا سا بولا۔

”کیا تم نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا میں تمہیں.....“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میری زندگی امن اور سکون سے گزری ہے۔ کاروبار بھی برا نہیں ہے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تو میں نے مسجد کے لئے چندہ دیا تھا۔“

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ لیکن ہم دونوں کی نگاہ کتبہ پر ضرور مرکوز تھی اچانک وہ بولا۔ ”تم کہاں رہتے ہو؟“

”میں بوڑھی پل کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔“ میں

نے کہا۔

"یہ تو سرو بہ شریف سے کافی ہے۔" وہ سنجیدہ سا ہو کر بولا۔ "اگر تم گھر جاؤ تو اتنے لمبے راستے میں کئی طرح کے حادثات ہو سکتے ہیں، اس روڈ پر بسوں اور رکشہ والے اندھوں کی طرح چلاتے ہیں۔ کسی کیلئے کے چھلکے سے بھی پھسل سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" میں آہستہ سے بولا۔

"بہتر ہے کہ اس وقت کہیں نہ جاؤ۔" وہ بولا۔ "ادھر نیچے کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

"چلو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

نیچے کمرے سے مجھے بیل کاٹنے کی اور آری تیز کرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ میں جب نیچے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس شخص کی شکل بھی میری تصویر سے ملتی جلتی تھی۔ وہ بڑی بڑی سلیں آری سے کاٹ رہا تھا۔

"یہ..... یہ کون ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "یہ میرا ہم شکل بھائی ہے ایک عرصے سے میرے ساتھ ہی کام کر رہا ہے۔ اور ہاں تم اس ساتھ والے کمرے میں آرام کر لو تھک گئے ہو گے میں اوپر جا کر تھوڑا کام کر کے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔

"میں یہاں آتے ہوئے کافی تھک سا گیا تھا۔ فوراً اٹھ کر ساتھ والے کمرے کی طرف چل دیا۔ جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ دیواروں پر میری ہی تصویریں آویزاں تھیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

"جمیل تم آ گئے۔ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔" ایک تصویر کے پیچھے سے آواز آئی۔ "کئی سالوں سے میں تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔"

"کک..... کون ہو تم۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تمہاری تصویر کا شاہکار۔ وہ تصویر سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"اوہ! میرے خدایا۔" میں نے دل میں کہا۔ "یہ تو وہی تصویر والا شاہکار ہے۔ اب مجھے کچھ کچھ حقیقت سمجھ آ رہی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "تمہاری موت کا وقت قریب آ چکا ہے۔ آج ہی کے دن کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو پوری کر دوں گا۔"

اس کی باتیں سن کر میرے ہوش اڑ گئے، ذہن مفلوج سا ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ تصویر والا شاہکار ہاتھ میں تلوار لے کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھے اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ میں نے خدا کا نام لے کر آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی۔ جب میں تین بار آیت الکرسی پڑھ چکا تو میرے گرد ایک دودھیا روشنی کا حصار سا بن گیا اور تصویر والا شاہکار بھی ایک دم غائب ہو گیا۔

میں دروازہ کھول کر جب باہر نکلا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ ایک سناٹا چھایا ہوا تھا ہر طرف، میں جلدی سے وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور جب میں کافی دور آ گیا تو پیچھے سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"تم پہلے شخص ہو جو اس گھر سے بچ کر نکل گئے جو بھی یہاں آیا ہم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا..... ہا..... ہا..... ہا..... پھر کبھی تصویر نہ بنانا ورنہ پچھتاؤ گے۔" وہ آوازیں مجھے دور تک سنائی دیتی رہیں۔

جب میں گھر پہنچا تو پسینے سے میرا پورا جسم تر ہو چکا تھا، میں چارپائی پر ڈھیر ہو گیا، مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور جب دوسرے دن ہوش آیا تو بخار سے میرا جسم تپ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو ایک سو چار بخار تھا۔

سات دن بعد جب بخار نارمل ہوا تو میری جان میں جان آ گئی۔ گزرے ہوئے وہ خوفناک واقعات خواب لگنے لگے، میں جس کو بھی بتاتا وہ یقین نہیں کرتا۔ اب میں تصویریں نہیں بناتا بلکہ ایک سیلز مین ہوں، اس روز اگر میں آیت الکرسی نہ پڑھتا تو آج زندہ نہ ہوتا۔

انوکھا پیار

بلقیس خان۔ پشاور

دیکھتے ہی دیکھتے وہ روح ایک نسوانی وجود میں منتقل ہو گئی اس کی دلکشی اور حسن کی کرشمہ سازیاں قابل دید تھیں پھر وہ نوجوان سے گویا ہوئی کیا تم میری مدد کر سکتے ہو کیا تم مجھے اس حصار سے نکال سکتے ہو جس حصار میں میں مقید ہوں۔

ایک روح کی داستان جسے پڑھنے والے حیرت کے سمندر میں پڑ کر عش عش کر اٹھیں گے

شام کا موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہر طرف پھولوں کی مہک اور چاروں طرف ہریالی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو رہا تھا، میں اپنے گھر کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور موسم کے پر بہار نظاروں میں کھویا پڑا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے اس لڑکی پر پڑی جو مجھے روزانہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جگہ پر کھڑی ہوتی اس جگہ سے اٹھ کر بھی کبھی ادھر ادھر نہ ہلی ہوتی، کبھی بیٹھ جاتی کبھی ایک ہاتھ سر پر رکھتی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا چہرہ چھپا لیتی اور کبھی تو سر گھٹنوں پر رکھ کر جیسے بے آواز رونے کی کوشش کرتی اور کبھی کبھی اسی جگہ پر کھڑی ہو کر سر کو جھکا کر اور آنکھیں بند کر کے نہ جانے کس جہاں میں کھو جاتی۔

وہ ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔ جو صدیوں پرانا تھا اس کی شاخیں بہت زیادہ پھیل گئی تھیں اسی درخت

کے نیچے وہ دوشیزہ ہمیشہ سے موجود ہوتی کبھی روتی، کبھی ہنستی، کبھی مجھے دیکھتی، کبھی آسمان کو دیکھتی، کبھی اسی درخت کے گرد چکر لگاتی صرف دائرے کی صورت میں۔

جیسے کسی غیبی طاقت نے اسے زبردستی اس برگد کے درخت کے ساتھ مقید کردیا ہو، کبھی کبھی اسے دیکھ کر مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس کا معصوم چہرہ میرے دل کے دروازے پر دستک دینے لگتا مجھے بلاتا کہ میں اس کے پاس جاؤں اور اس کے آنسوؤں کو صاف کرکے اسے حوصلہ دوں اور اس کی پریشانی معلوم کروں۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد کم از کم ایک بار تو میں اسے ضرور دیکھتا جب بھی کھڑکی کھولتا، اسے دیکھ کر آنکھیں خیراں ہوجاتیں پھر کسی نہ کسی کام کی وجہ سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاتا۔ میں اکثر گھنٹوں اسے دیکھتا رہتا۔ اور سوچتا کہ کب جائے گی۔ تاکہ میں اس کے پیچھے پیچھے جاسکوں مگر وہ تو جیسے میرے صبر کا امتحان لیتی جب تک اسے دیکھتا وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی اور جب کبھی میں اپنے کام سے کہیں چلا جاتا اور واپس آجاتا تو وہ نہیں ہوتی، میں پھر گھنٹوں اس کا انتظار کرتا مگر بے سود، وہ نہیں دکھتی۔

آج بھی وہ اپنی مخصوص جگہ بیٹھی تھی، سر گھٹنوں پر رکھے جیسے بے آواز رو رہی ہو۔ کپڑے بدل لئے تھے کل اسے گلابی رنگ کے کپڑوں میں دیکھا تھا۔ آج سفید لمبی فراک زیب تن کئے ہوئے تھی سفید دوپٹہ شانوں پر ڈالا ہوا تھا۔ اس کے لمبے کالے بال، پشت پر کھلے بکھرے پڑے تھے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے پاس جاؤں اور اس سے اس کی بے چینی اور بے تابی کی وجہ پوچھوں! مگر ڈرتھا کہ کہیں برا نہ مان جائے اور پھر نظر نہ آئے اور اسی خوف سے مجھے ڈر لگا تھا۔

لیکن آج میرے دل کو بے کلی سی ہوئی تھی کیونکہ شام کے سائے بہت گہرے ہوچکے تھے مگر آج وہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے رات کی سیاہی میں تبدیل ہوگئے۔

میں نے ہمت کی اور گھر سے نکل کر اس درخت کی طرف جانے لگا وہ اب بھی اسی برگد کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی روئے جارہی تھی۔

مجھے حیرانی ہورہی تھی کہ یہ اس ویران جگہ میں اکیلی بیٹھی رو کیوں رہی ہے اب میں بالکل اس کے سامنے تھا۔ میں اس سے چند قدم دور کھڑا اس کی ہچکیاں سن رہا تھا۔

"سنیے! آپ کیوں رو رہی ہیں؟ دیکھیں رات گہری ہورہی ہے گھر چلی جائیں۔"

میں نے اس دوشیزہ سے کہا۔ وہ بڑی معصوم اور سیدھی سادھی دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ کو کیا، آپ کو میرے رونے سے کیا، آپ ہوتے کون ہیں، کوئی روئے کوئی ہنسے آپ کو اس سے کیا! میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں۔ جائیں چلے جائیں اپنے گھر! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں!" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں کو دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان خطا ہوگئے دل کو کچھ ہونے لگا، دوبارہ سے وہ سسکنے لگی۔

"خدا کے لئے روئیں تو نہیں پلیز! مجھے بتائیں آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔"

"آپ کیا مدد کریں گے! اتنے دنوں سے دیکھ رہے ہیں کس غرض سے، کبھی سوچا نہیں کہ کسی انجان کو بھی مدد کی ضرورت ہوسکتی ہے۔"

اس کا شکوہ بجا تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر دوسرے اندازے لگا رہا تھا۔ اور وہ میری مدد کی طلب گار تھی۔

"دیکھئے مجھے الہام تو نہیں ہوتا کہ آپ کو مدد کی ضرورت ہے ورنہ میں آپ کی مدد کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ میں مانتا ہوں، مسئلے مسائل دکھ دیتے ہیں مگر ہر مشکل کا حل بھی ہوتا ہے آپ بالکل بھی نہ گھبرائیں کھل کر بتائیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟"

"کیا آپ واقعی میری مدد کریں گے۔" اس نے پرامید نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں بالکل! نہ صرف میں تمہاری مدد کروں گا بلکہ مشکل وقت میں تمہارا ساتھ بھی دوں گا۔ مگر پہلے یہ رونا دھونا تو بند کردو۔"

"صاحب کہیں حقیقت جاننے کے بعد آپ اپنا فیصلہ تو تبدیل نہیں کردیں گے۔" اس کے لہجے میں لرزش تھی۔

"بالکل بھی نہیں میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ یہ رکن لیں کہ میں ایک رو ن ہوں۔"

اس کی بات سن کر بے ساختہ میری اپنی روح سیرا ہم چھوڑنے کے لئے پر تولنے لگی اور میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر جیسے بجلی کا زبردست کرنٹ بھی لگنا محسوس ہوا۔

"یعنی تم بھوت ہو!" میں بمشکل بولا۔

"ہاں، ایک مظلوم بھوت بھی مجھے کہہ سکتے ہیں، ابھی بھی بتادیں کہ آپ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کررہے۔"

"نن..... نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ مگر دماغ کہہ رہا تھا۔ "احمقانہ حماقت ہے یہاں سے، کیوں بھلا بھوتوں میں پھنس رہے ہو۔" مگر میں اپنے اس پاگل دل کا کیا کرتا جو اس لڑکی کے لئے دیوانہ ہوئے جارہا تھا۔

"جی کہئے، اب آپ کھل کر بتاسکتی ہیں میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں اور ہر صورت میں آپ کی مدد کروں گا۔"

میری بات سن کر وہ مسکرادی اور پھر کہنے لگی۔ "آپ کو میں حقیقت شروع سے بتاتی ہوں۔

میرا نام صبا ہے، سب لوگ پیار سے مجھے پھول کہتے تھے۔ میں نے BA کیا تھا میری والدہ میرے بچپن میں ہی جہان فانی سے کوچ کرگئی تھی اس وقت میں صرف چار سال کی تھی۔ والد محترم نے میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ کئی لڑکیاں ان پر فدا تھیں۔ مگر والد صاحب مجھ پر سوتیلی ماں کا سایہ پڑنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے وہ میرے لئے ماں، باپ دونوں بن گئے تھے میں ان کی لڑکی تھی۔ بچپن سے ہی مجھے پھول، کہتے لگے تھے میں ان کی ایسی لڑکی جس میں ان کی جان تھی۔ بچپن گزر تا رہا اور گزر گیا۔

ابو نے میری ہر خواہش پوری کرنا جیسے خود پر فرض کرلیا تھا، بے انتہا لاڈ پیار کی وجہ سے میں بگڑی نہیں اور میری کوشش ہوتی تھی کہ میری ذات سے ابو کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔

اکثر میں اداس رہتی۔ گھر میں کوئی بہن بھائی نہیں تھا سو تنہائی کی عادی ہوگئی تھی۔ ان دنوں میں میٹرک میں تھی ہمیشہ سوچا کرتی۔ "کاش امی بے وقت دنیا سے نہ جاتیں تو میرے بہت سے بہن بھائی ہوتے کتنا اچھا ہوتا۔"

مگر ابو نے ہمیشہ صبر، اور حوصلے سے آگے بڑھنا سکھایا۔ اس لئے رب کی رضا پر راضی رہی۔

اس طرح دن پر دن گزر کر سالوں بیت گئے، میں نے گریجویشن کرلیا، ابو اپنا کاروبار سنبھالے ہوئے تھے ہمارا گھر اپنا تھا۔ خوبصورت ڈیزائن سے بنا ہوا بینک میں بھی بہت سارے پیسے تھے، کوئی کمی تنگی نہیں تھی۔ ہمارا گھرانہ اچھے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا کہ اچانک ابو کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ وہ اپنی گڑیا کو دلہن بنا کر رخصت کرنا چاہتے تھے، یہ خواہش اپنی زندگی میں وہ پوری کرنا چاہتے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ میری شادی جلد سے جلد ہوجائے۔

اور میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ شادی کے بعد ابو اکیلے رہ جاتے مگر ابو کسی طور پر نہیں مان رہے تھے، ان دنوں میرے ڈھیر سارے رشتے بھی آرہے تھے کچھ رشتے بہت اچھے تھے مگر لوگ پرائے تھے، ابو میری شادی، اپنوں میں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ابو کہتے تھے کہ "پرائے اگر تمہیں کاٹ بھی دیں تو کشتی ندی، نالے میں پھینکے گے اور اپنے کاٹیں گے تو اچھی جگہ میں پھینکے گے۔"

ابو کی ایک کزن تھی جو رشتے میں میری پھوپھو لگتی تھی اور انہوں نے بیٹے کے لئے مجھے مانگ لیا۔ پھوپھو کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اور تین بیٹیاں تھیں، بڑی دو کی شادی ہوچکی تھی بیٹے سے چھوٹی "چاندنی" تھی بیٹے کا نام احتشام تھا۔

ابو اس رشتے پر دل وجان سے راضی تھے، سو انہوں نے پھوپھو کو ہاں کہنے میں دیر نہیں کی۔

پھپھو خوشی خوشی پھولے نہ سمارہی تھیں محلے بھر میں ڈھیر ساری مٹھائی تقسیم کی۔ اور دھوم دھام سے میری منگنی اشتام سے کردی۔

منگنی کے بعد جب میں نے اشتام کو دیکھا تو اسے بس دیکھتی رہ گئی وہ بالکل کسی شہزادے سے زیادہ حسین وجمیل تھا۔ اس کے سلکی بال کندھے تک آرہے تھے سفید دودھیا رنگت کا مالک تھا اس کے چہرے پر ایک داغ بھی نہیں تھا شہد رنگ حسین اور بڑی آنکھیں تھیں لمبے ڈیل ڈول کا مالک تھا اپنی قسمت پر جیسے مجھے رشک ہونے لگا۔

منگنی کے بعد اشتام نے مجھے موبائل گفٹ کیا میں بہت خوش ہوئی اب اکثر ہم دونوں باہر ملنے لگے۔ میں اس سے دل وجان سے محبت کرنے لگی تھی۔

پیار سے میں اسے شام کہنے لگی۔ وہ مجھے پھول کہتا تھا اس کا کہنا تھا کہ "پھول چاہے کچھ بھی ہوجائے میں زندگی میں کبھی بھی تمہیں کوئی دکھ نہیں دوں گا۔"

ہم کبھی لونگ ڈرائیو پر چلے جاتے کبھی ہوٹلنگ کرتے، مگر شام بہت شریف تھا ہم دوستوں کی طرح رہتے، کبھی اس نے غلط حرکت کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں، ہم مستقبل کی خوشیوں کے لئے اکثر منصوبہ بندی کرتے۔

پھپھو نے ابو پر زور دینا شروع کردیا کہ بیٹی کو اتنا جہیز دو کہ سب لوگ منہ میں انگلیاں داب کر حیران رہ جائیں۔

پھپھو کے مطالبات جہیز کے نام پر بڑھتے ہی چلے جارہے تھے انہوں نے جہیز کے نام پر گاڑی بھی مانگ لی۔

ابو نے ساری عمر کی جمع پونجی نکالی اور جہیز کے نام پر وہ سب کچھ خرید جو پھپھو کہتی رہیں۔

ابو نے مجھے جہیز کے نام پر اتنا کچھ دیا کہ پھپھو کا پورا گھر، ان چیزوں سے بھر گیا، میری شادی اتنی دھوم دھام سے کی کہ ابو نے اپنی ہر خواہش پوری کی اور پھپھو نے تمام غیر ضروری رسمیں، کہیں نکاح کے وقت ابو نے اپنا گھر بھی میرے نام کردیا۔

نئے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، اشتام بہت پیار کرنے والے شوہر ثابت ہوئے جبکہ ساس، اور نندیں میرے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کردیتی تھیں، مجھے کسی بھی کام کی اجازت نہیں دیتی تھیں جیسے میں اس گھر میں راج کماری بن کر گئی تھی۔

شادی کے بعد ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ابو وڈ ایکسیڈنٹ میں زندگی ہار بیٹھے۔

میری تو جیسے زندگی ویران ہوگئی تھی مگر اشتام نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میں اکثر ابو کو یاد کر کے روتی رہتی تھی کیونکہ ماں بچپن میں چھوڑ کر چلی گئی تھی خیر اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔

اچانک ساس اور چھوٹی نند جائیداد کا رویہ میرے ساتھ بدل گیا وہ دونوں بات بات پر ٹوکنے لگی اور اگر میں ان کے ٹوکنے پر رونے لگتی تو دونوں مجھے منحوس کہتیں، اب مجھے نوکرانی بنا کر رکھ دیا پہلے کسی کام کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھیں اب کہتیں۔ "بہت دن عیش سے گزار لئے اب سارے گھر کے کام کی تمہاری ذمہ داری ہے۔

میں دن رات نوکرانی کی طرح کام کرتی، اشتام رات کو تھکے ہارے آتے وہ مجھ سے پہلے جیسا بھرپور توجہ چاہتے تھے مگر میں کام کر کے خود بلکان ہوجاتی اس لئے ان کے آنے سے پہلے ہی سوجاتی، چاندنی اور پھپھو اشتام کے کان بھرنے لگیں، مجھ پر جھوٹے الزامات لگانے لگیں کہ میں پھپھو کو نوکرانی سمجھتی ہوں اور گھر کا سارا کام پھپھو سے کروائی ہوں، چاندنی سے بھی ہتک آمیز سلوک کرتی ہوں اور بار بار جہیز کا نام لیتی ہوں کہ میں بہت زیادہ جہیز لائی ہوں۔

میں بیوی تھی وہ ماں تھی اس کا پلڑا بھاری تھا کب تک اشتام برداشت کرتے۔ آخر کار وہ بھی مجھ سے متنفر ہوگئے ہم دونوں میں لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے ہمارے درمیان پیار دم توڑنے لگا اشتام کی دونوں بڑی بہنیں بھی

گھر آگئیں وہ دونوں شادی شدہ تھیں چند دن کے لئے آئی تھیں۔

جو بڑی بہن تھی وہ بالکل ماں کی پرتو تھی اس کو دیکھ کر لگا تھا کہ کسی منصوبے کے تحت آئی ہے۔

ایک روز کی بات ہے اشتام کام پر گئے تھے وہ اپنا بیگ کررہے تھے، کمرے میں پھپھو اور ان کی تینوں بیٹیاں موجود تھیں اور کھسر پھسر کررہی تھیں۔

ان دنوں میں تحقیق کے عمل سے گزر رہی تھی پھپھو کی غار نکلی میرے اس حالت کے پیش نظر بھی مجھ سے کام کروالی رہتی چاندنی نے میرے سارے زیورات اٹھا لئے پڑے، مجھ سے لے لئے سارا میک اپ کا سامان بھی چھین لیا۔

اشتام مجھے سنورے دیکھنا چاہتے تھے مگر ان کی ماں بہنیں کوئی انوکھا کھیل کھیلنا چاہتی تھیں۔

اس روز میں صفائی کرتی ہوئی کچن میں آگئی رات کے جھوٹے برتن پڑے تھے وہ دھونے لگی میں کمزور تو بہت ہوگئی تھی کچھ ابو کے بے وقت مرنے کا غم تھا کچھ ان لوگوں کا بے جا تسلط تھا، اشتام کا بدلہ ہوا روپ بھی میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔

اچانک میری ساس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"نیلم!" کیوں نہ صبا کو جلا دیا جائے اس کے مرنے کے بعد سب کچھ ہمارا ہی تو ہوگا۔ ہم اشتام کی دوسری شادی بہت دولت مند گھرانے میں کروادیں گے۔ دولت بھی بہت ہوجائے گی اور ہمارے گھر میں مزید نئی بیٹیاں بھی آجائیں گی۔" پھپھو کی آواز سن کر میں کانپ اٹھی۔

نیلم، اشتام کی بڑی بہن تھی، اس کے بعد پلوشہ تھی پھر اشتام تھے اور آخر میں چاندنی تھی۔

"اماں، خدا کا خوف کرو، کیوں اس معصوم کو مارنے کی باتیں کررہی ہو۔ یہ ظلم ہوگا، میں تم لوگوں کے کھیل میں قطعی شریک نہیں ہوسکتی۔" پلوشہ بولی۔

"پلوشہ تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو اس نحوست کو ہم نے بہت برداشت کرلیا اب اس منحوسے بہانی کو ہم کیوں مزید کھلائیں پلائیں۔

چاندنی پلوشہ کی بات سے قطعی رضامند نہیں تھی۔

پلوشہ تو کم عقل ہے اماں ٹھیک کہتی ہے بس صبا کو جلادیں گے اور کہیں گے کہ کچن میں آگ لگنے سے اس کی موت واقع ہوگئی پھر شام کی دوسری دولت مند بیوی لے آئیں گے۔" نیلم نے چاندنی کی حمایت کی۔

"دیکھو، تم سب ایسا کچھ نہیں کروگی۔" ورنہ میں ناراض ہوکر کبھی اس گھر میں دوبارہ قدم نہیں رکھوں گی، اماں آپ کی بھی تین بیٹیاں ہیں آخر ہم سے کسی کو بھی یہ سانحہ پیش آئے، تب کیا کروگی۔ خدا بھی اس ظلم پر خاموش نہیں ہوگا۔" پلوشہ نے تیز لہجے میں کہا۔

پلوشہ کی بات سن کر نیلم غصے میں دہاڑتے ہوئے بولی۔ "پلوشہ تو خاموش رہ تو اچھا ہے ورنہ۔" اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پلوشہ، تو جو بھی کہہ لے ہم نے فیصلہ کرلیا ہے صبا جلے گی، اور آج ہی جلے گی یہ ہمارا فیصلہ ہے۔" پھپھو نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

پھپھو کی بات سن کر میرے ہاتھ سے کانچ کا برتن چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ چونکہ کچن کمرے کے دیوار کے ساتھ تھا اس لئے برتن گرنے کی آواز پھپھو اور ان کی بیٹیوں نے بھی سنی۔

پھپھو غصے سے کمرے سے باہر نکلی نیلم اور چاندنی اس کے پیچھے آئی۔

"حرام خورنی چھپ چھپ کر باتیں سنتی ہے۔ دیکھ اس کم بخت کو اس کمینی نے ساری باتیں سن لی ہیں اگر یہ بچ گئی تو ہماری خیر نہیں۔"

پھپھو نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور مجھے مارنے لگی۔

"امی خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیں میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔"

اماں اس ڈائن کو چھوڑ نا گر یہ بچ گئی تو ضرور شام بھیا کو سب کچھ بتائے گی۔" نیلم نے پیٹرول کا کین

اٹھا کر کہا۔ اور مجھ پر چیخنے لگی۔

پلوشہ باجی پلیز مجھے بچائیں یہ تو ظلم کی انتہا کر رہی ہیں، میں اغشام کے بچے کی ماں بننے والی ہوں یہ دو زندگیوں کو ختم کر رہی ہیں۔" میں رونے لگی روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

پلوشہ مجھے بچانے کے لئے آگے بڑھی مگر نیلم نے اسے دھکا دے کر کچن سے باہر نکال دیا اور فوراً ماچس کی تیلی جلا کر مجھے آگ لگادی اور پھر وہ تینوں جلدی سے کچن سے نکل گئیں۔

اور یہی نہیں بلکہ کچن کا دروازہ بند کر دیا میں چیختی رہی چلاتی رہی مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

مرتے وقت میں نے قسم کھائی کہ میں اپنا انتقام ضرور لوں گی میں دوبارہ آؤں گی اور تب تک نہیں جاؤں گی جب تک اپنا انتقام نہ پورا کرلوں۔"

میری موت بڑی بھیانک ہوئی تھی میں پوری طرح سے جل گئی تھی میری شناخت تک نہیں ہو رہی تھی۔

اغشام کو میری موت کا بہت دکھ تھا کیونکہ میں جیسی بھی تھی ان کی محبت تھی میری موت کو حادثے کا رنگ دے کر وہ ماں بیٹیاں مطمئن ہو گئیں۔

اپنی موت کے بعد سب کچھ میں اپنی آنکھوں دیکھ رہی تھی۔

پھپھو نے پلوشہ کے سامنے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اسے حقیقت بتانے سے منع کر دیا اس کو قسمیں دی گئیں۔

مگر جاتے جاتے پلوشہ نے کہا تھا۔"میں تو خاموش ہو گئی ہوں مگر اللہ اس کا بدلہ ضرور لے گا۔ تم لوگ ظالم ہو اور میں آئندہ کبھی بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ بہو کے ساتھ ساتھ بیٹی بھی مر گئی تمہاری۔"

پلوشہ کی باتیں سن کر نیلم اور چاندنی نے منہ بنائے اس واقعہ کا ذکر دوسرے دن اخبارات میں بھی آیا تھا سرخی تھی۔

"گیس پائپ لیک ہونے کی وجہ سے جواں سال عورت جل کر مر گئی۔"

جب میری میت کو دفنا دیا گیا تب میری روح بری طرح سے بے چین ہو گئی میری بے چینی جنون میں بدلنے لگی اور میں انتقام کی آگ میں جلنے لگی۔

میرے چہلم کے بعد، میں نیلم کے گھر گئی اس کے تین بچے تھے مگر اس دن وہ گھر میں اکیلی تھی بچے اسکول گئے تھے شوہر کام پر جا چکا تھا۔ میں نے بھی اسے آگ لگادی۔

نیلم بری طرح جل گئی۔ مگر اس کی سانس نہیں نکلی وہ اسپتال پہنچی، پھپھو وغیرہ اس کی عیادت کر رہی تھیں مگر پلوشہ اسپتال نہیں آئی تھی۔

نیلم نے پھپھو کو بتایا "صبا نے اسے آگ لگائی تھی۔"

میں بھی اسپتال میں تھی اس کو نفرت نہیں آ رہی تھی جب میں نے صرف نیلم پر خود کو آشکار کیا تب وہ جلے وجود کے ساتھ چیخنے چلانے لگی تو میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلہ دبا دیا۔ بڑی سخت جان تھی مرنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، مرتے وقت اس نے اپنا گلہ پکڑا تھا۔ اور جیسے خود سے دہرا رہی تھی نیلم نے پھپھو کو بتایا کہ صبا میرا گلہ دبا رہی ہے اور پھر نیلم بھی مر گئی۔

اگلا نمبر چاندنی کا تھا مگر پھپھو بڑی تیز نکلی اس نے ایک کالے جادو کرنے والے کا پتہ معلوم کر لیا اور نیلم کی میت دفنانے کے بعد اس جادوگر سے ملنے چلی گئی۔

اس جادوگر کا نام شنکر تھا، پھپھو نے جادوگر کو ساری بات بتائی تو شنکر نے رات ہی رات میں گندہ عمل کر کے مجھے اسی برگد کے درخت کے حدود میں قید کر دیا۔

میں جادوئی حصار میں بندھ کر رہ گئی، اب میں اس حصار سے باہر نہیں جا سکتی۔"

میں نے اس درخت کے تنے سے نیچے دیکھا تو بہت غور و فکر کے بعد وہاں پر کالے رنگ کی راکھ اور چونے سے کیا ہوا ایک حصار نظر آیا یہ حصار ایک نظر دیکھنے پر معلوم نہیں ہوتا تھا اور وہ لڑکی اس حصار میں قید ہو گئی تھی۔

اب مجھے سمجھ آیا کہ یہ لڑکی مجھے ہمیشہ اس درخت کے پاس ایک ہی حدود میں کیوں دکھائی دیتی تھی۔

دنیا بھر سے معیاری کہانیوں کا انتخاب

ڈائجسٹ
فکشن
ماہنامہ کراچی

جس میں نامور قلم کاروں کی تحریر کردہ سچی، معیاری، ایکشن، سسپنس، جاسوسی، سراغ رسانی، جرم و سزا، محبت و نفرت اور دیگر موضوعات پر دلچسپ اچھوتی تحریریں شامل ہیں۔

اگر آپ بھی کوئی اچھی تحریر فکشن ڈائجسٹ میں لکھنا چاہتے ہیں تو جلد از جلد ارسال کریں۔

بہت جلد آپ کے قریبی بک اسٹال پر دستیاب ہوگا — قیمت -/50 روپے

خط و کتابت — ڈائجسٹ فکشن ماہنامہ کراچی — رابطہ: شاہد علی

نورانی آرکیڈ میزانائن فلور رتن تلاؤ نمبر 3، کراچی فون: 021-32744391

"مگر تم تو ایک روح ہو! کیا روحیں انتقام لے سکتی ہیں۔؟ میں نے تو سنا ہے کہ روحیں وجود نہیں رکھتیں وہ کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔" میں نے کہا۔

"مگر کچھ روحیں اپنی پوشیدہ طاقت کے بل بوتے پر انتقام لینے پر قادر ہوتی ہیں۔ تم یہ باتیں چھوڑو مجھے اس حصار سے باہر نکال دو۔ میرا دل جل رہا ہے انتقام لینے کی خاطر میں جنونی ہوگئی ہوں کیا اب بھی تم میری مدد نہیں کرو گے؟" صبا نے پرامید نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں کروں گا مگر تم اس دنیا سے چلی کیوں نہیں جاتی، تم پر ظلم ہوا ہے مگر ضروری تو نہیں کہ تم بھی ظالم بن جاؤ۔"

"احتشام! تم نہیں جانتے میں دوسری صبا نہیں بننا چاہتی پھپھو وغیرہ شام کی دوسری شادی اس لئے کررہی ہیں کہ وہ دوسری بیوی کی جائیداد ہڑپ کرلیں اور بعد میں اس کو بھی بچن میں جلادیں۔ تم پر یہ سب نہیں گزرا اس لئے تم ایسا کہہ رہے ہو پلیز! تم مجھے کسی طرح بھی اس حصار سے باہر نکال دو اپنا انتقام لینے کے بعد میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی مرتے وقت میں نے یہی دعا کی تھی۔

"مگر مجھے تو کوئی جادو نہیں آتا کہ اس جادوئی حصار کو ختم کردوں۔ تم مجھے بتاؤ مجھے کرنا کیا ہوگا؟" میں نے حامی بھر کر کہا۔

صبا نیں کر بولی۔ "ارے کسی عامل سے ملو اور اس سے معلوم کرو کہ حصار کیسے ختم ہوگا جب حصار ختم ہوجائے گا تو باقی سب کچھ میں خود کرلوں گی۔" اور یہ بول کر میری طرف پرامید نظروں سے دیکھتی ہوئی غائب ہوگئی۔

دوسرے دن میں ایک عامل سے ملا۔ میں نے اس عامل کو تمام حقیقت سے آگاہ کیا پہلے تو وہ نہ مانا مگر میرے بہت اصرار کے بعد اور کچھ رقم دینے پر مان گیا، عامل نے مجھے حصار ختم کرنے کا طریقہ بھی بتادیا تو میں گھر واپس آ گیا۔

نہ جانے کیوں مجھے اس روح سے دلی ہمدردی ہونے لگی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ مجھے شروع دن سے اچھی لگتی تھی اور میں اس سے بے پناہ متاثر ہوگیا تھا۔ میں اس کی سادگی اور معصومیت سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ ہر وقت وہ میرے خیالوں میں رہنے لگی تھی۔"

مگر وہ تو ایک روح ہے مجھے وہ کیسے ملے گی کاش! وہ زندہ ہوتی۔ تو میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرلیتا۔" مگر اب ایسا ممکن نہیں تھا مگر پھر بھی میں اسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا اور اسی لئے میں اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔

رات ہوتے ہی میں اس جگہ چلا گیا وہ اپنی جگہ میری منتظر تھی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی نجانے کب سے میرا انتظار کررہی تھی آج اس کی آنکھوں میں، مجھے امید کی کرن نظر آرہی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر بے تابی سے بولی۔ "کیا ہوا احتشام؟"

"کیا تم کسی عامل سے ملے؟ کیا حصار ختم کرنے کا عمل تم نے ڈھونڈ لیا؟ کیا کہا عامل نے؟" اس کے لگاتار سوالوں پر میں مسکرانے لگا۔

پھر وہ بے چینی سے بولی۔ "بتاؤ کیا ہوا؟"

عامل نے مجھے جو باتیں بتائی تھیں میں نے اسے بتائی اور یہ بھی بتایا کہ "میں تمہارا حصار ختم کرسکتا ہوں۔"

یہ سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئی۔ پھر میں نے عامل کے بتائے ہوئے طریقے سے وہ حصار مٹادیا پھر اس راکھ اور چونے پر عامل کا دیا ہوا عمل والا دودھ گرادیا، دودھ جیسے ہی حصار سے ٹکرایا تو بدبو سی پھیل گئی اس کے بعد حصار کی لکیروں پر دودھیا روشنی پھیلی پھر ختم ہوگئی۔

حصار کے ختم ہوتے ہی صبا اڑتی ہوئی ہوا میں معلق ہوگئی اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی خوشی کا اظہار اس کے انگ انگ سے ظاہر ہورہا تھا۔

"صبا نیچے آؤ۔ میں تمہیں خوش دیکھ کر بہت خوش ہوں۔" میں نے کہا۔

صبا میرے پاس آ کر ٹھہر گئی اب وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ "میں بہت خوش ہوں، احتشام دنیا میں

اچھے لوگوں کی کمی نہیں، اس لئے تو دنیا موجود ہے۔ میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی، آج کل کے زمانے میں کوئی انہوں کے لئے اتنا کچھ نہیں کرتا اور تم نے مجھ پرائی کے لئے اتنا کچھ کیا جسے تم پرایا بھی نہیں سکتے۔" وہ بولی۔

"تم پرائی نہیں ہو، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، دل سے تمہیں اپنا مانا ہے تم تو مجھے دلی طور پر پسند ہو کاش! کہ تم زندہ ہوتی تو میں ساری زندگی تمہیں پیار کرتا، تمہاری ہر خواہش پوری کرتا، مجھے تم سے لگاؤ ہوگیا ہے۔" میں اپنے آپ پر حیران تھا کہ میں کیا بولے جارہا ہوں۔

میری باتیں سن کر وہ مسکرانے لگی پھر بولی۔ "کیسی باتیں کررہے ہو میں تو ایک روح ہوں۔ تم روح سے کیوں پیار کررہے ہو؟ دنیا میں بہت ساری لڑکیاں ہیں کسی نہ کسی سے دل لگالو، اچھا میرا جانے کا وقت ہورہا ہے میں چلتی ہوں پھر ملوں گی اور ہاں اب تم کو جب بھی میری ضرورت ہو میرا تصور کرنا اور تین بار منہ ہی منہ میں میرا نام لینا، میں حاضر ہوجاؤں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور غائب ہوگئی۔

میں حیران پریشان اسی جگہ موجود رہا پھر گھر چلا آیا اپنے کمرے کی کھڑکی بند کردی میں اب میں کیوں دیکھوں اس کھڑکی سے کیونکہ اب اس جگہ صبا نظر نہیں آئے گی۔

اگلے دن، جب میں کام سے گھر آیا تو صبا پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھی، مجھے دیکھ کر خوشی سے بولی۔ "احتشام میں تمہارا ہی انتظار کررہی تھی۔"

"واہ بھئی ..... بہت خوب..... میرا انتظار کررہی تھی، گھر والوں نے تمہیں دیکھا تو نہیں۔"

"میں تمہارے سوا کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ صرف تم واحد انسان ہو جسے میں نظر آتی ہوں۔"

آج وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی بے ساختہ میں نے پوچھ لیا۔ "صبا کیا بات ہے؟ کیوں اتنی خوش لگ رہی ہو۔"

"احتشام، میں نے آج چاندنی کو آگ میں جھلسا کر مار دیا وہ بری طرح جل مری! میں نے اسے مار دیا تم وہ واحد انسان ہو جس سے میں یہ خوشی شیئر کررہی ہوں۔" وہ چہکنے لگی۔

"صبا۔ تم نے اسے کیسے مار دیا؟" میں خوف سے کانپ کر بولا۔

"ارے بہت آسانی سے، میں شام کے گھر گئی پھپھو کہیں گئی تھی باندی گھر میں اکیلی تھی میں گھر میں گھومتی پھرتی کچن میں آ گئی، کچن میں موجود چاندنی فلمی گانا گا رہی تھی۔

میں تیری روح میں شامل ہوں
میں تیرے پیار میں مدغم ہوں

ابھی وہ یہ فضیلات گا ہی رہی تھی کہ میں اس کے سامنے ظاہر ہوگئی مجھے سامنے دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی اکھڑتے ہوئے بولی۔

"تت..... تت..... تم..... تم تو مر چکی تھی۔"

میں اسے ہلاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوگئی پھر میں بولی۔

"چاندنی بی بی میں تو مر گئی، مگر اب تمہاری باری ہے میں تم لوگوں سے اپنا انتقام لینے آ گئی ہوں پلوشہ باجی نے صحیح کہا تھا کہ ابھی اس ظلم پر خاموش نہیں رہے گا۔ اب میں تمہیں جلا کر خاکستر کردوں گی۔"

"صبا باجی مجھے مت مارو ہم سے بھول ہوگئی مجھے معاف کردو۔" وہ گڑگڑانے لگی۔

"کیسے معاف کردوں میرے ساتھ ساتھ تم سب میرے نومولود بچے کی بھی قاتل ہو۔ کیا تم لوگوں نے مجھے معاف کردیا تھا حالانکہ میں نے تو کوئی گناہ بھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے اسے آگ لگادی وہ مرنے سے پہلے چیخیں چلاتی رہی مجھ سے معافیاں مانگتی رہی مگر میں نے اسے جلا کر خاکستر کردیا، کل کا اخبار دیکھ لینا چاندنی کی خاکستر قصبہ پارہ کے بیچ و بیچ پر شائع کی گئی ہوگی۔"

"صبا تم نے اچھا نہیں کیا تم اپنا انتقام خدا پر چھوڑتی تو بھی عالم بن رہی ہو۔"

صبا کی باتیں سن کر مجھے بہت دکھ ہورہا تھا اور میں

سوچ رہا تھا۔ ”کاش! کہ اس کو اس حصار سے آزاد نہ کرواتا۔“

”نہیں یہ سب ایسا ہونا تھا، یہ تو ہے ناں کہ خون کا بدلہ خون، ورنہ میں کیسے کسی سے انتقام لے سکتی، کتنے لوگوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے کتنے بے گناہ ہر روز مرتے ہیں۔ ظالم جب ظلم کرتے ہیں تو وہ کیوں احکام خداوندی بھول جاتے ہیں اور جب خود پر ظلم ہوتا ہے تو گڑگڑاتے اور معافی مانگنے لگتے ہیں۔ ظالموں کو کیفر کردار تک ضرور پہنچنا چاہیے۔“ وہ بولی۔

صبا کی بات سن کر میرے بے قرار دل کو تھوڑی بہت تسلی ملی۔

”ٹھیک ہے صبا اب تم کیا کرو گی کیا ساری رات اس جگہ رہو گی۔“

”نہیں، آج میں شام سے ملنے جاؤں گی، اسے سب کچھ بتاؤں گی ان کے گھر کا ماتم دیکھوں گی پھر پھپھو کے لئے فیصلہ کروں گی کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔“

صبا کی خوشی دیکھ کر، میں جیسے ہر غم سے آزاد ہو گیا تھا کئی گھنٹوں تک وہ مجھ سے ہمکلام رہی جب رات کے بارہ بج گئے تب وہ چلی گئی۔

البتہ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی کیونکہ اب مجھے ایک ہی بات ستا رہی تھی کہ ”انتقام لینے کے بعد صبا اس دنیا سے چلی جائے گی تب میرا کیا ہو گا۔“ انہی سوچوں میں الجھ کر میں سو گیا۔

صبح نہا دھو کر آفس چلا گیا شام کو بائیک دوڑاتا ہوا واپس تھکا ہارا گھر آ گیا، گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں آ گیا دیکھا تو کمرے میں صبا پہلے سے موجود تھی۔

اسے دیکھ کر، میری ساری تھکن اتر گئی، صبا بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کی مسکراہٹ بڑی دل کش تھی۔

”صبا کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بکل رات میں پھپھو کے گھر گئی تھی بارہ بجے جب میں وہاں پہنچی تو وہ لوگ جاگے ہوئے تھے اور چاندنی کی موت کا ماتم کر رہے تھے۔

پلوشہ بھی آئی ہوئی تھی پھپھو پلوشہ اور شام تینوں ایک ہی کمرے میں تھے پھپھو بین کر رہی تھی آنسوؤں کے رخسار پر بہہ رہے تھے۔

چاندنی کو دفنا چکے تھے شام بہت کمزور ہو چکا ہے وہ زیادہ پریشان نظر آیا خیر میں انتظار کرنے لگی۔ کب شام اپنے کمرے میں جائے گا تا کہ میں اس سے بات کر سکوں دوسرے رشتہ دار بھی الگ الگ کمروں میں موجود تھے میں نے سب کو دیکھ لیا تھا سارے رشتہ دار تھکے ہارے نیند کی وادی میں بے سدھ ہو کر سو گئے۔

”پلوشہ باجی ایک دم بولی۔“ بس کرو اماں یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے نہ تم کسی پر ظلم کرتی نہ یہ سانحات ہوتے۔“ پھپھو حیرت سے پلوشہ کو دیکھنے لگی احتشام جو پریشان بیٹھا تھا سیدھا ہو گیا۔

”پلوشہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ احتشام حیرت سے بولے۔

احتشام بھیا ان سب کی ذمہ دار اماں ہے، شام بھیا اگر اب بھی میں خاموش رہی تب میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں مرحوم کی اب تو نیلم باجی اور چاندنی بھی نہیں رہی۔ اماں میں نے کبھی تھا کہ ”یہ ظلم نہ کر ورنہ آپ تو فرعون بن گئی تھیں، اپنی من مانی کرلی۔“ پلوشہ رو رہی تھی کہہ رہی تھی۔

پھپھو حیرت سے پلوشہ کو دیکھ رہی تھی جبکہ احتشام کچھ بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔ ”پلوشہ تم صاف صاف کو کیا کہہ رہی ہو؟ میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ احتشام الجھ کر بولے۔

”احتشام بھائی، میں سب بتاتی ہوں، کہ نیلم اور چاندنی کی موت جلنے سے کیوں ہوئی مگر پہلے آپ کچھ کھائیں کہ کچھ الٹا سیدھا اس وقت نہیں کریں گے گھر میں مہمان ہیں۔“

پھر پلوشہ نے خود احتشام کو ساری بات بتائی جسے سن کر احتشام سسک پڑے۔

احتشام بھائی میرا ضمیر مطمئن نہیں تھا اماں نے مجھے قسمیں دے کر چپ کرایا تھا، اس لئے خاموش تھی مگر اب جب میری بیٹیں نہیں رہیں بھابھی جل گئی گھر کا شیرازہ بکھر گیا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ اس لئے سب بکواس دیا۔“

”اماں آپ کو کیا ملا یہ سب کر کے! کون سا کون حاصل ہوا آپ کو بتائیے! صبا سے پہلے مجھے متنفر کیا پھر اس سے مجھے دور کرنے کی سازش کی وہ ماں بھی نہ رہی مگر آپ پر تو لالچ طاری تھا چیزیں چاہئے تھی آپ کو چیزیں مل گئیں آپ اپنے سکھوں سے محروم ہو گئیں نہ بیٹیاں رہیں نہ بیٹا رہے گا، میں آپ کے ساتھ اپنی باقی زندگی ہرگز نہیں گزاروں گا جس کو صرف دولت کی ہوس ہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ اماں اولاد سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہے مگر آپ کیسی ماں ہیں؟ آپ نے تو اپنی اولاد کی خوشیاں چھین لیں۔ آپ نے نیلم کو تباہ کیا اس کے بچے رل گئے شوہر آوارہ گردی کرنے پر مجبور ہو گیا کل دوسری عورت سے شادی کر کے بچوں کو ساری زندگی خوار کرے گا، میری زندگی کی خوشیاں چھین لیں مجھ سے میرا پیار چھین لیا کسو بلدا دیا جس سے میں اپنی زندگی سے زیادہ پیار کرتا تھا میرا ہونے والا بچہ مار دیا۔ تم ماں ہو یا ڈائن، جو اپنے بچوں کی خوشیاں کھا گئی۔

”تانیں خاموش کیوں ہیں آپ؟“ احتشام چیخا! پھپھو، جیسے بت بن گئی تھی، نہ کچھ بول رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ بالکل گم سم ہو گئی تھی۔

”احتشام بھیا میں اس لئے نیلم کی موت پر نہیں آئی تھی کہ میں ان سب سے ناراض تھی ہم کسی کو کرگئی تھی کہ آئندہ بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی مگر میں حالات کو برداشت نہ کر سکی۔ اگر کرنے کی کوشش کرتی تو مر جاتی۔ دم گھٹ جاتا میرا۔“

”پلوشہ تم نے بہت اچھا کیا، جو مجھے بتا دیا کم از کم میں بے خبر تو نہیں رہا۔ ورنہ میں ساری زندگی صبا کو غلط سمجھتا اماں نے تو، مجھے مکمل طور پر صبا کے خلاف کر دیا تھا جسے میں پھول کہتا تھا اسی کو سل دیا۔

اماں، تمہیں چیزیں مل گئیں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس شہر سے ہی جا رہا ہوں۔ اتنا کم ظرف تو نہیں ہوں کہ تم جیسی ظالم سنگ دل کے ساتھ رہ سکوں۔“ احتشام بے تحاشہ رو رہا تھا، وہ ہچکیاں لیتا ہوا اٹھ گیا۔

پھپھو جو بت بنی بیٹھی تھی ایک دم اس میں حرکت ہوئی وہ احتشام کے پیروں میں گر گئی اس کے پیروں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ”میرے جگر کے ٹکڑے، میرے چاند مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو مجھ سے بھول ہو گئی، میں غلطی پر تھی۔ خطاوار ہوں میں مر جاؤں گی۔“

احتشام نے نفی میں سر ہلایا اور پھپھو کے ہاتھوں سے اپنے پیروں کو آزاد کرالیا، وہ کمرے سے باہر نکل گیا پھپھو اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی مگر وہ کمرے سے نکل گیا، پلوشہ خود بھی موٹے موٹے آنسو بہا رہی تھی۔

”احتشام چلا گیا میرے جگر کا ٹکڑا چلا گیا مجھے چھوڑ کر، اندھیرا کر گیا میری زندگی کو۔“

وہ بین کرنے لگی۔ ”ارے میرا شام مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر چلا گیا۔“

پھپھو بے تحاشہ رو رہی تھی پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پلوشہ کو مارنا شروع کر دیا اسے اتنا مارا کہ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔

پلوشہ، کسی ردعمل کا اظہار نہیں کر رہی تھی وہ بے بسی سے ماں کو دیکھ رہی تھی جس کا متاع ایک لمحے میں لٹ چکی تھی، جس کا سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ اب وہ اتنی بے بس تھی کہ پچھتاوے کا غم غلط نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد پھپھو کا ذہنی توازن کھو گیا اس نے خود کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز اتنی اونچی ہو گئی کہ سارے مہمان جو سوئے تھے وہ جاگ گئے اور اس کے کمرے میں آ گئے۔

پھپھو شام کی جدائی اور بیٹیوں کی موت پر دورو کر پاگل ہو گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

”یہ سب میرے کرموں کا پھل ہے، میرے

گناہوں کی سزا مجھے مل گئی، میں نے اپنی نیک سیرت بہو کو دولت کی لالچ میں ماردیا اسے جلادیا اسی کے بدلے میری خوشیاں خاک میں مل گئی ہیں سب کچھ برباد ہوگیا۔ میری اولاد مجھ سے دور ہوگئی میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ مجھ جیسی عورت کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔"

پھپھو پہلے زور زور سے رونے لگی پھر قہقہے لگا کر ہنسنے لگی پھپھو کے قہقہے اتنے بلند تھے کہ محلے دار بھی جاگ گئے وہ سب حیران تھے۔

سارے مہمان اور محلے والے توبہ توبہ کررہے تھے کہ بہو کے ساتھ ظلم کرنے کا بھیانک انجام ہوا۔ ساری رات پھپھو کبھی ہنستی کبھی روتی کبھی خود کو مارنے لگتی۔

پھپھو کے پاگل پن، اور ذہنی توازن کھونے کے بعد، میں نے اسے معاف کردیا۔ میں نے عبرت کے لئے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ میں بہت خوش ہوں میرا انتقام پورا ہوچکا ہے میں نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔"

صبا چپ ہوگئی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ دل کو قرار مل گیا تھا سب کچھ ٹھیک تھا۔

"صبا کیا اب تم چلی جاؤ گی؟" میں بے چین ہوکر پوچھ بیٹھا!

"ہاں اس دنیا سے چلی جاؤں گی، کیونکہ اب میں مزید اس دنیا میں نہیں رہ سکتی۔"

"مگر صبا میرا کیا ہوگا۔" میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو کاش! تم زندہ ہوتی۔ میں ہمیشہ تم کو یاد رکھوں گا، صبا جاتے جاتے مجھ پر ایک احسان کرنا، اپنی قبر کا پتہ مجھے دو میں کبھی کبھی تمہاری قبر پر آیا کروں گا۔

"اٹھ شام، تم بہت اچھے ہو۔ صبا نے مجھے اپنی قبر کا پتہ بتادیا۔ اور پھر مجھ سے دور جانے کے لئے اجازت مانگ لی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اسے خالی نظروں سے دیکھنے لگا اور وہ افسردہ ہوکر غائب ہوگئی۔

رات کے بارہ بجے سے اوپر کا وقت ہوچکا تھا اچانک کمرے کا دروازہ زور زور سے بجنے لگا ڈر کے مارے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا دروازہ کھولا تو سامنے بھائی جان امی اور ندا کھڑے تھے امی نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کردیا۔

"امی میرا قصور تو بتائیں، آپ خفا کیوں ہورہی ہیں؟" میں نے کہا۔

"ارے تم کیا باؤلے ہوگئے ہو رات بھر خود سے باتیں کرتے رہتے ہو کیا پاگل ہوئے ہو۔" امی اور ندا، ایک ساتھ بولیں۔

"نہیں امی، دراصل، کچھ بھی نہیں بس میں خواب میں بول رہا تھا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے! امی اس کی شادی کردیں ارسلان بھی شادی سے پہلے خواب میں بولنے لگے تھے" بھابھی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

میں نے سب کو بڑی مشکلوں سے کمرے سے نکالا اور دروازہ بند کردیا امی بھابھی کے کہنے پر راضی ہوگئیں اور میری شادی کے لئے زور دینے لگیں مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا بس صبا کی چند نظموں کی ملاقات کے سہارے جینا چاہتا تھا۔ مگر ایک رات صبا میرے خواب میں آئی اور مجھ سے بہت ناراض تھی۔ بولی۔ "اری کا بہانہ لو ورنہ میں ساری زندگی تم سے ناراض رہوں گی کبھی تمہارے خواب میں نہیں آؤں گی۔"

میں نے شادی کے لئے حامی بھرلی۔ میری شادی دھوم دھام سے ہوگئی، کئی سال گزر چکے ہیں میرے دو بچے ہیں اکثر میں صبا کی قبر پر جاتا ہوں اور فاتحہ پڑھتا ہوں اگربتیاں جلاتا ہوں اور اس کے سکون کے لئے دعائیں مانگتا ہوں۔

"صبا کبھی کبھی خواب میں آجاتی ہے بہت خوش ہے۔ پتہ نہیں شام کہاں ہے، میں کبھی اس سے نہیں ملا اگر مجھے کبھی ملا تو میں اس سے ضرور کہوں گا کہ جس کی تم نے زندگی میں قدر نہ کی، مرنے کے بعد میں اس سے محبت کرنے لگا۔"

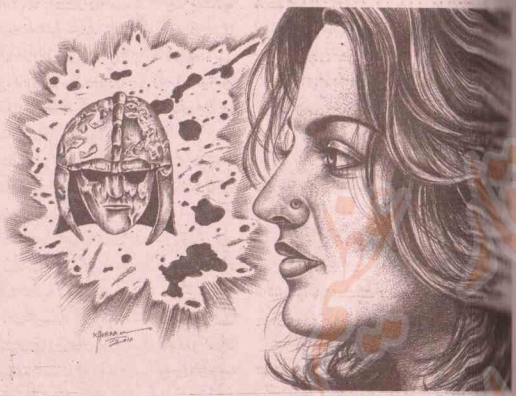

معاہدہ

ایس حبیب خان۔ کراچی

زرق برق لباس اور زیور سے سجی سنوری دلھن مسہری پر براجمان تھی کہ اچانک وہ اوپر کو اٹھنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں معلق ہوگئی اور پھر مجسم وہ چکرانے لگی اس درمیان اس کی کرخت کھرکھراتی آواز سنائی دی کہ.....

کیا انہ یکھی مخلوق بھی اپنے وعدے کی پابند ہوتی ہے، حقیقت جاننے کیلئے کہانی پڑھنا نہ بھولئے گا

سفید چادر بچھے تخت پر بیگم قمر جہاں دراز تھیں اور ملازمہ آہستہ آہستہ ان کے پیر دبا رہی تھی، جبکہ دوسری ملازمہ چاندی کا پان دان لئے پان لگا رہی تھی اس تے پان میں زعفران اور الائچی رگھی اور گلوری بنا کر چاندی کی تھالی میں سجائی اور بیگم قمر جہاں کو پیش کردی۔

"حامد میاں نہیں آئے ابھی تک؟" بیگم قمر جہاں نے گلوری منہ میں رکھتے ہوئے ملازمہ سے سوال کیا۔

"جی وہ آج پچھلے جمعے کا کام ختم کرنا ہے تاکہ کل سے سجاوٹ شروع ہوسکے۔ اس لئے وہ آج نہیں آئے۔" ملازمہ نے ادب سے جواب دیا۔

نواب اشرف علی کا شمار لکھنؤ کے اعلیٰ نوابوں میں ہوتا تھا۔ ان کا گھرانہ انتہائی شریف، نیک اور غریب پرور تھا، ان کی جاگیر میں رہنے والوں کو کبھی کوئی تکلیف نہ ہوئی، اور اللہ نے انہیں شریک حیات بھی ایسی ہی

دی۔ ان کی زوجہ بیگم قمر جہاں پرہیز گار اور باوقار خاتون تھیں اور دونوں نے اپنی اولاد کی بھی اعلیٰ تربیت کی اور کبھی کسی اولاد نے ان دونوں کا سر جھکنے نہیں دیا۔

نواب اشرف علی کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا اکبر علی، وقار علی اور چھوٹے محسن علی، انہوں نے دونوں بڑے بیٹوں کا فرض تو اپنی زندگی میں ہی ادا کر دیا تھا۔ مگر محسن علی جوں کہ اپنے بھائی وقار علی سے دس سال چھوٹے تھے اس لئے ان کی شادی میں وقت تھا۔ مگر زندگی نے نواب اشرف علی کو مہلت نہ دی کہ وہ اپنے آخری صاحبزادے کی خوشیاں اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

نواب اشرف علی کے چلے جانے کے بعد بیگم قمر جہاں، نواب اشرف علی کے کئے گئے فیصلوں اور اصولوں کو لے کر ہی آگے بڑھیں اور تمام چیزوں کو ویسے ہی چلایا جیسے نواب اشرف علی کی زندگی میں ہوتا تھا۔ وقت آگے بڑھتا رہا اور نواب اشرف علی کو گزرے دس برس گزر گئے۔ بیگم قمر جہاں نے اب اپنے آخری صاحبزادے کے فرض سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کا انتخاب تھا ان کے اپنے بھائی مصیب مرزا کی صاحبزادی "مہ جبیں" مہ جبیں کچھ نکھار ہونے کے ساتھ بے حد خوب صورت بھی تھی، اس کی شخصیت میں سب سے خوب صورت اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں تھیں جو گھنیری پلکوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے چل رہی تھیں۔

"امی حضور! تشریف لے چلئے، دسترخوان لگ چکا ہے۔" بڑی بہو کوہر بیگم نے آہستہ سے قمر جہاں سے کہا۔ جو تسبیح پڑھتے پڑھتے جانے کب سو گئی تھیں۔ بیگم قمر جہاں اٹھیں اور گوہر بیگم انہیں لے گئیں۔ دسترخوان پر سب انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ بیگم قمر جہاں کے بیٹھتے ہی چھوٹی بہو آسیہ بیگم نے جلدی سے چاندی کی رکابی میں قورمہ نکالا اور ادب سے ان کے آگے رکھ دیا۔ اکبر علی نے پانی بھر کر ان کی جانب بڑھا کر کہا۔ "لیجئے امی حضور! آپ یقیناً کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی پانی پئیں گئیں۔" تو بیگم قمر جہاں نے مسکرا کر ہونٹوں سے پانی کا کٹورا لگا لیا۔

"امی حضور! یہ پلاؤ بھی نوش فرمایئے۔" گوہر بیگم نے بڑے پیار سے ان کی جانب رکابی بڑھاتے ہوئے کہا تو بیگم قمر جہاں کے ہونٹوں سے اپنے تمام بچوں کے لئے دعائیں نکلیں وہ ایسے اولاد کے لئے اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھیں۔ جو بڑوں کا ادب کرتی تھی۔

"بہو بیگم آپ نے غریبوں میں تقسیم ہونے والے سامان کو دیکھ لیا؟ کسی چیز کی کمی نہ ہو، اس بات کا خاص خیال رہے!" انہوں نے تاکید کی۔

"امی حضور! آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے فہرست بنالی ہے اور میں ایک مرتبہ پھر دیکھتی ہوں۔" گوہر بیگم نے ادب سے کہا۔

ویسے تو نواب اشرف علی کے زمانے سے ہی ہر روز حویلی میں غریبوں کے لئے دسترخوان لگایا تھا جو آج تک جاری تھا۔ مگر شادی بیاہ کے موقع پر خاص اہتمام ہوتا تھا۔

"امی حضور! بڑی بچی جان آ گئی ہیں۔" آسیہ بیگم نے آ کر قمر جہاں کو اطلاع دی۔ بیگم قمر جہاں کے چہرے پر بے اختیار خوشی آ گئی۔

رابعہ بیگم، نواب اشرف علی کے چھوٹے بھائی کی بیگم اور قمر جہاں کی دیورانی تھیں۔ وہ بریلی میں رہتی تھیں۔

"کیسی ہو رابعہ؟" بیگم قمر جہاں نے گرم جوشی سے گلے لگتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"اللہ کا بڑا کرم ہے! بھابھی جان!" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حشمت علی نظر نہیں آ رہے؟" بیگم قمر جہاں نے ان کے بیٹے کے بارے میں سوال کیا۔

"وہ پرسوں تک آئیں گے، کام کے سلسلے میں بریلی ہی میں ٹھہر گئے ہیں۔"

"بہو بیگم اور پوتے کو تو لائی ہیں یا وہ بھی پرسوں ہی آئیں گے۔"

"ہاں! وہ لوگ میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔ کمرے میں سامان رکھوا رہے ہیں۔" رابعہ بیگم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ حامد میاں کہاں گئے؟" وقار علی نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مزدور سامان لئے انتظار میں کھڑے تھے۔ وقار علی نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر مزدوروں سے بولے۔ "اچھا آپ میرے ساتھ آیئے! یہ سامان ابھی حویلی کے پیچھے رکھ دیں، حامد میاں آ کر خود دیکھ لیں گے۔"

حامد میاں حویلی میں برسوں سے کام کر رہے تھے۔ نواب اشرف علی کے والد کے دور سے وہ ساتھ تھے۔ حویلی کے تمام انتظامات وہی کرتے تھے، ان کی حیثیت حویلی کے فرد کی سی تھی۔ مزدور سامان لے کر حویلی کے پیچھے آئے تو سامنے موجود نیم کے گھنے درخت کی شاخ سامان میں الجھ گئی۔ "بڑے صاحب اس کا کیا کریں؟"

وقار علی نے سوچا پھر کلہاڑی منگوا کر اس شاخ کو چھانٹنے کے لئے کہا۔ مزدور نے کلہاڑی شاخ پر ماری تو ایک سنہرا سانپ مزدور کے اوپر آ گرا اور اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ مزدور کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نواب وقار علی نے آگے بڑھ کر سانپ کو پکڑ کر زمین پر دے مارا، سنہرا سانپ بھاگنے کے بجائے پھن اٹھائے غصے سے پھنکارنے لگا۔

وقار علی نے درخت کی ایک سیدھی اور موٹی لکڑی لے کر سانپ کی طرف بڑھے اور پھر سانپ پر پل پڑے۔ اور پھر سانپ کا بھرکس نکال دیا۔ سانپ تھوڑی دیر تڑپا اور پھر مر گیا۔ وقار علی نے مزدوروں سے سامان رکھنے کا کہا اتنے میں حامد میاں آ گئے۔ وقار علی کو دوسرے شہر جانا تھا اس لئے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا، بیگم قمر جہاں کی آنکھ شور سے کھل گئی۔ آواز کمرے کی چھت میں سے آ رہی تھی لگ رہا تھا کہ بھاری سامان ادھر ادھر رکھا جا رہا ہے وہ کچھ دیر جاگتی رہیں، شاید ملازم کچھ رکھ رہے ہوں، مگر جب ان کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ چونک گئیں۔ "اتنی رات کو کون کام کر رہا ہے؟" پھر وہ آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ اب بیگم قمر جہاں کمرے سے باہر آئیں۔ انہوں نے ملازموں کو آواز دی۔ اکبر علی بھی ان کی آواز سن کر آ گئے۔ "کیا بات ہے امی حضور!"

"بیٹا میرے کمرے کی چھت پر کوئی پتھر پھینک رہا ہے، دیکھو کون ہے؟"

"کہیں پڑوس میں سے کوئی بچہ تو شرارت نہیں کر رہا؟" ایک ملازم بیچ میں بولا۔

"اس وقت کون بچہ ہوگا؟" اکبر علی بولے۔ "خیر ہم دیکھتے ہیں۔" اکبر علی سیڑھیاں چڑھنے لگے مگر چھت بالکل خالی تھی اور وہاں بالکل خاموشی تھی نہ کوئی پتھر وغیرہ پڑا تھا۔ "امی حضور! ہماری حویلی کی چھت تو بالکل خالی ہے۔ کہیں برابر کے گھر سے تو آواز نہیں آئی؟"

مگر بیگم قمر جہاں بے یقینی کی کیفیت میں تھیں انہیں کیسے دھوکہ ہوتا، اوازیں ان کے کمرے کی چھت سے ہی آ رہی تھی۔

اگلے روز گوہر اور آسیہ بیگم باورچی خانے میں تھیں۔ "ابھی بھی شام کے دسترخوان کے لئے ملازموں سے کہہ دیا ہے کھانا مغرب کے بعد شروع ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے آسیہ۔" گوہر بیگم بولیں۔

"زرینہ!"

"جی بیگم جی!"

"جاؤ اور چھت پر سے سوکھے مصالحے اتروا کر گودام میں رکھواؤ۔" زرینہ کو کہہ کر دونوں، بیگم قمر جہاں کے ساتھ دالان میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ زرینہ دوڑتی ہوئی آئی اس کا سانس ٹھکانے نہیں تھا۔ "بیگم جی! وہ....."

"آرام سے بات کرو کس بات کی جلدی ہے!" بیگم قمر جہاں کو زرینہ کا انداز پسند نہ آیا، وہ بہت تمیز دار خاتون تھیں۔

"معافی چاہتی ہوں بیگم جی! وہ دراصل اوپر کے سارے مصالے خراب ہو گئے ہیں۔" زرینہ بولی۔

"خراب ہو گئے! مگر کیسے؟" آسیہ بیگم نے سوال کیا۔

"معلوم نہیں جی۔"

"کل تو میں نے خود اپنے سامنے سارے سوکھے

مصالحے رکھوائے تھے۔"

"مگر اب وہ کیلئے ہو کر کھڑے ہوئے ہیں اور ان میں کیڑے چل رہے ہیں۔" زرینہ نے پوری بات بتائی، یہ سن کر آسیہ اور گوہر بیگم ملازمہ کے ساتھ خود اوپر گئیں اور وہاں پہنچ کر ان کی آنکھوں نے جو دیکھا، اس نے زرینہ کی بات کی تصدیق کردی، مصالحوں میں سے انتہائی غلیظ بو آرہی تھی اور وہ غلاظت میں لتھڑے ہوئے تھے، دونوں ناک پر دوپٹہ رکھے نیچے آگئیں اور قمر جہاں کو بتادیا۔ "کوئی بلی وغیرہ ہوگی۔" آسیہ نے خیال ظاہر کیا۔ اور ملازموں کو چھت کی صفائی کا کہہ دیا۔

☆.....☆.....☆

شادی کا دن آگیا اور مہ جبین، محسن علی کے نکاح میں آگئیں اور میکے سے رخصت ہو کر حویلی پہنچ گئیں۔ پالکی نیچے رکھ کر مہ جبین کو اس سے نکالا گیا۔ سرخ غرارے میں ملبوس مہ جبین دلہن بنی حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہونے لگیں، مگر جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا۔ "انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ ان کے پورے وجود میں انگارے دہک گئے، ان کو لگا بے تحاشا وزن اس کے اوپر سوار ہوگیا ہو، وہ لہرا کر نیچے گریں اور بے ہوش ہوگئیں۔"

ایک لمحے کو تو کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا پھر سب مہ جبین کو اٹھانے لگے، گوہر بیگم نے آگے بڑھ کر مہ جبین کو ہلایا مگر انہیں ہوش نہ آیا، مہ جبین کو اندر لے جایا گیا۔ آسیہ بیگم نے مہ جبین کو منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، مہ جبین کے پپوٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور پھر انہوں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ تھوڑی دیر میں سب کمرے سے چلے گئے۔ صرف بیگم قمر جہاں خود مہ جبین کے پاس رک گئیں۔ "مہ جبین بیٹا! ہر لڑکی کو ایک دن رخصت ہو کر سسرال جانا ہوتا ہے، تم نے اس بات کو اتنی گہرائی سے محسوس کیا کہ طبیعت خراب ہوگئی۔ ویسے بھی بیٹا یہ سسرال سے پہلے تمہاری پھوپھی کا گھر ہے۔" انہوں نے پیار و شفقت سے مہ جبین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔ ان کا خیال تھا کہ ماں باپ کی جدائی مہ جبین سے برداشت نہیں ہوئی۔ وہ کچھ دیر تک مہ جبین کے پاس رہیں، پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

محسن علی اپنے کمرے میں آئے اور دروازہ بند کر کے پلٹے ہی تھے کہ اڑتے ہوئے سامنے کی دیوار سے جا کر ٹکرائے، اور نیچے گر پڑے، کچھ دیر تک ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ محسن علی سنبھلے اور سر جھٹک کر کھڑے ہوئے تو سامنے بیڈ پر بیٹھی مہ جبین نے ہلنے لینے شروع کردیئے۔ محسن علی ٹھہر اکر آگے بڑھے تو کمرے میں کرخت مردانہ آواز گونجی۔ "رک جاؤ میں جہاں کھڑا ہے۔" محسن علی نے چاروں طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا پھر جب ان کی نظر گھوم کر مہ جبین پر آئی تو ٹھٹک گئے مردانہ آواز ان کے ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔

"اپنی خیر کا ذمہ دار تو خود ہے، اس فاصلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا تو ذمہ دار تو خود ہوگا۔" محسن علی خوفزدہ ہو کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ سب لوگ سو چکے تھے وہ برآمدے میں سر پکڑ کر بیٹھ گئے، مہ جبین کو وہ نہیں سے جانتے تھے، آج ایک رات میں یہ کیا ہو گیا؟ ان کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

اللہ اکبر! کی آواز ان کے کانوں میں آئی اور وہ وضو کرنے چلے گئے۔ سورج نکلتے ہی محسن علی خاموشی سے کمرے میں آئے اور ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے ان کی آنکھ لگ گئی۔

آج مہ جبین کے گھر والے اس کو لینے آرہے تھے۔ ملازموں کو کھانا تیار کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا اور وہ اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ مٹھائیاں تیار ہو کر تھالوں میں نکل چکی تھیں مگر جب ملازم انہیں لینے گئے، تو خالی تھال میں چڑھا رہے تھے، ملازم حیران تھے اتنی ساری مٹھائی کہاں گئی۔ دوبارہ کڑاہی چڑھائی گئی۔ پھر سے مٹھائیاں تیار ہونے لگیں۔ مٹھائی تیار کر کے تھالوں میں سجا کر انہیں رکھ دیا گیا۔ دسترخوان لگ گیا۔ ملازم ڈھکے ہوئے تھال اٹھا کر لے جانے لگے اور پھر جیسے ہی کپڑا اٹھایا گیا۔ وہاں خالی تھال منہ چڑا رہے تھے۔

سارے باورچی کام چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ملازموں نے اکبر علی اور وقار علی کو مطلع کردیا۔

دوسری طرف منہ جبین کی بہن جب اسے لینے اس کے کمرے میں آئی تو مہ جبین کو دیکھ کر چونک گئی کیونکہ مہ جبین کے بال بکھرے پڑے تھے اور وہ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی، اس کا وہ پڑ زمین پر بے ترتیب پڑا تھا، اس کی بہن نے مہ جبین کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ ابل گئی۔ پیشانی انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ سب کو مہ جبین کے بارے میں بتایا گیا تو خاندانی طبیب کو بلا لیا گیا۔ اس نے مہ جبین کو دیکھ کر دوا دے دی۔

سب کا خیال یہ ہی تھا کہ وہ والدین سے دوری برداشت نہیں کر پارہی۔

مغرب کے بعد بیگم قمر جہاں نے ملازمہ کو دیکھنے بھیجا کہ مہ جبین جاگی یا نہیں؟ ملازمہ کمرے میں گئی تو وہاں اندھیرا تھا اس نے روشنی کی تو تیز جھونکے سے وہ کمرے کے پردے اڑے اور لائٹ بند ہوگئی۔ ملازمہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک دم اس کے پیر پر کسی چیز نے زور سے کاٹا۔ "سی!" ایک آواز اس کے ہونٹوں سے نکل گئی۔ پھر تو اسے اپنے پورے پیروں پر ان گنت سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ درد سے بلبلا اٹھی اور جلدی سے ٹٹول کر پھر روشنی کی، جیسے ہی اس نے اپنے پیروں کو دیکھا تو خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "اس کے پیر، پنجوں سے لے کر پنڈلیوں تک سرخ چیونٹیوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ چیونٹیاں تیزی سے اس کے پاؤں کا گوشت کھا رہی تھیں۔" اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ گر کر بے ہوش ہوگئی۔

چیخ کی آواز سن کر اور ملازم بھی آگئے۔ مگر جب ان کی نظریں اس ملازمہ کے پیروں پر پڑیں تو سب کے سب ٹھٹک گئے۔ "اس کے پیر سوج کر غبارے جیسے ہو رہے تھے اور جگہ جگہ سے گوشت غائب تھا۔" ملازمہ کو ہوش میں لایا گیا۔ تکلیف سے اس کا برا حال تھا اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کی مرہم پٹی کی گئی اور پھر اس کے بتانے پر پورا کمرہ دیکھا گیا۔ مگر وہاں ایک بھی چیونٹی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تمام شور کے باوجود مہ جبین ابھی تک بستر پر دراز نیند کی وادیوں میں گم تھی۔

دسترخوان لگ چکا تھا مگر اتنے لوگوں کے باوجود اتنی خاموشی تھی کہ صرف برتنوں کی آواز آرہی تھی۔ محسن علی کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی۔ ایک بوجھ تھا ان کے دل پر گروہ چاہ کر بھی اسے ہلکا نہیں کر پا رہے تھے۔

"اچانک اکبر علی نے زور سے ابکائی لی اور منہ سے لقمہ تھوک دیا۔" سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "کیا ہوا بھائی صاحب؟" وقار علی نے برابر بیٹھے اکبر علی سے سوال کیا۔ مگر وہ جواب دینے کے بجائے غسل خانے میں دوڑے اور خوب کلیاں کرنے لگے۔ پھر واپس آکر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا اکبر بیٹا؟" بیگم قمر جہاں نے سوال کیا۔

"وہ دراصل امی حضور! ہم نے قورمہ میں بوٹی کا لقمہ بنا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ ہمیں اپنے منہ کے اندر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے..... جیسے..... "چھپکلی" وقار علی نے اس لقمے کو دیکھا تو اس میں بوٹی ہی تھی۔ سب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

رابعہ بیگم کی بہو اپنے بچے کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اور بچہ کھیل رہا تھا، اچانک بچہ لڑکھڑایا اور گر کر رونے لگا۔ زاہدہ جلدی سے آگے بڑھی اور بچے کو اٹھا کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ "کوئی بات نہیں بیٹا!" مگر بچہ ماں کی جانب دیکھ کر روئے جا رہا تھا اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ "بس بیٹا! آپ تو بہادر ہیں ناں۔" مگر بچہ بہلا نہیں اور روتا رہا۔

اچانک کسی نے زاہدہ کے چہرے پر پھونک ماری تو اس کے بالوں کی لٹ منہ پر آگئی اسے عجیب سا محسوس ہوا اسے لگا کہ اس کی بائیں طرف کوئی کھڑا ہے۔ اس نے گردن کو بائیں جانب گھمایا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک بے حد بڑے سائز کا چہرہ جو بے انتہا سیاہ تھا اس کی جانب گھور رہا تھا، اس کی

آنکھوں کی جگہ جیسے انگارے دہک رہے تھے۔ اتنا ہیبتناک چہرہ اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس وجود نے زاہدہ کے بالوں کو کھینچ کر اسے نیچے دھکا دے دیا۔ زاہدہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے گرتی چلی گئی۔ اس کا بچہ اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ زاہدہ کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہوگئی تھی، سرخ خون سے لت پت تھا اور خون فرش پر بھی جمع ہو رہا تھا۔ آوازیں سن کر ایک ملازم آیا اور دوڑ کر سب کو اطلاع کی۔ رابعہ بیگم جلدی سے آئیں اور زاہدہ کو دیکھ کر رونے لگیں۔

زاہدہ کو ہوش آگیا تھا مگر وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ جب سب نے اس کے گرنے کا پوچھا تو اس نے خوفزدہ انداز سے ناں میں گردن ہلانی شروع کردی۔ زاہدہ کو دوبارہ دکھایا گیا مگر وہ اپنی آواز کھو چکی تھی۔ رابعہ بیگم نے فوراً سامان باندھا اور زاہدہ اپنے پوتے کو لے کر اپنے گھر روانہ ہوگئیں۔

دو، تین روز گزر گئے۔ بیگم قمر جہاں نے اپنا خاندانی ہیروں کا ہار نکالا جو رواج کے مطابق بہو کو آتے ہی دے دیا جاتا تھا، مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ نہ صرف دعوت ولیمہ آگے بڑھانا پڑا بلکہ ہار تک دینے کی نوبت نہ آئی۔ بیگم قمر جہاں نے محسن علی کو بلوایا اور دونوں بہو، بیٹوں کو لے کر مہ جبین کے کمرے کی طرف چل دیں۔ مہ جبین اپنے بستر پر خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ”مہ جبین!“ بیگم قمر جہاں نے اس کی ٹھوڑی ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس کا چہرہ دیکھتے ہی ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”مہ جبین کی دودھیا رنگت تانبے کی طرح تپتی ہوئی ہو رہی تھی، آنکھیں سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی تھیں اور سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے۔“

”محسن میاں لایئے مہ جبین کی امانت۔“ انہوں نے سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ محسن علی نے ہچکچاتے ہوئے سرخ مخملی ڈبے سے چمکتے ہیروں کا ہار نکالا اور مہ جبین کی جانب بڑھایا۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ہار محسن علی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑلیا۔ وہ کسی طاقت کو اپنے گلے سے چھڑانے کی کوشش کررہے تھے اور اسی جدوجہد میں وہ نیچے جا گرے۔ ”کیا ہوا محسن میاں؟“ بیگم قمر جہاں ان کے پاس آئیں مگر سوال کے جواب میں ایک زبردست طمانچہ ان کے رخسار پر پڑا کہ وہ قدموں پر توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔ دونوں بہوئیں دوڑ کر ان کے پاس آئیں۔ ان کے رخسار پر انگلیوں کے گہرے نشانات چھپ گئے تھے۔

آسیہ بیگم مدد کے لئے دروازے کی جانب بڑھیں مگر ایک جھٹکے سے رک گئیں۔ ایک دردناک چیخ ان کے منہ سے نکل پڑی۔ ”ان کی چوٹی غلاؤں میں معلق تھی اور کسی انديکھی طاقت نے ان کو اوپر کھینچ رکھا تھا۔

گوہر بیگم آسیہ کی طرف بڑھیں تو کسی نے بھرپور طاقت سے ان کے پیٹ میں لات ماری۔ گوہر بیگم درد سے کراہ کر زمین پر دوہری ہوگئیں۔ بیگم قمر جہاں نے اپنے جسم کی پوری طاقت جمع کرکے کلام پاک کی سورتوں کو زور زور سے پڑھنا شروع کردیا۔ جونہی محسن علی کے ہاتھ ڈھیلے پڑگئے، آسیہ بیگم جھٹکے سے پیچھے گر گئیں، ان کے بال چھوٹ گئے تھے جبکہ گوہر بیگم درد سے بے ہوش ہو چکی تھیں۔

گھر کے سارے افراد خوف و حیرانی کی کشمکش میں تھے، کمرے میں جو کچھ ہوا اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ بیگم قمر جہاں نے اپنے تینوں بیٹوں کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ جب تینوں آگئے تو انہوں نے محسن علی سے مخاطب ہوکر سوال کیا۔ ”شادی والی رات کو آپ کے اور مہ جبین کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی؟“ محسن علی چند لمحے خاموش رہے پھر بڑے بوجھل انداز سے بولے۔ ”امی حضور! بات کرنے کی نوبت ہی کہاں آئی“ اور پھر تمام واقعہ ان کے گوش گزار کردیا۔

”محسن میاں یہ بات آپ کو اگلی صبح ہی بتانی چاہئے تھی۔“ اکبر علی نے کہا۔

”بس غلطی ہوگئی! بھائی صاحب، میں اس جھجک میں کہہ نہ پایا کہ کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔“ محسن علی نے نظریں جھکا کر کہا۔

”اکبر میاں! آپ فوراً دہلی کے لئے روانہ ہو جایئے اور حافظ جی کو ہمارا پیغام پہنچایئے کہ ہم انہیں یاد کررہے ہیں اور ہو سکے تو انہیں ساتھ ہی لے آیئے گا۔“ بیگم قمر جہاں نے کہا۔

”جیسا آپ کا حکم امی حضور!“ اکبر علی نے مودبانہ انداز سے کہا اور اگلے ہی روز محسن علی کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

زرینہ نے گوشت چڑھایا اور چاول صاف کرنے لگ گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ زوردار آواز سے اچھل گئی۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا تو دیگچی کا ڈھکن نیچے دور پڑا ہوا تھا۔ زرینہ نے چاول ایک طرف رکھے اور کپڑے سے گرم ڈھکنا اٹھایا اور دیگچی کے پاس آئی۔ ابھی وہ ڈھکن دیگچی پر رکھنے بھی نہ پائی تھی کہ ہڑبڑایا ہی سے ایک گرم بوٹی فضا میں بلند ہوئی اور زرینہ کے منہ پر چپک گئی۔ زرینہ ذبح ہوتے جانور کی طرح چیخنے لگی۔ سب دوڑ کر باورچی خانے میں آئے تو زرینہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے زمین پر لوٹ رہی تھی۔ ایک اور ملازمہ نے آگے بڑھ کر زرینہ کو تھاما اور اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ ”اوہ! میرے اللہ!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ بڑی مشکل سے زرینہ کے دو انگارا گی لگی۔ اسے کسی طرح چین نہیں آرہا تھا۔ بیگم قمر جہاں کے پاس آئیں آسیہ اور گوہر بیگم بھی ساتھ تھیں۔ زرینہ نے انہیں دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونا شروع کردیا۔ ”ہم اب یہاں نہیں رہیں گے، آپ ہمیں گھر بھجوا دیجئے۔“

”اچھا ٹھیک ہے رو نہیں۔“ گوہر بیگم نے اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلا کر کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی مگر آخر یہ تو بتاؤ ہوا کیا تھا؟“ بیگم قمر جہاں بولیں ان کے لہجے میں فکرمندی تھی، ملازمہ نے اپنے ہونٹوں کی پپڑیوں پر زبان پھیری اور سہم کر آہستہ سے بولی۔ ”میں باورچی خانے میں گوشت چڑھا کر چاول صاف کررہی تھی کہ دیگچی کا ڈھکنا تیز آواز سے نیچے گر گیا۔ میں اسے اٹھا کر دوبارہ دیگچی کے پاس آئی اور اسے ڈھکنے لگی.....“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ سب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کہ وہ اب کیا کہتی ہے۔ مگر وہ بالکل خاموش رہی۔

”زرینہ پھر کیا ہوا؟“ بیگم قمر جہاں نے اسے مخاطب کیا۔

”اچانک کہیں سے کہنیوں تک دو سیاہ ہاتھ آئے اور دیگچی سے گرم بوٹی نکال کر میرے چہرے پر رکھ دیا۔“ زرینہ نے اتنا کہا اور دوبارہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس کی بات سن کر بیگم قمر جہاں سر سے پیر تک لرز گئیں مگر انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور دل ہی دل میں اللہ سے رحم مانگنے لگیں۔

محکمہ تعطیلات

بیٹے..... آپ بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں..... ذرہ

اپنے ڈیڈی کو بھی بتائیں..... پرائمری اسکول ٹیچر بنوں گا یا ٹریننگ کالج کا پرنسپل..... ڈیڈی کے ہاتھوں میں پیالی تھرتھرانے لگی..... کیا کہہ رہے ہیں بیٹے..... کیوں..... کیا ٹیچر بننا برا ہے..... نہایت معصومیت سے پوچھا گیا..... نہیں..... مگر تم ٹیچر ہی کیوں بننا چاہتے ہو..... کیونہ اس ملازمت میں کام دوسرے پیشوں کی نسبت کم ہوتا ہے..... نہ ہونے کے برابر..... وہ کیسے..... ڈیڈی حیران ہو کر بولے..... دیکھیے ڈیڈی..... سال کے بارہ مہینوں میں سے گرما میں دو ماہ..... سرما میں ایک ماہ..... اور کرسمس میں ایک ہفتہ کی تعطیلات ہوتی ہیں..... اس کے بعد باقی بچے دنوں میں سے سال کے پچاس اتوار نکل آئے..... پھر مختلف قومی اور مذہبی تہواروں کی چھٹیوں کا نکال دیں تو کتنے دن بچے..... میڈیکل اور دوسری چھٹیاں الگ.....

(شرف الدین جیلانی۔ نٹھ والہ یار)

صبح کی تازہ ہوا نے گوہر بیگم کی طبیعت سے اداسی اور پریشانی کو وقتی طور پر پیچھے کر دیا تھا۔ وہ پودوں کے پاس آئیں اور چھوکران کی خوب صورتی کو مٹھی بھر کر سانس لگیں کافی وقت وہ پھولوں کو دیکھتی رہیں پھر وہ واپس جانے کے لئے مڑیں تو ان کا دوپٹہ کھنچ گیا۔ وہ سمجھیں کہ دوپٹہ پودوں میں الجھ گیا ہے مگر جب وہ پلٹیں تو ان کی روح فنا ہوگئی، ایک سیاہ وجود نے ان کے دوپٹے کا کونا تھاما ہوا تھا، پھر اس نے اپنا سیاہ ہاتھ بڑھایا اور گوہر بیگم کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر نیچے گریں اور کیاری میں لگے سرخ اینٹ کی نوک ان کی پیشانی میں گھس گئی، خون کا فوارہ ان کی پیشانی سے پھوٹ پڑا۔ مالی نے دوڑ کر انہیں اٹھایا اور باقی نوکروں کو آوازدی۔ ملازمہ نے گوہر بیگم کو اٹھا کر ان کے بستر پر لٹا دیا، ان کی پٹی کی گئی اور آنکھیں بند کیں اور سوچ میں گم ہوگئیں۔

جب بیگم قمر جہاں ان کے پاس آئیں تو انہوں نے سارا واقعہ انہیں بتا دیا۔ بیگ قمر جہاں سن ہوگئیں وہ جلد از جلد "حافظ جی" کی آمد کی منتظر تھیں۔

☆.....☆.....☆

وقار علی کے لئے حمام میں غسل کے لئے نیم گرم پانی رکھ دیا گیا تھا۔ ان کی عادت تھی نیم گرم پانی سے غسل کرنے کی۔ انہوں نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہ بالکل مناسب تھا۔ وقار علی نے لباس اتارا اور پانی اپنے جسم پر ڈالا مگر وہ اچھل پڑے پانی برف کی طرح یخ تھا۔ حادثے والا وہ حیران تھے اتنی جلدی پانی کیسے ٹھنڈا ہوگیا، وہ بھی برف کی طرح، انہوں نے ملازم کو آواز دی، اس نے آ کر پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہ نیم گرم تھا۔ اس نے وقار علی کو بتایا تو انہیں یقین نہ آیا، انہوں نے اپنا ہاتھ ڈالا پانی واقعی نیم گرم تھا۔ ملازم چلا گیا اور وقار علی نے دوبارہ پانی اپنے جسم پر ڈالا تو ان کی چیخ نکل گئی۔ پانی کھول رہا تھا۔ انہوں نے پانی کی طرف دیکھا تو پانی اس طرح ابل رہا تھا۔ جیسے اس کے نیچے چولہا جل رہا ہو اور اس سے بھیانک بات یہ تھی کہ اس پانی کے نیچے ایک سیاہ ہاتھ تھا اور پانچوں انگلیوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔

وقار علی نے دوڑ کر باہر جانے کی کوشش کی تو ایک اور سیاہ ہاتھ نے انہیں کھینچ کر اس کھولتے پانی میں لا پھینکا، وقار علی اذیت سے چیخنے لگے مگر اس سیاہ ہاتھ نے انہیں پانی سے باہر نہ آنے دیا۔ وقار علی کے جسم کی کھال اترنے لگی تھی۔ ان کی آوازیں سن کر ملازم دوڑتے ہوئے آئے مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ پھر ان کی چیخیں معدوم ہوتی چلی گئیں اور پھر آوازیں آنی بند ہوگئیں۔ نوکروں نے دروازہ توڑ دیا مگر اندر کا منظر دیکھ کر وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔

بیگم قمر جہاں کو اطلاع دی گئی تو حویلی میں کہرام مچ گیا۔ وقار علی کی لاش بری طرح خراب ہو چکی تھی۔ اکبر علی اور محسن علی کے بغیر ہی ان کو دفنا دیا گیا۔

بیگم قمر جہاں انتہائی خاموش اپنی مسہری پر تسبیح پڑھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اچانک ان کے دماغ میں روشنی سی چمکی۔ "کیوں نا میں مہ جبین سے بات کروں؟" پھر وہ فوراً تیر کی طرح مسہری سے اتریں اور کمرے سے باہر آ گئیں، ان کا رخ مہ جبین کے کمرے کی طرف تھا۔ انہوں نے پہلے دروازے پر تین دفعہ دستک دی پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ اندر اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ انہوں نے مہ جبین کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ انہوں نے کمرے میں روشنی کی مگر روشنی ہوتے ہی وہ چونک گئیں۔ "مہ جبین اپنے سرخ عروسی غرارے میں ملبوس، زیورات میں لدی، سجی، سنوری دلہن بنی مسہری پر بیٹھی تھی۔ "یہ کیا ہے مہ جبین! گھر میں سے جنازہ اٹھا ہے اور تم دلہن بنی بیٹھی ہو۔" ان کا بس اتنا کہنا تھا کہ کمرے میں بھونچال آ گیا۔

مسہری زلزلہ آئی زمین کی طرح ہلنے لگی۔ ایک دم کمرہ انتہائی غلیظ بدبو سے بھر گیا تو انہوں نے بے اختیار اپنا دوپٹہ ناک پر رکھ لیا، اور پھر برداشت کرتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ سب کیوں ہو رہا ہے مہ جبین؟"

مہ جبین نے سرخ دہکتی انگارہ آنکھوں سے بیگم قمر جہاں کی جانب دیکھا پھر کمرے کی فضا تڑاخ! کی گونجتی آوازوں سے بھر گئی، بیگم قمر جہاں کے رخسار تھے اور نظر نہ آنے والے ان گنت طمانچے، بیگم قمر جہاں چکرا کر دور جا گریں۔ "ہم سے سوال کرے گی؟ بڑھیا یہ ہماری چیز ہے اور اب ہم جو چاہیں گے، اسے وہ کرنا ہوگا۔ دیکھنا چاہے گی؟" بے حد کرخت اور بھاری مردانہ آواز مہ جبین کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک سرخ ہونٹوں سے نکلی اور پھر وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ مسہری سے اڑتی ہوئی کمرے میں موجود سنگھار میز پر کھڑی ہوگئی۔ بیگم قمر جہاں ہاتھ جوڑتی اس کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ "مجھے معاف کر دو! مجھے معلوم نہیں تھا۔"

جواب میں مہ جبین کے منہ سے بھیانک قہقہے نکل رہے تھے اور وہ میز پر ادھر سے ادھر کود رہی تھی۔

بیگم قمر جہاں کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے معافی مانگے جا رہی تھیں۔ پھر ایک دم مہ جبین ہوش سے بے ہوش ہوگئی۔ اور ایک طرف گر گئی۔ بیگم قمر جہاں اسے بڑی مشکل سے مسہری پر لائیں۔ انہیں اپنے قدم منوں بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ وہ وہیں زمین پر اپنے رب کے حضور سجدے میں گر گئیں۔

"اے میرے پروردگار! رحم فرما، مجھ پر اس گھر پر، میری اولاد پر، اس بچی کو اس مصیبت سے نجات دلا دے، میرا اپنا بچہ تو چلا گیا مگر میرے مالک اس معصوم کی زندگی بچا لے۔" وہ سجدے میں گری گڑگڑا کر دعائیں کر رہی تھیں۔ جانے کب تک وہ اسی کیفیت میں رہیں اور ان کی آنکھ لگ گئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر! اذان فجر کی صدا کو کچی تو بے اختیار بیگم قمر جہاں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی تک سجدے میں تھیں۔ وہ اٹھیں اور مہ جبین کو دیکھا وہ مسہری پر دراز گہری نیند میں تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے لگیں۔

ابھی انہوں نے نماز ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر باہر سے ہی خادمہ کی آواز آئی۔ "بڑی بیگم صاحبہ، حافظ جی آ گئے ہیں!" ان الفاظ سے بیگم قمر جہاں کے وجود میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "یا اللہ! تیرا شکر ہے، تو مجھ گنہگار کی عرض سن لی۔" انہوں نے آسمان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

بیگم قمر جہاں حافظ جی کی بہت عزت کرتی تھیں۔ حافظ جی ان کے ابا کے چھوٹے بھائی یعنی چچا تھے۔ نام تو ان کا عبدالرحیم تھا مگر وہ بے حد نیک عبادت گزار تھے اور حافظ قرآن ہونے کے باعث لوگ انہیں حافظ جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بیگم قمر جہاں ان کے سامنے کبھی اور ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ سر جھکائے روتی رہیں اور حافظ جی ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے رہے۔

تمام حال جاننے کے بعد حافظ جی اپنے کمرے میں چلے گئے اور سب کو ہدایت کر دی کہ جب تک وہ خود باہر نہ آئیں کوئی انہیں بلانے کی زحمت نہ کرے۔ فجر سے ظہر، ظہر سے عصر اور عصر سے مغرب ہوگئی، پھر مغرب کی اذان پر حافظ جی کمرے سے باہر آئے، وضو کیا اور نماز ادا کرنے مسجد چلے گئے۔

ادھر وہ گھر سے نکلے ادھر اناج کے گودام میں آگ بھڑک اٹھی۔ اتنی خوفناک کہ اس آگ کی لپیٹیں آسمان کو چھوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہر طرف شور و ہنگامہ مچ گیا۔ مسجد میں بھی اطلاع پہنچ گئی۔ حافظ جی سکراتے اور نما زختم کر کے گودام کی جانب چلے گئے۔ پھر انہوں نے "ایک کٹورے میں پانی منگوایا اور گودام کے سامنے کھڑے ہو کر اس پانی کے کٹورے پر پھونک ماری اور ہاتھ کٹورے میں ڈبو کر اس پانی کی چھینٹیں آگ پر چھڑکیں۔ ان چھینٹوں کا اس آگ پر پڑنا تھا کہ وہ ایک دم سرد پڑ گئی۔" حافظ جی نے ملازموں سے وہ پانی پورے گودام میں چھڑکنے کا کہا اور گھر کی جانب چل دیئے۔

عشاء کے بعد حافظ جی نے مہ جبین کو بلایا۔ ملازمہ نے مہ جبین کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ "چھوٹی بہو بیگم!" اس نے ادب سے پکارتی رہی مگر نہ کمرے سے کوئی جواب آیا اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ اس نے واپس جا کر بیگم قمر جہاں اور حافظ جی کو بتا دیا۔

☆.....☆.....☆

"ادھر مہ جبین اپنے بستر پر دراز تھی، ایک دم اسے کرنٹ سا لگا اور وہ اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بستر

سے نیچے اتری اور اپنے کمرے میں چاروں طرف نظریں گھمائیں، پھر الماری سے اپنا عروسی غرارا نکال کر زیب تن کیا اور سنگھار میز کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں میں لگے ہوئے چوٹی کے بل ایک ایک کر کے خود بخود کھلنے لگے، اس کے سارے بال کھل کر اس کے شانوں پر بکھر گئے۔ فضا میں سے موتیوں کی کلیاں اس کے بالوں پر گرنے لگیں، مہ جبین کو اپنے اردگرد تپش کا احساس ہونے لگا۔ وہ چلتی ہوئی مسہری پر آئی اور بیٹھ گئی۔ تپش تیز ہوئی گئی، تیز اور تیز اور پھر تپش باقاعدہ آگ میں تبدیل ہوگئی اور مہ جبین آگ کے شعلوں میں گھری آرام سے جلنے لگی اور جلتی ہوئی وہ اتنے آرام سے بیٹھی تھی جیسے اسے کچھ ہوہی نہیں رہا ہو۔

کمرے کا دروازہ ایک دم کھلا تو مہ جبین نے آگ میں جلتے جلتے گردن گھما کر دیکھا۔ وہاں حافظ جی تھے ان کے دائیں ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے تیزی سے ایک کے بعد ایک آگے جا رہے تھے۔ پھر ان کا ہاتھ رکا اور انہوں نے مہ جبین کی جانب منہ کر کے پھونک ماری تو مہ جبین کے وجود میں سلگتی ہوئی آگ سرد پڑ گئی۔ مہ جبین نے غضبناک انداز سے سر کو جھٹکے دینے شروع کر دیئے اور مسہری پر اٹھ کر کھڑی ہوگئی اس نے اپنا ایک پیر اٹھایا اور زور سے بستر پر مارا، پھر دوسرا پیر اٹھایا اور بستر پر مارا اور اسی طرح کرتے کرتے وہ فضا میں معلق ہوگئی اور اسی طرح پیروں کو حرکت دیتی رہی۔ اس کے ہونٹوں سے مردانہ قہقہے نکل رہے تھے۔ ”چھوڑ دے! اس بچی کو اور چلا جا یہاں سے۔“ حافظ جی نے شروعات کی۔

”تو چلا جا! میرا تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ مہ جبین نے مردانہ آواز میں کہا۔

”مت پریشان کر اس معصوم کو یہ کسی کی امانت ہے۔ اور اس گھر سے چلا جا!“ حافظ جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”یہ مجھے پسند آ گئی ہے اور اب اس کو مجھ سے کوئی نہیں لے سکتا۔“ مہ جبین دہاڑی اور اس کے دہاڑنے سے پورے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی۔

حافظ جی نے کلام الٰہی کا ورد شروع کیا تو لمحہ بھر میں آگ بجھ گئی مگر حافظ جی چونک گئے۔ انہیں کمرے میں ایک سے زائد وجودوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے کمرے کی دوسری جانب منہ کر کے سوال کیا۔

”اپنی نشانیاں کر!“

کمرے میں شعلہ ساتھ کسنے لگا اور آواز آئی۔ ”ہمارا بسیرا یہاں ہزاروں سال سے ہے مگر ہم نے آج تک کسی کو کبھی تنگ نہیں کیا مگر ان لوگوں نے ہمارے قبیلے کے شہزادے کو بے دردی سے مار دیا، اب یہ سب اپنا کیا ضرور بھگتیں گے۔“ اس آواز میں بے حد افسردگی تھی۔

حافظ جی نے آنکھیں بند کیں تو اس بات کی تصدیق ان کے علم نے کر دی۔ حافظ جی نے غصہ ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو کچھ ہوا وہ واپس نہیں پلٹ سکتا اور مجھے اس کا بے حد افسوس بھی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کے قبیلے کا شہزادہ اس وقت سانپ کی شکل میں تھا اور وقار علی نے اپنی سمجھ میں سانپ کو مارا تھا۔ وہ آپ کے شہزادے کی حقیقت سے لاعلم تھے اور آپ نے وقار علی کی جان لے کر اپنا بدلہ پورا کر لیا۔ اب آپ ان لوگوں کو کیوں پریشان کر رہے ہیں۔“

”ایک فرد کی موت سے ہمارا بدلہ پورا نہیں ہوتا، شہزادہ کی موت سے ہماری ملکہ بھی صدمے سے مر گئیں اور ہمارے بادشاہ بھی بیمار ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس گھر کا ایک ایک فرد مرے گا۔“ اس شعلے سے آواز آئی۔

اس سے پہلے کہ حافظ جی کچھ کہتے مہ جبین کے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ ”اور رہی بات اس حسین وشیزہ کی تو پہلی نظر میں ہی میں اس پر عاشق ہوگیا اور اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا!“ حافظ جی نے غصے سے کہا۔ ”ہم نا انصافی کرنے والوں میں سے نہیں، اس لئے آپ سے بات کی، مگر آپ اب حق پر نہیں اس بچی کو جو کہ کسی کی منکوحہ ہے آپ کو چھوڑنا ہوگا۔“

”کس کس سے مقابلہ کرو گے!“ مہ جبین کے الفاظ پر حافظ جی نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور پھر کافی

دیر گزر جانے کے بعد ”کمرے میں ایک بزرگ نمودار ہوئے، ان کے دائیں بائیں دو خادم بھی تھے۔ مہ جبین ان بزرگ کے آتے ہی بے جان ہو کر نیچے گر پڑی اس کے وجود سے دھواں نکل کر غائب ہو گیا تھا اور دوسرے کونے میں موجود شعلہ بھی بجھ گیا تھا۔

”حضرت میں آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں مگر معاملے کی نزاکت اس نوعیت کی ہے کہ مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا.....“ حافظ جی نے گفتگو شروع کی۔

گھر کے تمام افراد بے چینی سے حافظ جی کا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور بیگم قمر جہاں بھی متفکر تھیں پھر حافظ جی باہر آئے۔ ”بیٹا قمر!“ انہوں نے کہا۔

”جی! حافظ جی۔“ بیگم قمر جہاں جلدی سے بولیں۔

”تم سب اپنا سامان باندھ لو، سب کو یہاں سے کوچ کرنا ہے۔“ حافظ جی کی بات پر سب اپنی جگہ سے یوں اچھل پڑے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ”وہ کس لئے؟“ بیگم قمر جہاں کو اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”غور سے سنو! اس حویلی میں جنات کا ایک پورا قبیلہ آباد ہے اور انہی میں سے ایک جن مہ جبین پر عاشق ہوگیا ہے۔ مگر پہلی تمہارے گھر سے ہوئی ہے۔“ اور پھر انہوں نے تمام ماجرا بیان کر دیا۔

جب وہ خاموش ہوئے تو بیگم قمر جہاں نے روتے ہوئے کہا۔ ”مگر ہم حویلی کیوں چھوڑیں جبکہ انہوں نے وقار علی سے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔“

”میں نے ان کے قبیلے کے بادشاہ سے بات کی ہے۔ دراصل جس بچے کو وقار علی نے مارا تھا وہ شاہ جنات کا بیٹا تھا، ان کا پورا قبیلہ غصے میں ہے، ان کا کہنا ہے کہ وہ اس خاندان کو ختم کر کے ہی رہیں گے۔ دوسری طرف وہ ضدی جن کسی صورت مہ جبین کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ ایک جن سے تو لڑا جا سکتا ہے پورے قبیلے کا مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عقل سے کام لو! ایک بیٹا تو گنوا چکی ہو! اب کیا باقی لوگوں کو بھی کھونا چاہتی ہو؟“

بیگم قمر جہاں مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

”میں نے بڑی مشکل سے شاہ جنات سے بات کی ہے، انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سب ایک حادثہ اور غلط فہمی تھی اور اس کا بدلہ وقار علی کی موت کی صورت میں پورا ہو چکا ہے۔ باقی لوگ تو بے قصور ہیں بلکہ تمام حالات سے ناواقف بھی۔ مگر انہوں نے صاف کہہ دیا ان کے رہتے اس خاندان کا کوئی فرد اس حویلی میں نہیں رہ سکتا، اور ان کا پورا قبیلہ ہزاروں سال سے یہاں آباد ہے، یہ حویلی چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت دیر سمجھانے پر وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ مہ جبین اور اس گھر کے لوگوں کو یہاں سے زندہ اور صحیح سلامت جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ مگر زندگی میں اگر دوبارہ ان لوگوں میں سے کسی نے اس حویلی کے اندر قدم رکھا تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔“ حافظ جی ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

دو روز بعد بیگم قمر جہاں اور ان کے بچے اس حویلی کو خالی کر گئے۔ انہوں نے لکھنؤ چھوڑ دیا اور حافظ جی کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ مہ جبین بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ اور اسے گزرا ہوا وقت بالکل یاد نہیں تھا۔ اور سب خوش تھے کہ اچھا ہے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ حویلی میں تالا لگے برسوں بیت چکے۔

بیگم قمر جہاں اپنی زندگی کے آخری ایام میں تھیں وہ بہت بیمار تھیں۔ ان کی زندگی کی بس آخری تمنا یہی تھی کہ وہ ایک بار اپنی حویلی دیکھ لیں جس میں انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ جتنی بھی زندگی گزاری تھی۔ وہ ان کے خاوند کی نشانی تھی۔ مگر پھر انہیں شاہ جنات سے کیا ہوا وعدہ یاد آ جاتا۔ اگر صرف بات ان کی اپنی زندگی کی ہوتی تو کب کا حویلی دیکھ آتیں مگر بات ان کی اولاد کی تھی۔ اس لئے وہ مجبور ہو کر پرنم آنکھیں بند کر کے اس حویلی میں گزری زندگی کو یاد کرتیں اور گھنٹوں ان یادوں میں کھو جاتیں۔

بدروحوں کا مسکن

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

گھر کے سارے افراد ڈائننگ ہال میں بیٹھے کھانے کی تیاری کررہے تھے کہ اچانک ایک کان پھاڑ دینے والا خوفناک دھماکہ چھت پر بنے کمرے میں سنائی دیا، گھر والے بھاگے مگر یہ کیا کمرہ بالکل محفوظ تھا لیکن پھر.....

خوف ودہشت کے گرداب میں غوطہ زن دلوں کو سوستی جیر تناک اور خوفناک کہانی

13 نومبر 1974ء کو نیویارک ٹیلی ویژن کے پروگرام اچانک روک دیئے گئے۔ اناؤنسر نے اطلاع دی کہ "لانگ آئی لینڈ" میں ایک ٹائیوں کے مقام پر چوبیس سالہ رونلڈ نے ایک طاقتور پستول کی مدد سے اپنے ماں باپ، دو بھائیوں، اور دو بہنوں کو قتل کردیا ہے۔ 112 اوشن ایونیو پر بنا یہ وسیع وعریض گھر خون کی ہولی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس واقعے سے تمام ملک میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی اور پولیس رونلڈ کو گرفتار کرنے کے بعد اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ قتل کے محرکات کیا تھے۔

ایک برس بعد..... جارج اور اس کی بیوی کیتھی اپنے تین بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہوگئے..... یہ **18 دسمبر 1975ء** کا دن تھا۔

جارج ایک ارضی سروے کمپنی کا مالک تھا جو اسے اپنے دادا سے ورثے میں ملی تھی..... اوشن ایونیو پر بنے گھر میں منتقل ہونے سے قبل جولائی سے لے کر نومبر 1975ء تک وہ تقریباً پچاس، ساٹھ مکانات دیکھ چکے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ان کی ضروریات اور پسند پر پورا نہیں اترا تھا۔ پرانا گھر ان کے لئے بہت چھوٹا ثابت ہورہا تھا اور ویسے بھی اس علاقے میں تعمیراتی کام کی رفتار اتنی حوصلہ بخش نہیں تھی کہ جارج اپنے اخراجات پورے کرسکتا تھا۔

اس نے کئی پراپرٹی ڈیلروں سے رابطہ قائم کررکھا تھا۔ لیکن ہر بار وہ مایوس واپس لوٹتا تھا۔ پھر ایک روز لانگ آئی لینڈ کی ایک خاتون پراپرٹی ڈیلر نے اسے ایک مکان دکھانے کی پیشکش کی تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر روانہ ہوگیا۔ اس کی بیوی کیتھی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ منتظر خاتون کے سائے جسم کی مالک تھی اور وقتاً فوقتاً جارج کی طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتی تھی، جسے کیتھی برداشت نہیں کرسکتی تھی، مگر معاملہ گھر کی تلاش کا تھا اس لئے وہ صبر سے لب ہی رہی..... گھر آ گیا تھا..... جارج نے باہر لگی تختی دیکھی..... 112 اوشن ایونیو! یہ تین منزلہ وسیع وعریض مکان تھا۔ مکان کے باہر والے حصے میں سدا بہار باڑ لگی ہوئی تھی اور اندرونی حصے میں سوکھی ہوئی زرد گھاس کے قطعے پورے ماحول کو افسردہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ مکان تقریباً ایک سال سے قابل فروخت پڑا تھا۔ اور تین منزلہ، چھ بیڈ روم اور تہہ خانے سمیت اس کی قیمت حیرت انگیز طور پر کم تھی.....

"صرف اسی ہزار ڈالر..... اسی ہزار ڈالر!" جارج بڑبڑایا۔ "شاید اخبار والے آٹھ سے پہلے ایک ہندسہ لگانا بھول گئے ہیں.....! لیکن حقیقت ان کے سامنے تھی اسی ہزار ڈالر میں یہ گھر ان کی تمام ضروریات پوری کرتا دکھائی دیتا تھا.....

"میں لگی لپٹی کی قائل نہیں ہوں۔" چلتے چلتے خاتون پراپرٹی ڈیلر دفعتاً بول اٹھی۔ "اور آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ یہ گھر روشلڈ خاندان کی ملکیت ہے۔" ان سب کو گزشتہ نومبر میں ہونے والے ہولناک واقعے کا خیال آ گیا۔ پولیس افسران نے دراز قد ابلاغ کو بتایا تھا کہ روشلڈ کے گھر والے اسی پستول کا نشانہ بنے تھے جو روشلڈ کے ہاتھ میں تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ مقتولین ایک ہی پوزیشن میں اوندھے لیٹے پڑے تھے۔ جو روشلڈ کے ہاتھ میں تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ مقتولین ایک ہی پوزیشن میں اوندھے لیٹے پڑے تھے اور ان کے سر بازوؤں پر دھرے تھے.....!

روشلڈ نے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ سب کچھ میں نے کیا ہے..... پتہ نہیں یہ سب کیسے شروع ہوا..... اور سب کچھ اتنی سرعت سے ہو گیا کہ میں کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا۔" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا تھا.....

روشلڈ کے وکیل نے عدالت میں یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ وقوعہ کے دوران ملزم اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا، کیونکہ اس نے خود اقرار کیا تھا کہ کئی ماہ سے وہ عجیب عجیب آوازیں سن رہا ہے، اور اسے یوں لگتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت اس سے محو کلام ہے..... لیکن جیوری نے اسے قتل عمداً کا مجرم ٹھہراتے ہوئے چھ بار پھانسی کا تعزیری سزا سنائی تھی!!

خاتون پراپرٹی ڈیلر کو یقین تھا کہ یہ جاننے کے بعد جارج اور کیتھی کسی قیمت پر یہ مکان نہیں خریدیں گے، لیکن کیتھی نے ایک بار پھر پورے مکان کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولی۔

"ہم نے جتنے مکان دیکھے ہیں یہ ان میں سے بہترین ہے، پراپرٹی ڈیلر ہکا بکا رہ گئی مگر جارج اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے اس خوب صورت گھر کو خریدنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

نومبر تیزی سے گزر رہا تھا..... جارج اور کیتھی اس تمام عرصے میں نئے گھر کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہے، جارج نے معمولی سی ترامیم کیں جن کی وجہ سے یہ جگہ مزید خوب صورت بن گئی۔ اب دسمبر آ پہنچا تھا اور جارج نے سارے انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ کیتھی نے تیسری منزل پر بنا ایک بیڈروم اپنے دونوں بیٹوں کے سپرد کر دیا۔ سات سالہ کرسٹوفر..... اور نو سالہ مائیکل اوپر کی منزل کا دوسرا بیڈروم بچوں کے لئے کھیل کا کمرہ بنا دیا گیا..... اپنی پانچ سالہ بچی..... بلسی کو اس نے دوسری منزل کا بیڈروم الاٹ کر دیا تھا..... یہ کمرہ ان کی شب خوابی کے بڑے کمرے کی دوسری سمت میں تھا۔ اسی منزل پر ایک ڈریسنگ روم اور کیتھی کے لئے ایک سلائی کا کمرہ مخصوص کر دیا گیا..... تمام بچے بے حد خوش تھے! سب سے نچلی منزل پر ڈرائنگ اور ڈائننگ روم زد میں واقع تھے۔ جارج نے پراپرٹی ڈیلر سے دوبارہ رابطہ قائم کیا اور ان دونوں کمروں کے لئے وہی فرنیچر خرید لیا جو پہلے روشلڈ خاندان کی ملکیت تھا۔

اسی اثناء میں جارج نے اپنا پرانا گھر بیچنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے لئے گاہک بھی ڈھونڈ لیا تھا..... اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا فرنیچر بھی نئے گھر کے تہہ خانے میں منتقل کر دے گا تاکہ غیر ضروری اخراجات اور کمیاؤں کے جھنجٹ سے نجات حاصل کی جا سکے۔

112، اوشن ایونیو والے اس گھر کی ایک جانب دریا بہتا تھا اور جارج کا ارادہ تھا کہ دریا کے کنارے والے حصے پر اپنی ذاتی موٹر بوٹ کو رکھے..... اس قسم کے کئی خیالات نے اس کے ذہن میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا.....

کوچ کا دن آ پہنچا..... آج 18 دسمبر تھی اور جارج گھر کا سامان ایک بڑے ٹریلر میں لادے لانگ آئی لینڈ کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کے ہمراہ سامان اٹھانے کے لئے اس کے پانچ دوست بھی تھے..... ٹرک کے پیچھے پیچھے کیتھی ایک ویگن میں بچوں سمیت خود ڈرائیو کرتی ہوئی آ رہی تھی..... وہ لوگ مسرت سے گنگنا رہے تھے..... بڑا دروازہ کھلا اور تینوں بچے کودتے پھاندتے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔ کیتھی نے انہیں اپنے اپنے کھلونے اور کتابیں ساتھ لے جانے کو کہا اور خود باورچی خانے میں سامان سجانے لگی۔ وہ علی الصبح ہی اپنے اپنے کاموں میں جت گئے تھے۔

لیکن جس وقت مقامی پادری..... فادر مائکسوان کے گھر پہنچا، فادر مائکسوو صرف روایتی پادری ہی نہ تھا بلکہ مذہبی فرائض کے ساتھ ساتھ یہ تقریباً عدالت میں منصفی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اور تو اور وہ ایک کامیاب ماہر نفسیات تھا اور نفسی طریقہ علاج میں بے پناہ مہارت رکھتا تھا.....

آج صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو بڑا بے آرام محسوس کر رہا تھا..... کوئی چیز اسے پریشان کئے جا رہی تھی لیکن وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا تھا..... آج جمعرات تھی اور اس نے حسب معمول اٹھتے ہی چرچ کی راہداریوں میں چہل قدمی شروع کر دی..... اس نے اپنے آج کے پروگرام کے بارے میں سوچا۔

دوپہر کا کھانا اسے اپنے چند دوستوں کے ہمراہ کھانا تھا..... پھر جارج کے نئے گھر کو آشیر باد دینا تھا اور پھر ڈنر پر اس کی ماں نے اسے بلا رکھا تھا..... وہ تیار ہوا اور لنچ پر اپنے عزیز احباب سے جا ملا۔

"کھانے کے بعد کا کیا پروگرام ہے؟" مائکسوو کے ایک دوست نے اس سے پوچھا۔

"مجھے ایبی ٹائیول جانا ہے۔"

"ایبی ٹائیول میں کس جگہ؟"

"دراصل میرے ایک دوست کے خاندان نے وہاں ایک گھر خریدا ہے..... 112، اوشن ایونیو!"

"ارے.....!" اس کا ایک دوست چونک پڑا۔ "یہ تو وہی روشلڈ خاندان والا گھر ہے.....!"

"ہوگا..... لیکن مجھے اس سے کیا۔ مجھے ہر قیمت پر وہاں پہنچنا ہے۔ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔" فادر مائکسوو نے جواب دیا۔

اس کے باقی دوستوں نے متفقہ طور پر اس سے ایبی ٹائیول کا پروگرام منسوخ کرنے کا مشورہ دیا مگر مائکسوو کو اپنا وعدہ پورا کرنا تھا۔

ابھی ایبی ٹائیول چند میل کے فاصلے پر تھا کہ فادر مائکسوو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بیٹھا گھبرانے لگا..... اور جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو ڈیڑھ بجے سے اوپر کا وقت تھا۔ اس نے کار گیٹ کے باہر ہی کھڑی کی اور جارج کے ساتھ مل کر کروں میں گھوم پھر کر مقدس آیتوں کا ورد کرنے لگا..... جارج کو باہر سے آواز آئی تو وہ فادر سے معذرت کر کے باہر چلا گیا مائکسوو اب کمرے میں اکیلا تھا.....!

اچانک ایک مردانہ آواز کمرے کے کسی کونے میں گونجی..... "دفعان ہو جاؤ.....!" وہ کانپ کے رہ گیا..... کمرے میں یا کمرے کے باہر کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی دعائیں پڑھیں اور مچلی منزل پر آ گیا۔ جارج اور اس کی بیوی نے وہاں آنے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور کھانے تک ٹھہرنے کی درخواست کی جسے اس نے رد کر دیا۔

فادر نے کمرے سے آنے والی نامعلوم آواز کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور کار میں بیٹھ کر واپس چل دیا..... جب وہ اپنی ماں کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو فادر نے پرسکون ہو کر جارج کے گھر پہنچ آنے والے واقعے کا تجزیہ کرنا شروع کیا۔ "ایسا کون شخص ہو سکتا تھا جو اسے اس انداز میں مخاطب کر سکتا تھا؟" لیکن اس کے فطین دماغ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا..... ماں کے گھر پہنچتے ہی وہ منہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں گیا..... یہ کیا؟..... !..... اس کی آنکھوں کے گرد پچھلے دو تین گھنٹوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اس نے سوچا شاید ایسا راستے کی وجہ سے ہوا ہے۔ لیکن وہ اس وقت تقریباً خوفزدہ ہو گیا جب بار بار دھونے پر بھی وہ سیاہی جوں کی توں برقرار رہی۔

ادھر ایبی ٹائیول میں جارج نے مکان کے رہائی حصے میں بنے کتنی گھر میں اپنے کتے میری کو 20 فٹ لمبی زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ شام کافی گہری ہو چکی تھی اور جارج دن بھر کے کام کاج کی وجہ سے بالکل تھک چکا تھا۔

چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ باقی سامان ٹریلر ہی میں رہنے دیا جائے اور اس کی منتقلی کل پر اٹھا دی جائے۔ ادھر آٹھ بجے شب کے قریب فادر نے اپنی والدہ کو الوداع کہا اور گرجا واپس آنے لگا۔ لیکن کہر کے قریب پہنچ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اس کی کار کو دائیں طرف دھکیل رہی ہے..... وہ ابھی مخمصے کے عالم میں ہی تھا کہ کار کا اگلا حصہ چکنا چور ہو گیا..... نہ کوئی ٹکر نہ کوئی حادثہ! پھر یہ سب کیا ہے؟ مائکسوو یہ سوچ کر لرز گیا..... اور کار

وہیں کھڑی کرکے قریب ہی بنے گرجا گھر میں چلا گیا..... وہاں کے پادری نے اسے رات اپنے ہاں ٹھہرنے کی پیشکش کی۔ مگر پھر اس کے مجبور کرنے پر اپنی گاڑی نکال کر اسے چھوڑنے چل پڑا۔

ادھر جارج اپنے ڈرائنگ روم میں سٹریو ٹیپ ریکارڈ فٹ کر رہا تھا تاکہ سارے دن کی تھکن کو موسیقی کی تانوں میں ڈبو دیا جائے کہ اچانک باہر میری کے بھونکنے کی آواز آئی۔ مائیکل بھاگتا ہوا اندر آیا اور ہانپتے ہوئے بتایا کہ میری بغیر کسی وجہ کے بھونکے چلا جا رہا ہے..... جارج سارا کام وہیں چھوڑ چھاڑ کے باہر لپکا..... کشتی گھر کے باہر کتا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کا گلا دبا رہی ہو..... جارج اس کے قریب پہنچا تو کتا بھڑ بھڑا چکا تھا..... مگر آدھ موا ہو کر ایک طرف لیٹ گیا جارج نے اسے چھتپایا اور کمرے میں واپس آ کر ٹیپ ریکارڈ ڈرف کرنے لگا۔

فادر مانکسو کو اپنے گرجا گھر پہنچے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا کہ اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی..... دوسری طرف وہی پادری تھا جو اسے گرجا تک چھوڑنے آیا تھا۔

"فادر جب میں آپ کو چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو ایک عجیب بات رونما ہوئی....."

فادر مانکسو اپنا سانس روکے نئے انکشاف سننے کی ہمت پیدا کر رہا تھا۔

"ہوا یوں کہ راستے میں میری کار کی ونڈ اسکرین پر لگے وائپر خود بخود تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ میں نے کار کا سوئچ تک بند کر دیا مگر ان کی جنون آمیز حرکت پھر بھی بند نہ ہوئی۔"

"فادر! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" مانکسو کے پاس کسی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

19 تا 21 دسمبر..... جارج ہڑبڑا کر بیٹھا..... اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اسے ایسے محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے سامنے دروازے پر زور سے دستک دی ہو۔ اس نے اندھیرے میں اپنی آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر دیکھا..... وہاں کون تھا؟ وہ اپنے نئے گھر کے بڑے بیڈ روم میں لیٹا تھا اور ساتھ والے بستر پر کیتھی کا جوان جسم بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ دوبارہ وہی دستک ہوئی۔

"خدایا اس وقت کون ہو سکتا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ اس نے میز پر رکھی اپنی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔ صبح کے سوا تین بجے تھے! دستک اور تیز ہو گئی شدید ہو گئی۔ جارج بادل نخواستہ بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرے میں جا کر دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی..... "یہ کم بخت ہیری کہاں مر گیا ہے؟" اس نے سوچا لیکن وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے سر کے عین اوپر کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی..... وہ غیر اختیاری طور پر ایک طرف ہٹ گیا اور اوپر چھت کی طرف دیکھا..... بچوں کے کھیلنے کے کمرے سے کسی قسم کی آوازیں آ رہی تھیں..... شاید کوئی کھلونا گر گیا ہوگا! اس نے خود کو تسلی دی..... ننگے پاؤں کھڑا ہوا جارج اب سردی کے مارے کانپ رہا تھا۔ کشتی گھر کے باہر حرکت ہوئی! اس نے پوری آواز سے کہا۔ "کون ہے؟" اسی دوران ہیری ایک دو بار بھونکا اور پھر خاموش ہو گیا۔ کوئی سایہ کتے کے بالکل قریب تھا! کتا بالکل پاگلوں کی طرح ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا، اور ساتھ ہی بری طرح بھونک بھی رہا تھا۔ جارج نے جھلا کر کھڑکی بند کی اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا..... کیتھی جاگ رہی تھی!

"کیا بات ہے جارج؟" اس نے پوچھا اور قریب پڑا لیمپ جلا دیا۔

"کچھ نہیں کیتھی!" جارج نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "ہیری شاید کسی بلی کو دیکھ کر بھونک رہا ہے میں جا رہا ہوں اسے چپ کراتے..... تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

اور یہ کہہ کر وہ کمبل اچھی طرح لپیٹتا ہوا باہر نکل گیا..... جب وہ باہر چوبی خانے کا دروازہ کھول کر کھلی فضا میں آیا تو ہیری مسلسل بھونک رہا تھا..... وہ قریب بڑھا تو سایہ دور ہٹنے لگا..... دستک کی آواز پھر ابھری اور جارج نے گزرتی رات کے آخری لمحوں میں دیکھا کہ یہ دستک کشتی گھر کے دروازے کے بار بار کھلنے اور بند ہونے کی وجہ سے سنائی دے رہی تھی۔ "وہ خدایا! میں تو پریشان ہو گیا تھا۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی..... آدھ گھنٹے بعد

جارج دوبارہ اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا..... لیکن اپنے خیالوں میں گم وہ پانچ ساڑھے پانچ بجے تک نہیں سو سکا..... اور جونہی وہ نیند کی آغوش میں گیا چند لمحوں بعد کیتھی کی آنکھ کھلی اور وہ نیم عریاں بدن گاؤن میں لپٹتی ہوئی خاموشی سے باہر نکل گئی۔

وہ سیدھی باورچی خانے میں گئی..... ابھی تک اندھیرا پوری طرح دور نہیں ہوا تھا، اس نے بتیاں آن کر دیں۔ اور کافی بنانے لگی..... ایک اسٹول کھینچ کر وہ قریب ہی بیٹھ گئی اور آئندہ دنوں کے بارے میں سوچنے لگی، اسے بہت دنوں بعد اتنا پیارا گھر نصیب ہوا تھا..... اور پھر کچھ روز بعد کرسمس آنے والی تھی..... آنے والی خوشی کا تصور کر کے اس کی پلکیں نمناک ہو گئیں.....

اچانک اسے لگا جیسے کوئی شخص اسے مسلسل گھور رہا ہے، وہ گھبرا کے اٹھی اور فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا..... اس کی بیٹی، ماٹسی دروازے میں کھڑی تھی..... وہ اسے گود میں لے کر تھپتھپانے لگی، منہ بسورتی بچی دوبارہ سو گئی۔

آج اتوار کی تاریخ تھی..... جارج ساڑھے نو بجے صبح اٹھا اور سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا جہاں کیتھی برتن سمیٹنے میں مصروف تھی۔ جارج کے سر اور داڑھی کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

"کیتھی یہاں سردی بہت ہے۔" کیتھی نے اسے غور سے دیکھا، اتنے گرم باورچی خانے میں بھی اسے سردی کا احساس ہو رہا تھا؟ اس روز جارج سارا دن ٹریلر میں لدا ہوا ناشتہ سامان اتارتا رہا لیکن آتے جاتے اس کے لبوں پر ایک ہی بات تھی۔ "سردی بہت ہے۔" وہ ڈرائنگ روم کے آتش دان میں مسلسل لکڑیاں جھونک رہا تھا۔ تھرمامیٹر کا پارہ 75 درجے فارن ہائیٹ سے بھی متجاوز کر چکا تھا، مگر کیتھی حیران تھی کہ وہ ابھی تک ہڈیوں میں جمتی سردی کی شکایت کئے جا رہا تھا..... دن کا باقی حصہ جارج نے آتش دان کے سامنے گزارا اور کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا، کیتھی نے اسے کئی بار مدد کے لئے بلایا لیکن وہ ہوں ہاں کر کے رہ گیا..... تھکی ہاری کیتھی رات دس بجے ہی سو گئی، لیکن جارج آدھی رات تک وہیں بیٹھا آگ تاپتا رہا..... یہ تبدیلی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی..... رات مزید آگے بڑھی اور صبح پورے سوا تین بجے جارج ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اسے یہی خیال بار بار ستائے جا رہا تھا کہ اس نے کشتی کا دروازہ باہر سے بند کیا ہے یا نہیں!

اگلے دونوں میں 112 اوشن ایونیو کے ہر مکین کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ جارج نے نہانا اور داڑھی کا خط بنانا ترک کر رکھا تھا اور وہ مسلسل دفتر سے غیر حاضر ہو رہا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اسے ہر لمحے یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ کمروں میں سردی بے پناہ ہے، چنانچہ وہ اپنا سارا وقت آتش دان کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتا اور پھر کشتی آگ میں لکڑیاں جھونکتا رہتا، مگر سردی تھی کہ اس کے رگ و پے میں نجانے کہاں سے سرایت کر آئی تھی۔

نئے گھر میں یہ ان کی تیسری رات تھی اور جارج صبح سویرے چنانچہ وہ اپنا سارا وقت آتش دان کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتا جیسے دوبارہ جاگ گیا..... اور تین راتوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا تھا..... چوتھی رات کے دوران دونوں میاں بیوی میں خاصی تلخ کلامی ہوئی جو ان سب کے لئے بالکل خلاف معمول بات تھی!

22 دسمبر..... آج پیر تھا اور علی الصبح ایمی ٹائیول کا پورا علاقہ دبیز کہر کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ 112 اوشن ایونیو کے اندر کرسٹوفر، دانیال اور ماٹسی اپنے کھیل کے کمرے میں کودنے پھاندنے میں مگن تھے۔ جارج آتش دان کے سامنے بیٹھا سردی کو کوس رہا تھا اور کیتھی باورچی خانے میں بیٹھی ان چیزوں اور تحائف کی فہرست بنا رہی تھی جو کرسمس کے لئے خریدنا ضروری تھے.....

ابھی وہ آدھی فہرست ہی بنا پائی تھی کہ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی جگہ پر گڑ چکی ہو۔ اس کا قلم والا ہاتھ ہوا میں ہی ساکت ہو کے رہ گیا..... اس کے عقب میں کسی شخص نے اسے سینے سے لگایا تھا..... ! پھر اسی مخلوق نے اس کا ہاتھ تھاما اور بے پناہ ملائمت سے چھتپایا.....

کیتھی کی آنکھیں ابل آئی تھیں..... لیکن پھر بھی وہ خوفزدہ نہیں تھی..... وہ کس اپنے اندر عجیب سی مانوس حرارت سوئے تھا، اسے یوں لگا جیسے کوئی ماں اپنی ڈری سہمی بیٹی کو سہلا رہی ہو!

"ماما یہاں آیئے..... جلدی....." یہ کرسٹینا ڈرکی آواز تھی اور تیسری منزل کے برآمدوں سے آرہی تھی! کیتھی نے نظریں اٹھائیں..... بس غائب ہو چکا تھا..... وہ بھاگتی ہوئی بچوں کے پاس چلی گئی..... تینوں بچے غسل خانے میں کھڑے چیخ رہے تھے..... کیتھی نے باتھ ٹب اور واش بیسن پر نگاہ ڈالی..... اجلے اور دکھتے ہوئے بیسن سیاہ کالے ہو چکے تھے! انہوں نے یہاں منتقل ہونے سے پہلے ان سب پر سفید پالش کروائی تھی..... پھر اچانک یہ سیاہی.....؟" کیتھی پریشان ہوگئی اور ایک برش لے کر رنگ پر رگڑنے لگی مگر بے سود! وہ رنگ وہاں جوں کا توں موجود رہا۔ باورچی خانے والا واقعہ اس کے ذہن سے بالکل اتر چکا تھا اور اب وہ اس نئی مصیبت میں مبتلا نظر آرہی تھی..... اس نے سارے نل کھول دیئے اور دانیال کو اپنے بیڈروم سے روغن لانے کو کہا..... امی! امی دانیال چیخا تو وہ بدک اٹھی..... وہ اس کے بیڈروم میں چیخ رہا تھا..... "ماما آپ کے باتھ ٹب میں بھی وہی سیاہی بکھری ہوئی ہے..... وہ حواس باختہ سی سیڑھیاں اترتی ہوئی اپنے بیڈروم تک جا پہنچی۔ سارے کمرے میں ایک نامانوس سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک گئی! اس نے آج تک ایسی پرفیم استعمال نہیں کی تھی، پھر یہ خوشبو..... اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں اور جارج کو آواز دی۔

جارج اوپر آیا تو اس نے سب سے پہلے کیتھی کے سلائی والے کمرے میں جھانکا..... اسی کمرے سے پہلی رات کھڑکی کھول کر اس نے کشتی گھر کے باہر ایک سایہ دیکھا تھا۔ کھڑکی ابھی تک کھلی تھی..... لیکن یہ کیا.....؟ چیخ اس کے حلق میں گھٹ گئی تھی..... کھڑکی کے شیشوں پر بلا مبالغہ ہزار ہا کھیاں بھنبھنا رہی تھیں!!

"اوہ خدایا! کھیاں، مگر اس موسم میں تو کھیاں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں....." اتنے میں کیتھی وہاں آ پہنچی تھی۔

"ہوسکتا ہے کھیاں اس خوشبو کے تعاقب میں یہاں تک آگئی ہوں!" کیتھی نے دانشوروں کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!" جارج نے معنی خیز انداز میں کہا۔ مگر برف باری کے موسم میں آج تک کسی نے مکھی دیکھی ہے.....؟ اس بات کا کیتھی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا..... بلکہ ایسی باتوں کا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا..... حیرت کی بات یہ تھی کہ کھیاں صرف ان دو شیشوں پر بھنبھنا رہی تھیں..... باقی سارا کمرہ ان کے وجود سے بالکل پاک تھا..... جارج بے تحاشا انہیں مارنے لگا۔ کسی مکھی نے اڑنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ڈھیر ہوتی گئیں اور کیتھی کے کمرے کی پھیلی مہک آہستہ آہستہ زائل ہوتی گئی۔

شام چار بجے ذرا دھوپ نکلی تو بچے باہر کھیلنے چلے گئے۔ جارج نے کرسمس کی شاپنگ کرنے سے صاف انکار کردیا اور سردی کا بہانہ کرتے ہوئے کیتھی کو ہدایت کی کہ وہ خود ہی چیزیں خرید لائے..... وہ واپس ہوگئی مگر اس وقت کچھ نہ کرسکتی تھی..... اس رات وہ جلدی سونے چلے گئے۔ اور پھر صبح سوا تین بجے جب جارج کو بے اختیار ہو کر اٹھنا پڑا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... نیچے باڑ کے باہر لگا ڈیڑھ درجن وزنی دروازہ ٹوٹا پڑا تھا..... ایک تختہ ابھی تک چوکھٹ کے ساتھ ایک کنسے کی طرح لٹک رہا تھا۔

23 دسمبر جب کیتھی بیدار ہوئی تو جارج ٹوٹے ہوئے دروازوں کے تختوں سے برسر پیکار تھا۔ وہ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے ہوئے ایک ہی سانس میں نیچے جا پہنچی۔

"یہ کیا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے خود کچھ پتا نہیں چلا۔" جارج نے غیر یقینی کے عالم میں جواب دیا۔ "لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ دروازے کا تالا اور ہینڈل اندر سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ باہر سے نہیں یعنی کوئی شخص گھر کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کررہا تھا..... بلکہ..... بلکہ اندر سے باہر جانے کی سی میں مصروف تھا!"

"بچے کہاں ہیں؟" کیتھی کے ذہن میں پہلی بات یہی آئی اور وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی..... مائسی اونگھ رہی تھی..... اپنے بستر پر لیٹی تھی اور اس کے پاس ہی اس کی گڑیا پڑی تھی۔

"مائسی بیٹے!" کیتھی نے خاصی بلند آواز میں کہا۔

لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اس کے بال سہلائے اور اس کا ماتھا چومتی ہوئی باہر نکل آئی۔ پھر وہ دوسرے بچوں کے کمرے میں گئی..... وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے لیکن اوندھے منہ.....!! کیتھی نے یہ بات شدت سے محسوس کی کیونکہ بچے آج تک اس حالت میں سوتے ہوئے نہیں پائے گئے تھے!!

صبح ہوئی تو بوند باندی شروع ہوگئی..... جارج حسب معمول دفتر جانے سے بالکل انکاری تھا..... آتش دان کے قریب بیٹھا وہ یکسی بڑبڑاتا رہا تھا کہ ہڈیوں میں چبتی اس سردی کو آخر باقی گھر والے کیوں محسوس نہیں کرتے..... شام کو انہوں نے قریبی دکان سے تالے مرمت کرنے والے کو بلایا اس نے جاتے جاتے کہا کہ "رعلڈ نے بھی کئی مرتبہ کشتی گھر کے دروازے کے تالے کی مرمت کروائی تھی۔ کیوں کہ تالا ہر مرتبہ اندر سے ٹوٹتا تھا..... جیسے کوئی شخص باہر جانا چاہتا ہو....."

جارج نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، مگر کیتھی کا اشارہ پا کر چپ ہوگیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قصبے والے پھر ان کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ شام کو کیتھی بچوں کو دیکھنے گئی تو مائسی کے کمرے کے باہر ٹھٹک گئی اور پھر دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ بچی آنکھیں بند کیے..... کشتی گھر کی جانب منہ کیے کچھ گنگنا رہی تھی..... کیتھی نے اسے آج تک گنگناتے نہیں سنا تھا..... اور ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ مائسی کی آواز نے اسے لرزا دیا۔

"اسے کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟" اس نے گھبرا کر سوچا۔

"ماما..... کیا فرشتے باتیں کرسکتے ہیں؟" مائسی کا لہجہ بالکل عجیب سا ہو رہا تھا، وہ سکتے میں آگئی! اور اس سے چند باتیں کرتی ہوئی سراسیمہ سی واپس نیچے آگئی..... نیچے آکر وہ سلائی والے کمرے میں داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ ایک ناگوار بو نے اس کا احاطہ کرلیا..... اس نے دروازہ کھول کر بتی جلائی کمرہ خالی پڑا تھا..... سوائے ایک سنہری صلیب کے جو جارج کے ایک دوست نے اسے تحفے میں دی تھی..... کیتھی کی چیخیں اس کے حلق میں گھٹ گئیں اور اس کا سارا جسم لرز کے رہ گیا..... یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص اس کا گلا دبا رہا ہے..... صلیب کمرے کے عین وسط میں الٹی لٹک رہی تھی!!

24 دسمبر کل کرسمس ہے اور 24 دسمبر کی صبح فادر مانکسو شدید فلو کا شکار ہوگیا۔ صبح چار بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ بخار میں پھنک رہا تھا اور اس کے ذہن میں 112 اگست الیونتھ کا وہ کھوکھلا سا کشتی گھر صاف نظر آرہا تھا..... فادر کو جارج کے گھر گئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا..... "پھر اس گھر کا خیال بار بار میرے ذہن میں کیوں آرہا ہے؟" اس نے سوچا اور بے بسی سے آنکھیں بند کرلیں۔

اور عین اسی وقت کیتھی بھی دوسری منزل پر واقع اسی کمرے کے بارے میں سوچ رہی تھی جسے اس نے سلائی کا کمرہ بنایا تھا..... لیکن چند ہی دیر بعد اس نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور نیچے جا کر بچوں سمیت کرسمس کے تحائف سجانے لگی۔

ادھر ڈاکٹر نے فادر مانکسو کو بتایا کہ وہ شدید نزلہ میں مبتلا ہے اور اسے تمام مصروفیات ختم کرکے چند روز مکمل آرام کرنا ہوگا۔ وہ سارا دن بستر پر پڑا رہا۔ فادر کچھ اور تو نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن جارج کے گھر کی دوسری منزل پر واقع سلائی والے کمرے کے بارے میں طرح طرح کے خیالات سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کرسکا۔ شام پانچ بجے اس نے سوچا کیوں نہ جارج کو فون پر اپنے خدشات سے آگاہ کردے۔

ٹیلی فون وانیال نے ریسیو کیا..... کیتھی اس غیر متوقع کال پر حیران ہوئی لیکن آتش دان کے سامنے بیٹھا جارج سارا دن یکسی سوچتا رہا تھا کہ اسے فادر مانکسو سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ رسمی دعا سلام کے بعد فادر مانکسو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جارج دیکھو وہ دوسری منزل والے کمرے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟ میرا مطلب ہے کہ میں کچھ عرصے سے یہ سوچ رہا تھا....."

"اوہ وہ کمرہ!" جارج نے اس کی بات کاٹتے ہوئے

عجلت میں کہا۔ ”فادر اس روز کمرے میں ہزار ہا کھیاں بھنبھنا تی ہوئی پائی گئی تھیں۔“

”میری بات ذرا غور سے سنو جارج!“ فادر بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔ ”میں چاہتا ہوں تم میں سے کوئی شخص بھی اس کمرے میں نہ جائے.....!“

”لیکن کیوں فادر؟ کیا بات ہے؟“ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے ان کا رابطہ بالکل غیر معمولی طور پر منقطع ہو گیا..... دونوں طرف عجیب عجیب آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور انہوں نے بے بس ہو کر فون رکھ دیئے۔

مزید تشویش ناک بات یہ تھی کہ اس کے بعد جارج نے کئی دفعہ فادر کا نمبر ملایا لیکن لائن درست ہونے پر بھی اس کا رابطہ فادر سے قائم نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مانکسوات آٹھ بجے تک جارج کو فون کرتا رہا لیکن ہر بار یا تو لائن کٹ جاتی یا نمبر ملتے ہی آوازوں میں گم ہو جاتا..... فادر کو یقین تھا کہ جارج نے سلائی والے کمرے کے بارے میں اس کی بدلیات سن لی ہیں..... اسے نہ جانے یہ احساس کیوں ہوتا جا رہا تھا کہ 112 اوشن ایونیو محفوظ جگہ نہیں ہے..... چنانچہ اس نے مقامی پولیس سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کو کیتھی کی والدہ اور بھائی ان سے ملنے آ گئے۔ گھر کے تمام مکین نچلی منزل میں جمع تھے اور کرسمس کا درخت سجا رہے تھے۔ اچانک اوپر سے کھڑکی کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ جارج نے سب کو آرام سے بیٹھنے کو کہا اور خود اوپر چلا گیا..... آوازیں دوسری منزل کے اسی منحوس کمرے سے آ رہی تھیں.....!! جارج جب واپس آیا تو پسینے میں شرابور تھا۔

”تم لوگوں میں سے آج کوئی سلائی والے کمرے میں گیا تھا؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تو سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مگر کیا بات ہے؟“ کیتھی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ”سلائی والے کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھلے ہے اور وہاں بیشمار کھیاں شیشوں پر چپکی بھن بھن کر رہی ہیں۔“ کیتھی زرد پڑ گئی اتنے میں باہر سے بہت زور کے دھماکے کی آواز آئی اور ساتھ ہی بلند دستک نے ماحول کی ہولناکی میں مزید اضافہ کر دیا..... سارے لوگ اکٹھے بدحواس یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

”یہ کشتی گھر کا دروازہ ہے۔“ جارج نے کہا اور باہر کی طرف لپکا۔

”کیتھی یہ سب کیا ہے آخر؟“ کیتھی کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

”ممی مجھے خود پتا نہیں یہ کیا ہو رہا ہے.....“ اور کیتھی نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں..... جس وقت جارج بڑی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا تو ایک آدمی اسے دیکھ کر چھپ گیا..... یہ شخص اس گھر کو بہت پہلے سے جانتا تھا..... وہ سامنے کھڑی ایک کار میں گھس گیا اور غور سے جارج کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگا۔

25 دسمبر انہیں نے گھر میں مقفل ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا..... اور آج صبح سوا تین بجے جارج حسب معمول کسی انجانی قوت کے زیر اثر دوبارہ بیدار ہو گیا۔ اس نے آنکھیں ملیں اور کیتھی کو دیکھا..... وہ اوندھے منہ پڑی سو رہی تھی۔ جارج نے پیار سے اس کا ماتھا چھوا تو اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں..... وہ گھبرا سا گیا..... کیتھی کی آنکھوں میں موت رقص کر رہی تھی۔

”اسے سر میں گولی ماری گئی تھی!“ وہ چیخی ”اسے سر میں گولی لگی تھی..... میں نے دھماکے کی آواز خود سنی ہے!“ سراسیمہ رساں فریڈ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیتھی خوفزدہ کیوں ہو گئی تھی..... فریڈ فادر کی درخواست پر اس گھر کی نگرانی کر رہا تھا اور ایک برس پہلے بھی وہ رونلڈ کے گھر کے پہرے پر مامور تھا.....!

اس رات اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ رونلڈ کی ماں کو سر میں گولی لگی تھی..... اس وقت جب وہ اپنے بیڈ روم میں اوندھے منہ سوئی ہوئی تھی..... اور اب کیتھی کو بھی اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ رونلڈ کی ماں کو گولی کہاں اور کس پوزیشن میں لگی تھی..... حالانکہ پولیس نے آج تک یہ بات پریس میں نہیں دی تھی..... جارج کو پھر کشتی گھر آوازیں دے رہا تھا..... اس نے کیتھی کو تسلی دی اور خود نیچے

چلا آیا..... ہیری اسے دیکھ کر غرایا مگر پھر چپ ہو گیا..... صبح کاذب کا ہولناک سناٹا چاروں طرف بکھر گیا..... جب جارج کی نظر اپنی بیٹی مانسی کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی اور وہ یکدم زرد ہو گیا..... مانسی وہاں کھڑی اسے گھور رہی تھی اور اس کے عین پیچھے ایک خنزیر چہرہ جارج کو صاف نظر آ رہا تھا..... خنزیر کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں بھی جارج پر جمی ہوئی تھیں۔

”مانسی!“ وہ چلایا اور گھر کی سمت میں بھاگ پڑا اور فوراً ہی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا مانسی کے کمرے تک جا پہنچا مانسی اپنے بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ ”مانسی!“ اس نے ایک دو بار اسے بلایا۔ مگر وہ تو گہری نیند سو رہی تھی..... اچانک جارج کے عقب میں کسی چیز کے تڑخنے کی آواز آئی۔ وہ مڑا..... کشتی گھر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب ہی مانسی کی جھولا کرسی پڑی تھی جو ابھی تک ہل رہی تھی!

چھ گھنٹے بعد..... صبح نو بجے دونوں میاں بیوی قدرے پریشانی کے عالم میں باورچی خانے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، وہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور کسی آسیب یا بھوت پریت کو تسلیم کرنے پر کسی قیمت پر تیار نہ تھے..... لیکن جو کچھ ان کے آس پاس ہو رہا تھا، انہیں ان کا متحرک بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

آج سارے امریکہ میں کرسمس منائی جا رہی تھی..... جارج اور کیتھی کچھ دیر کے لئے بچوں کے پاس چلے گئے۔ وہ کرسمس کے درخت کے گرد بچھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لیکن جارج یہاں بھی مانسی کے چہرے پر پھیلے کسی انجانے سائے کو محسوس کرتا رہا۔ کیتھی نے فادر مانکسو کا نمبر ملانے کی کوشش کی مگر بے سود..... کوئی چیز ان کا رابطہ قائم ہونے سے روک رہی تھی۔ مگر کیا چیز.....؟ یہ بات نہ جارج اور کیتھی جان سکے تھے اور نہ ہی بخار میں پھنکتا ہوا پادری۔

جارج کا سوڈ آج پہلی مرتبہ نارمل نظر آ رہا تھا چنانچہ کیتھی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اس سے کچھ شاپنگ کرنے کے لئے کہا تو وہ فوراً رضامند ہو گیا۔

”بچے، تم لوگ اپنے کمروں ہی میں رہنا اور ہاں دیکھو سلائی والے کمرے میں ہرگز نہ جانا.....!“ انہوں نے جاتے جاتے بچوں کو ہدایات جاری کیں۔

”مجھے پتہ ہے سلائی والے کمرے میں ہم کیوں نہیں جا سکتے..... وہاں میرا دوست جوڈی جو ہے!!“ مانسی نے بڑے اطمینان سے کہا..... دونوں میاں بیوی ششدر رہ گئے۔ ”جوڈی میرے دوست کا نام ہے!“ مانسی نے وضاحت کی لیکن دونوں نے اسے محض بچی کے ذہن کی پیداوار اور سمجھا اور باہر چلے گئے۔

آدھی رات سے ذرا پہلے گھر کا ہر فرد سخت سردی کی شکایت کرنے لگا..... جارج نے سارے ہیٹروں کو چیک اپ کیا، وہ پوری رفتار سے بھڑک رہے تھے مگر کمرے کسی طور گرم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے۔ یوں لگتا تھا سردی سارے بندھن توڑ کر ان کی شریانوں کا خون تک جما ڈالے گی.....

ادھر پندرہ میل دور چرچ میں فادر مانکسو کی آنکھ کھلی تو وہ سردی سے کانپ رہا تھا..... اس نے ہیٹر تیز کر دیا اور اپنے اوپر دو چار کمبل اور ڈال لئے۔ لیکن سردی تھی کہ کمبل چیر کر اسے منجمد کئے جا رہی تھی..... اوہ خدایا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس نے بے بسی سے سوچا اور لرزتی آنکھیں موند لیں۔

26 دسمبر صبح ٹھیک سوا تین بجے جارج اٹھا کشتی گھر کا طواف کیا اور دوبارہ سونے کے بجائے آتش دان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ سارا دن برف کی تہہ مزید موٹی قلعیں سفید چادریں تانتی رہیں اور بچے اپنے کمروں میں کھلونوں سے برسرپیکار رہے.....

ماحول آج قدرے پرسکون تھا۔ کیتھی باورچی خانے میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ کل ایمی ٹائنول کی سپر مارکیٹ میں جا کر چند اشیائے خوردنی لے آئے جن کا ذخیرہ بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے لیکن اس نے ابھی اپنی نوٹ بک پر سبب کا جام ہی لکھا تھا کہ کمرا ہی نا مانوس مہک سے بھر گیا جو ٹھیک اسی روز پہلے اس نے اپنے بیڈ روم میں محسوس کی تھی..... اوہ وہیں منجمد ہو گئی..... اس نے چاروں طرف آنکھیں گھمائیں..... باورچی خانہ بالکل خالی تھا۔ پھر بھی کوئی چیز جو آہستہ آہستہ اس کی سمت بڑھ رہی تھی۔

قریب.....اور قریب.....اس کی کرسی کے پیچھے.....!!

خوف کے مارے کیتھی کی زبان گنگ ہوچکی تھی اور پھر.....پھر ایک انسانی جسم نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ لمس نسوانی لمس تھا! خوشبو اور بوجھل ہوگئی.....کیتھی کا سر گھوم رہا تھا.....کیتھی کے قریب ہی ایک سرگوشی ہوئی۔

"نہیں.....میں.....میں.....میں!" اس کی چیخ تیرتی ہوئی مکان کے اردگرد بکھر گئی۔ "چھوڑو.....خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو" وہ گھگھیا رہی تھی.....لپٹ اور شدید ہوگئی۔ وہی مادر اتھا تھی کا کندھا سہلانے لگا.....اور پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ باورچی خانے میں صرف بلّی ہی سہمی باقی رہ گئی تھی.....!

کیتھی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.....ایک ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا.....اس نے دہشت زدہ ہو کر آنکھیں کھول دیں.....سامنے ماں کھڑی تھی۔

"روؤ نہیں مما! جوڈی کہتا ہے آپ کو رونا نہیں چاہئے.....اس نے بتایا ہے کہ سب کچھ جلد ہی ٹھیک ہوجائے گا۔"

27 دسمبر.....کی رات کو جارج کیتھی اور بچے کیتھی کے بھائی کی شادی میں شریک ہونے چلے گئے تھے۔ اس گھر میں آنے کے بعد یہ ان کی پہلی تفریح تھی، چنانچہ انہوں نے جی بھر کے لطف اٹھایا اور جس وقت وہ واپس گھر پہنچے تو رات کا ایک بجا چکا تھا.....جارج سیدھا سٹڈی گھر کے دروازے کو دیکھنے لگا، وہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح سلامت قائم تھا۔ بچے اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکے تھے اور جارج نے کئی دنوں بعد پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کیتھی اس کی منکوحہ ہے۔ جوان اور گداز جسم کی مالک جس کے جسمانی نشیب و فراز نے اسے پہلی ہی ملاقات میں دیوانہ بنا دیا تھا.....اس کے جسم کے ہر حصے میں طاقت اور مقناطیس لگے ہوئے تھے جو مردوں کو خواہ مخواہ اپنی جانب مبذول کرلیتے تھے.....یہ جسم جارج کی ملکیت تھا اور وہ اس سے لاپرواہی برت رہا تھا.....بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے ساتھ لیٹی کیتھی کے جسم سے مہین ریشم کا لباس ہٹایا تو مرمریں جسم دمک اٹھا.....وہ اس کی نیت بھانپ کر مسکرائی اور اس کی جانب کھسک آئی.....جارج کی گرم آغوش میں وہ سب کچھ بھلا بیٹھی تھی!!

اور پھر اسی رات کیتھی نے ردولف کے گھر والوں کو خواب میں دیکھا.....ایک برس قبل اسی خواب گاہ میں ایک مرد اور ایک عورت برہنہ بغلگیر لیٹے تھے.....لیکن وہ مرد اس عورت کا شوہر نہیں تھا.....یہ بات کئی ماہ بعد کیتھی کو پتہ چلی کہ مسز ردولف کا معاشقہ بھی ایک مقامی مصور کے ساتھ چل رہا تھا جو اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں کئی بار اس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

صبح ہوئی تو جارج کئی دنوں بعد دفتر جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ واپس آ کر وہ اور کیتھی تہہ خانے میں چلے گئے تاکہ وہاں جارج کے دفتر منتقلی کے سلسلے میں چند ضروری تبدیلیاں کی جاسکیں۔ تہہ خانہ خاصا وسیع و عریض تھا اور اس کے ایک جانب عین اس جگہ جہاں سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں چند لکڑی کی الماریاں تھیں۔ جارج نے کیتھی کو الماریاں صاف کرنے پر لگادیا اور خود فرنیچر ادھر ادھر کرنے لگا۔

"جارج!!" کیتھی کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ فوراً مڑا۔ "دیکھو یہ تختے اوپر اٹھ سکتے ہیں!" اس نے الماری کے اطراف میں لگے تختے کی طرف اشارہ کیا۔ جارج نے وہاں جا کر غور سے دیکھا تو ایک درز نظر آئی.....اس میں ہاتھ ڈال کر اس نے زور سا زور لگایا تھا کہ ان دونوں کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی.....سیڑھیوں کے نیچے ایک خفیہ کمرہ تھا جس کا علم انہیں آج تک نہیں تھا.....وہ دونوں کمرے میں داخل ہوگئے.....ایک عجیب بات یہ تھی کہ سارے کمرے میں ایک بھی چیز نہ تھی اور اس کے چاروں طرف سرخ روغن کیا گیا تھا.....یہ بدبو!" جارج نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ "یہ بو تو یوں لگتا ہے کہ جیسے انسانی خون کی ہو.....!" اور وہ دونوں دہشت زدہ ہو کر باہر نکل آئے۔ دروازہ بند کرتے وقت جارج کو یوں لگا جیسے اس نے تختے پر کوئی شبیہہ بنی دیکھی ہے۔ یہ بات اسے بعد میں پتہ چلی کہ وہ شبیہہ ردولف کی تھی!!

28 دسمبر.....آج اتوار تھا اور فادر مائکسو خود کو قدرے بہتر محسوس کررہا تھا۔ اس نے سراغ رساں فریڈ کو بلایا اور اس سے گزشتہ برس ہونے والے 112 اوشن ایونیو میں قتل عام کی پوری تفصیل سنیں اور پھر اس سے درخواست کی کہ اس کے ذہنی خیال میں یہ کچھ مافوق الفطرت مخلوقات کا شر کار ہوسکتا ہے.....اس لئے وہ کسی سارجنٹ کی ڈیوٹی لگادے تاکہ جارج کے خاندان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے۔ سراغ رساں فریڈ نے حامی بھری اور ایلی ٹائیل کی طرف چلا آیا..... **112** اوشن ایونیو کے قریب ہی ایک ریستوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک سا منے ایک مخصص ریستوران کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا حلیہ اور چال ڈھال بالکل ردولف جیسی تھی.....!! ریستوران ویران پڑا تھا..... اور آرکسٹرا بجانے والے کہیں غائب تھے.....ایک بوڑھا ملازم کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا، گاہک آتے دیکھ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا..... جارج نے ایک اسٹول کھینچا اور ڈسکی کا آرڈر دیا۔ بوڑھے نے جام اس کے سامنے رکھا..... اتنے میں جارج ہیٹ اتار چکا تھا..... بوڑھے نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ وہیں ساکت ہوگیا..... "آپ..... آپ.....؟" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"بھئی میں جارج ہوں اور تمہارے قصبے میں نیا آیا ہوں۔" جارج نے بوڑھے کی پریشانی دور کرتے ہوئے اطمینان سے کہا اور ڈسکی کی چسکیاں لینے لگا..... لیکن بوڑھا عجیب بے چینی میں مبتلا تھا..... وہ بار بار جارج کا چہرہ دیکھتا..... آخر کار جب جارج پیسے دے کر جانے لگا تو بوڑھا زہد ہ سا اور پوچھ ہی بیٹھا کہ "وہ کہاں رہتا ہے؟"

"112 اوشن ایونیو۔" اور یہ کہہ کر جارج باہر نکل آیا..... وہ بوڑھے کو نہ دیکھ سکا، جس کے ہاتھ سے شیشے کا جام گر کر چور چور ہوگیا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

کیتھی نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی..... سہ پہر کے چار بجے تھے..... جارج ابھی تک واپس نہیں آیا اس نے سامنے پڑے بت کو دیکھا..... مٹی سے بنا ہوا شیر کا بت جس پر خوب صورت روغنی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ جارج گزشتہ کرسمس کے موقع پر گھر لایا تھا..... یہ کیا! اچانک شیر اپنی جگہ سے کھسکنے لگا! اور بھی ہولناک کیتھی پسینے میں شرابور کمرے سے باہر آگئی۔

29 اور **30** دسمبر.....پیر کی صبح جارج نیند سے بیدار ہوا تو اس کا نشخا سوجا ہوا تھا۔ رات وہ مٹی کے شیر پر سے پھسل گیا تھا جو نہ جانے کیسے زمین پر پڑا رہ گیا تھا..... لیکن جو بات مسلسل کیتھی کو پریشان کررہی تھی وہ یہ تھی کہ جارج کے منحنے پر دانتوں سے کاٹنے کے واضح نشانات موجود تھے.....!! آج جارج کو اپنے دفتر بھی جانا تھا چنانچہ وہ ناشتہ کرتے ہی نکل گیا..... دوپہر تک وہ دفتر کی کاموں میں الجھا رہا۔ واپسی پر معاً اس کے ذہن میں گزشتہ برس **112** اوشن ایونیو میں ہونے والے قتل عام کا خیال آیا..... اس نے کار کا رخ مقامی اخبار کے دفتر کی طرف موڑ دیا اور چند ہی لمحوں بعد وہ ریکارڈ پر جھکا ہوا تھا۔

ریکارڈ سے ظاہر ہوتا تھا کہ قتل کا وقت صبح تین بجے سے ساڑھے تین بجے کا تھا، یعنی اس وقت جب خود جارج کسی انجانی طاقت سے مغلوب ہو کر جاگ اٹھتا تھا..... وہ خوفزدہ ہوگیا! اور اس وقت تو وہ تقریباً حواس باختہ ہوگیا جب واپسی پر اس کی کار کا ایک پہیہ اچانک الگ ہوگیا..... وہ بے حد آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا خود نہ خطرناک حادثے سے بچ نہ سکتا تھا، اس نے نیچے اتر کر دیکھا..... پہیے کے بولٹ بالکل صحیح سلامت تھے۔ پھر یہ الگ کیسے ہوئے.....؟ اس سوچ نے اسے پاگل بنا دیا تھا.....!

منگل کی صبح جب فادر مائکسو بیدار ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے دونوں ہاتھوں پر سرخ آبلے پڑے ہوئے ہیں..... اس نے آبلوں کو چھونے کی کوشش کی تو مارے درد کے تڑپ اٹھا..... اس کا بخار دوبارہ تیز ہوگیا تھا اور فادر کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ایک روز پہلے اس نے اپنے ہاتھوں پر سرخ روغن دیکھے تھے۔

یہ کیسے کہہ کر ان پر توجہ نہ دی کہ ہوسکتا ہے یہ بھی بیماری کی علامات ہوں..... لیکن اب..... اب تو وہ باقاعدہ آبلے بن چکے تھے۔

جارج اور فادر دونوں بدروحوں اور آسیب زدہ گھروں

پر یقین نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ دونوں معاملات اور واقعات کی عقلی وجوہات پیش کرنے سے قاصر تھے۔ اسی دوران جارج کو ایک مقامی دفتر سے اطلاع ملی کہ صدیوں پہلے ایمی ٹائیول میں دریا کے کنارے آباد انسان اس جگہ کو پاگل افراد کے لئے مخصوص رکھتے تھے..... وہ پاگلوں کو بند کردیتے تھے کہ وہ دم توڑ دیتے اور پھر ان کی لاشیں دریا میں پھینک دی جاتیں..... لیکن محض یہ بات یہ ثابت نہیں کرتی تھی کہ ان کا گھر آسیب زدہ ہے..... اور جارج نے اس خیال کو باطل ثابت کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

31 دسمبر..... علی الصبح کیتھی اپنی بیٹی کے ساتھ باہر ٹیرس میں آ گئی..... رات بھر برف باری ہوتی رہی تھی اور سارے ماحول نے سفید جامہ پہن رکھا تھا۔ جارج آتش دان کے سامنے بیٹھا شعلوں کو گھور رہا تھا..... کچھ ہی دیر بعد دونوں ماں بیٹی کو بھی اندر آنا پڑا۔ برف دوبارہ گرنی شروع ہوگئی تھی۔ صبح دیر تک فادر مائکسو اپنے ہاتھوں کو ملتا رہا۔ آبلے کل رات پھوٹ گئے تھے لیکن اب ان کی جگہ صرف سرخ سرخ نشانات باقی رہ گئے تھے اور وہ کافی سکون محسوس کر رہا تھا۔

بشپ اسکی خبر لینے آیا تو اس نے اپنے ہاتھ چھپا لئے۔ نجانے وہ یہ کیوں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے یہ بدصورت ہاتھ دوسرے لوگ نہیں دیکھیں..... اسے ایمی ٹائیول کے اس گھر پر غصہ آ رہا تھا جس میں اب جارج مقیم تھا۔ وہ بے بس ہو کر صلیب کے آگے جھک گیا اور باآواز پھیلا کر بڑی عاجزی سے دعا مانگنے لگا..... دعا کے دوران اس کے درد کا احساس زائل ہوگیا اور بعد میں جب اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی..... آبلے اور نشانات غائب ہو چکے تھے..... ! آج کی رات جشن کی رات تھی! سال نو کے آغاز کا جشن..... لیکن جارج اور کیتھی اس قدر پریشان تھے کہ مستقبل قریب میں کسی خوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے..... انہوں نے رات گئے تک آتش دان کے سامنے بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور باتیں کر کے وقت گزارنے لگے۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی گرجا گھر کے ایک کمرے میں فادر مائکسو بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا..... اس کے ہاتھ اچانک ہی درد کرنا شروع ہوگئے تھے اور اب تو ایک دوجگہ پر وہی منحوس آبلے بھی نمودار ہو چکے تھے..... اس نے بلانا خیر ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔

"فادر آپ کسی چیز کے بارے میں مضطرب تو نہیں؟" ڈاکٹر کا سوال اسے عجیب سا لگا۔ مگر جب ڈاکٹر نے یہ بتایا کہ اضطراب اور مسلسل پریشانی کے عالم میں کئی جلدی امراض جنم لے سکتے ہیں تو وہ کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔

رات اور آگے بڑھ گئی..... آتش دان کے سامنے کیتھی اور جرج ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے..... رات کے ٹھیک بارہ بجنے سے چند لمحے قبل اناؤنسر سیکنڈ گننے لگا۔ ایک دو تین اور پھر اٹھی گنتی..... دس..... نو..... آٹھ..... سات.....

اچانک کیتھی کی نگاہیں سامنے لپکتے ہوئے شعلوں پر جم گئیں۔ خوف اور دہشت نے ان کی زبان گنگ کر دی تھی۔ وہ ساتھ بیٹھے جارج کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن اس کے سارے الفاظ گم ہو چکے تھے۔ لپکتے شعلوں نے ان کی نظروں کے سامنے ایک غیر انسانی مخلوق کی شکل دھار لی تھی۔ جس کے سر پر دو بڑے بڑے سینگ اگے ہوئے تھے اور لپکتی ہوئی کئی زبانیں ادھر ادھر پڑ رہی تھیں..... اسے لگا کہ یہ مخلوق اس کی طرف بڑھ رہی ہے..... کمرے میں ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی اور کیتھی کا سارا جسم اکڑ گیا۔

جارج نے گھبرا کر شعلوں کی طرف دیکھا..... ایک سرخ آنکھ سے گھور رہی تھی۔

یکم جنوری 76ء دونوں میاں بیوی رات ایک بجے سے پہلے سو نہیں سکے تھے..... اور ابھی ان کی آنکھ لگے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ان کی آنکھ کھل گئی..... ان کے چاروں طرف دہشت اور ہولناکی رقص کر رہی تھی۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں خود بخود کھل چکی تھیں..... ان کے کبل کئی پھٹی حالت میں زمین پر پڑے تھے اور کمرہ موت کا سرد خانہ بنا ہوا تھا۔ دونوں سہمے ہوئے اٹھے۔ کیتھی کمبل اور چادریں اکٹھی کرنے لگی اور جارج بار بار ملتنی اور بند ہوتی کھڑکیوں سے برسر پیکار تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے آگے بڑھا تھا کہ اس کی نظر اوپر اٹھ گئی..... سلائی والے کمرے کا دروازہ پورا کھلا تھا اور وہاں سے روشنی چھن رہی تھی..... وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا کمرے میں جا پہنچا۔ روشنی غائب تھی! مشین کا کمرہ بند تھا اور ہوا چلنا بند ہو چکی تھی لیکن سارے گھر میں بڑیاں جمجمد کر دینے والی سردی کا پہرہ تھا۔ کیتھی اپنی بیٹی کو دیکھنے اس کے کمرے میں گئی۔ یہ کمرہ غیر معمولی طور پر گرم تھا۔ مائسی آرام سے سو رہی تھی۔

اچانک کیتھی کو کمرے میں کسی متحرک چیز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کی طرف دیکھا..... مائسی کی کرسی خود بخود ہل رہی تھی! اتنے میں جارج بھی وہاں آ پہنچا، کرسی اور تیزی سے ہلنے لگی تھی..... ! وہ کرسی کی طرف بڑھا..... کرسی یکدم بالکل ساکت ہوگئی۔

"بچی کو فوراً نیچے لے چلو۔" اس نے کیتھی کو کہا اور خود باہر نکل گیا..... ! پھر باقی رات قدرے سکون سے گزر گئی! صبح ہوئی تو کیتھی کو بہ مشکل دل سے رات کے واقعات نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا..... اس نے فادر سے رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا..... اور نمبر گھمانا شروع کیا..... دوسری طرف گھنٹی بجی.....

اچانک کیتھی کا کمرہ اس مہک سے لبریز ہو گیا..... اس کا جسم خوف کے شکنجوں میں جکڑا گیا..... فادر کے فون کی گھنٹی بجی تو وہ فوراً پکارا اور ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف خاموشی تھی!! کیتھی نے مہک محسوس کرتے ہی فون بند کر دیا تھا اور کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ شام کو جارج مارکیٹ سے واپس آیا تو سب نے اکٹھے بیٹھ کر چائے پی..... وہ آج قدرے نارمل تھے لیکن جب وہ رات کو خواب گاہ میں گئے تو کیتھی کی لرزہ خیز چیخوں نے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ اس نے سر اٹھا کر جارج کے پیچھے نظر ڈالی تھی..... وہاں دو سرخ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں..... جارج نے اسے سنبھالتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا..... وہی آنکھیں اب اس کی طرف متوجہ تھیں..... ہنسی جیسی تو وہ آنکھیں غائب ہو گئیں۔

جارج غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے دراز سے بھرا ہوا پستول نکالا اور جارج لے کر باہر نکل گیا..... تاریخ کی روشنی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ٹکریں مار رہی تھی..... اور پھر جارج کو پاؤں کے نشانات بھی مل گئے جو ان کے گھر سے شروع ہوتے تھے اور دور برف میں جا کر گم ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ انسانی پاؤں کے نشان نہیں تھے..... یہ کسی جانور کے سموں کے نشانات تھے..... بلکہ کسی خنزیر کے.....!

2 جنوری..... صبح ان کے گیراج کا آہنی دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور خنزیر کے پاؤں کے نشانات وہیں پر ختم ہو جاتے تھے..... جارج اس سلسلے میں الجھا دفتر جا پہنچا اور وہاں بھی فرصت کے لمحات میں یہی باتیں سوچتا رہا..... شدید برف باری کی وجہ سے بچوں کے اسکول ابھی تک نہیں کھلے تھے اور وہ گھر پر ہی تھے کیتھی کمروں کی صفائی میں مصروف تھی کہ اچانک اسی مہک نے اسے مجمد کر دیا..... وہ ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل ہو گئے..... لیکن یہ لمس بے حد کھردرا تھا اور اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا.....

خوف کے مارے کیتھی کی گھگھی بندھ گئی وہ تڑپ اٹھی..... "خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو..... ! رحم کرو مجھ پر....." لمس ڈھیلا پڑ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک انتہائی ناگوار اور تیز بو سارے کمرے میں سرایت کر گئی..... اور کیتھی کو دوبارہ کسی نے تھام لیا۔ یہ لمس اس کے لئے نامانوس تھا۔ کیتھی کو ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے دو غیر مرئی طاقتیں ایک ہی وقت میں اسے حاصل کرنا چاہتی ہیں..... اور پھر وہ بے ہوش ہو گئی..... ہوش میں آئی تو مائیکل اس کے سرہانے بیٹھا اسے سہلا رہا تھا..... خوف کے مارے کیتھی کا جسم زرد پڑ چکا تھا، اس نے نقاہت بھری آواز میں مائیکل کو کہا کہ فوراً اپنے ڈیڈی کو فون کر کے گھر بلالے۔

جارج اور کیتھی اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔" جارج خدا کے لئے فادر مائکسو کو بلاؤ۔" کیتھی نے التجا کی۔ "جلدی کرو جارج۔"

فادر کا فون بج اٹھا۔ "ہیلو! میں مائکسو بول رہا ہوں۔" اس نے ریسیور اٹھالیا۔

"فادر میں جارج ہوں۔" فادر کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ارے تم..... کیسے ہو؟ کیتھی اور بچے تو ٹھیک ہیں؟" اس نے ایک ہی سانس میں سارے سوالات کر ڈالے۔

"فادر آپ ہمارے گھر نہیں آسکتے؟" اسی وقت! فوراً جارج نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بے حد مشکل وقت گزار رہے ہیں..... کئی واقعات ایسے رونما ہوئے ہیں جن کے بارے میں....." اور دونوں طرف سے ٹیلیفون کی لائن میں گرگراہٹ سنائی دینے..... اور دوسرے ہی لمحے یہ رابطہ ختم ہو چکا تھا۔

3 اور 4 جنوری..... تین جنوری کی صبح فادر نے چرچ ہی میں جارج کے خاندان کے لئے دعا کروائی اور بعد میں خود بھی بڑی لجاجت سے رحم کی بھیک مانگتا رہا..... اور جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آیا تو سارے کمرے میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی..... اور چند ہی لمحوں میں یہ دم گھٹنے والی بو سارے چرچ کا محاصرہ کئے ہوئے تھی۔ سارے پادری حیران پریشان ادھر ادھر پھر رہے تھے.....

اچانک فادر مائکسو پر انکشاف ہوا کہ یہی وہ پیغام ہے جو اسے جارج کے کمرے میں "دھواں ہو جاؤ" کی صورت میں ملا تھا..... کوئی اندیکھی مصیبت اسے 112 اوشن ایونیو سے رابطہ رکھنے پر متنبہ کر رہی تھی..... اور پھر فادر کو اپنا پرانا سبق یاد آیا..... "انسانی گوشت کے جلنے کی بو آئے تو سمجھ لو کہ اس جگہ کسی بدروح کا وجود ہے!!"

رات کو جارج تہہ خانے سے لکڑیاں لینے گیا تو اس نے وہاں ایک عجیب سی بو محسوس کی جو یقیناً بنو من کی نہیں تھی۔ اس نے تجسس سے مجبور ہو کر تاریخ تھامی اور لکڑی کا وہ تختہ ہٹانے لگا جس سے خفیہ کمرے کے دروازے کا کام لیا جاتا تھا۔ سرخ کمرہ خالی تھا..... لیکن وہ بو..... انسانی گوشت کے گلنے سڑنے کی بے پناہ بو کمرے میں بھری پڑی تھی..... جارج نے کراہیت کے مارے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن اتنے میں وہ تے کر چکا تھا اور اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے تھے..... اس نے اس بات کا ذکر کیتھی سے نہیں کیا تھا.....

رات کو وہ خواب گاہ میں جانے لگے تو کیتھی دوبارہ چیخ اٹھی..... جارج نے اس طرف دیکھا جہاں کیتھی کی نظریں جمی ہوئی تھیں..... مٹی کا وہ شیر جسے صبح ہی جارج نے سلائی والے کمرے میں رکھا تھا اب ڈرائنگ روم کی دہلیز پر کھڑا ان دونوں کو گھور رہا تھا..... ایک لمحے کے لئے تو جارج کے حواس بھی بامراد ہو گئے۔ لیکن وہ اب بھی کیتھی کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی ایسی طاقت ہے جس سے مقابلہ کرنا انسانی روگ نہیں ہے..... اور پھر جب کیتھی سو چکی تھی تو جارج یکدم بستر سے اٹھ بیٹھا.....

سیڑھیوں سے انسانی قدموں کی چاپ آ رہی تھی..... اور پھر بینڈ کی موسیقی نے اپنا جادو چھیڑ دیا..... یوں لگتا تھا جیسے بینڈ بجانے والا ایک دستہ موسیقی کی دھیمی دھیمی تانیں بکھیرتا ہوا ان کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا..... وہ فوراً باہر آیا اور ساری بتیاں روشن کر دیں..... اب آوازیں بند ہو چکی تھیں اور خوفناک سناٹا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا.....

وہ الٹے قدموں واپس خواب گاہ میں پلٹ آیا۔ لیکن دہلیز عبور کرتے ہی وہ لرز کے رہ گیا۔ جو کچھ اس نے دیکھا وہ ناقابل اعتبار تھا..... ہر لحاظ سے ناقابل اعتبار کیتھی اپنے بستر سے دو ڈھائی فٹ بلند فضا میں معلق تھی۔

"کیتھی!!" وہ چیخ اٹھا۔ اس نے کیتھی کو مضبوطی سے تھام لیا..... وہ سنجیدگی کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ پہلے پہل اسے یوں لگا جیسے کیتھی کو کوئی چیز اوپر کھینچ رہی ہے لیکن پھر یہ دباؤ یکدم ختم ہو گیا اور وہ بستر پر آن گری۔ کیتھی گھرتے ہی جاگ گئی تھی..... "کیا ہوا جارج..... میں کہاں ہوں؟"

وہ آنکھیں پٹ پٹاتی ہوئی اس سے پوچھ رہی تھی..... لیکن جارج نے اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی..... اور بس..... اس روز پہلی مرتبہ جارج نے تسلیم کیا کہ وہ خوفزدہ ہو چکا تھا! لیکن وہ اتنی جلد ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

5 جنوری..... صبح ہوئی تو اس نے دفتر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور چرچ کا نمبر گھمانے لگا..... دوسری طرف سے پتا چلا کہ فادر مائکسو رات ہی اپنی والدہ کے گھر چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا..... چرچ والوں نے اسے فادر کا ذاتی فون نمبر دینے کی معذرت چاہی مگر یہ بتا دیا کہ وہ

خود فادر کو اس کے فون کے بارے میں مطلع کر دیں گے..... اور پھر کچھ دیر بعد جارج کا فون بج اٹھا.....

دوسری طرف فادر مائکسو بول رہا تھا..... جارج نے ایک ہی سانس میں فادر سے کئی باتیں کر ڈالیں اور ہر بات کے اختتام پر اس سے درخواست کی کہ کچھ بھی ہو وہ ایک بار آ کر ان کے گھر میں مقدس دعائیں پڑھ جائے۔

"جارج! میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے پاس....." اور فادر کی آواز آنا بند ہو گئی..... اب جارج کو صحیح طور پر اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی اندیکھی طاقت انہیں ملنے سے مسلسل روک رہی ہے۔ وہ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹ کے رہ گیا۔

رات سونے سے پہلے کیتھی نے بالکل خلاف معمول ایک بار بھی جارج سے وہ گھر چھوڑنے کے لئے نہیں کہا اور زیادہ باتیں کئے بغیر خاموشی سے سو گئی۔ جارج کشتی گھر میں ہیری کو دیکھنے چلا گیا اور ابھی وہ اس کی زنجیر دروازہ باندھ ہی رہا تھا کہ اسے گھر سے بینڈ کی آواز سنائی دی..... وہ فوراً آواز کی طرف لپکا..... پہلے آواز صدر دروازے کی سمت سے آ رہی تھی۔ لیکن جب وہ ادھر پہنچا تو یوں لگا جیسے آواز اب ڈرائنگ روم سے آ رہی ہو۔ ڈرائنگ روم کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس نے جونہی اندر کی طرف جھانکا آواز آنا بند ہو گئی..... وہ ہانپتا آنے ہی والا تھا کہ ڈرائنگ روم پر نظر پڑی..... کمرے کا سارا فرنیچر الٹ پلٹ ہو چکا تھا..... صوفے اوندھے پڑے تھے..... قالین اپنی جگہ سے ہٹا ہوا تھا..... یوں لگتا تھا جیسے بہت سے لوگوں نے بلکہ بینڈ بجانے والوں نے کمرہ قدموں تلے پامال کر ڈالا ہے۔

6، 7 جنوری..... چھ جنوری کی صبح فادر نے اپنے سینئرز کے سامنے ساری صورت حال واضح کر دی اور ان سے آئندہ اقدامات کے لئے ہدایات چاہیں۔ اس میٹنگ میں آرچ بشپ نے اسے واضح طور پر حکم دیا کہ وہ فوری طور پر اس معاملے سے الگ تھلگ ہو جائے اور مستقبل قریب میں 112 اوشن ایونیو جانے کا خیال تک بھی ذہن میں نہ لائے..... فادر چرچ واپس آ گیا..... اس کے کمرے سے اٹھنے والی بو خلاف توقع ختم ہو چکی تھی..... اس نے ہاتھوں پر دوائی لگانے کے لئے دستانے اتارے..... آبلے اور سرخ نشانات ایک بار پھر غائب ہو چکے تھے.....

بچوں کے اسکول کھل چکے تھے اور کیتھی انہیں اسکول چھوڑنے کے بعد سیدھی اپنی والدہ کے گھر چلی گئی تھی..... جارج گھر میں اکیلا تھا۔ اس نے گوشت جلنے کی بو کا سراغ لگانے کا فیصلہ کیا اور تہہ خانے میں جا کر خفیہ کمرہ کھول دیا..... بو بالکل ختم ہو چکی تھی..... ہو نہ ہو فرش میں کوئی سوراخ ہے جس کے ذریعے یہاں کی ہوا نکل جاتی ہے..... لیکن تلاش بسیار کے باوجود اسے ایسا کوئی سوراخ نہ مل سکا۔ اب وہ صدر دروازے کے باہر جھنگڑ میں کا معائنہ کر رہا تھا..... پاس ہی ایک کونے میں زمین قدرے بھربھری تھی..... اس نے یونہی مٹی ہاتھ سے پرے کی تو ایک ننھا سا سوراخ نظر آ گیا..... وہ کسی راز کا سراغ پانے کی جستجو میں ایک کدال لے آیا اور اندھا دھند کدال چلانے لگا۔ چند پتھر سوراخ سے نیچے جا گرے اور پھر یوں لگا کہ جیسے وہ پانی میں جا کے گرے ہوں! جلد ہی جارج پر ایک نئی حقیقت منکشف ہو چکی تھی..... اس کے گھر کے عین باہر کنواں تھا..... جو نہ جانے کتنی مدت سے ڈھکا پڑا تھا.....

جارج نے اپنے دفتر کے ساتھی ایرک سے رابطہ قائم کرنے کا ارادہ پختہ کر لیا تھا..... ایرک نے اسے بتایا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ روحوں سے گفتگو کر سکتی ہے..... !! اس نے فون اٹھایا اور ایرک کی دوست، نینگی کا نمبر ملانے لگا۔ نینگی نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دو دن میں ایرک کے ساتھ ان کے گھر آئے گی اور ساری صورتحال کا خود جائزہ لے گی۔

"سنیے!" جارج خون بہا کرنے لگا تو اچانک جیسے نینگی کو کچھ یاد آ گیا۔ "آپ کے گھر کے نواح میں کوئی کنواں تو نہیں ہے.....؟ میرا مطلب ہے ایسا کنواں جو مدت سے زیر استعمال نہ رہا ہو.....!" جارج لرز گیا اور اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن اس نے نینگی سے اس بات کا کوئی تذکرہ نہ کیا کہ اس نے آج صبح ہی ایک کنواں دریافت کر لیا ہے۔

"میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ بدروحیں عموماً غیر استعمال شدہ کنوؤں یا کھائیوں میں قیام کرتی ہیں اور ایسی

جگہ سے ایک راستہ متاثرہ شدہ کمرے تک ضرور جاتا ہے..... بہرحال ہم دیکھیں گے!" یہ کہہ کر نیگی نے تو فون بند کردیا لیکن جارج ایک نئے مخمصے میں پڑ چکا تھا، اسے ان باتوں پر یقین کرنا پڑ رہا تھا جنہیں وہ عام حالات میں کسی قیمت پر تسلیم نہ کرتا۔

چھ تاریخ کو رات گیارہ بجے فادر مانکسو کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی..... دوسری طرف وہ پادری تھا جو کئی روز قبل اسے گرجا چھوڑنے آیا تھا۔

"فادر! مجھے ابھی ابھی ایک عجیب و غریب کال موصول ہوئی ہے!" اس کی آواز سے خوف ٹپک رہا تھا۔

"مجھے ایسا لگا جیسے کوئی پراسرار آواز مجھے تنبیہہ کررہی ہے کہ..... کہ....." وہ اٹکنے لگا تھا۔

"خدا کے لئے جلدی بتاؤ کیا ہوا ہے!" فادر مانکسو خود بھی پریشان ہوگیا تھا۔

وہ آواز کہہ رہی تھی "جارج کے دوست پادری کو منع کردو کہ 112 اوشن ایونیو کا خیال دل میں نہ لائے..... ورنہ..... ورنہ..... اس کی جان خطرے میں ہے!" ریسیور فادر مانکسو کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا..... اور اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا۔

رات ہوئی تو برف باری دوبارہ شروع ہوگئی..... کیتھی نے کھانا جلدی ہی کھالیا تھا..... اور اب وہ بستر پر دھت سو رہی تھی..... جارج کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے گھڑی پر وقت دیکھا، رات کا ایک بج چکا تھا..... اچانک اس کے دماغ میں یہ بات جانے کہاں سے سما گئی کہ اسے رات کے اس لمحے سڑک والے ریستوران میں جا کر بستر پٹنی چاہئے..... بلاوجہ..... بلامقصد..... لیکن وہ اس خیال سے اتنا مغلوب ہوگیا کہ اس نے کروٹ بدلی تاکہ کیتھی کو یہ بتا سکے کہ وہ کچھ دیر کے لئے باہر جارہا ہے..... وہ مڑا.....

کیتھی اپنے بستر سے غائب تھی!! وہ بستر سے دو تین فٹ اوپر فضا میں معلق تیر رہی تھی..... جارج نے اسے تھاما اور ایک جھٹکے سے نیچے بستر پر گرادیا..... وہ جاگ چکی تھی..... جارج نے بنی آن کی اور لرز کے رہ گیا وہ نوے سالہ ایک بوڑھی عورت کے سامنے کھڑا تھا۔ کھچڑی بال..... جھریوں سے بھرا ہوا بدصورت چہرہ اور بغیر دانتوں کے پوپلے منہ سے نکلتی تھوک..... اس نے چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے..... لیکن کیتھی کی استفہامیہ نظریں اس پر مسلسل جمی ہوئی تھیں۔ کیتھی کو اپنے خاوند کے چہرے سے خوف ہویدا نظر آرہا تھا..... وہ غسل خانے کی طرف بھاگی..... سامنے آئینہ لگا ہوا تھا۔ خوف اور دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ ایک بار پھر بلند ہوئی..... جارج پکا نوے سالہ بوڑھی کی جگہ کیتھی کا اصل روپ واپس آچکا تھا لیکن اس کے چہرے پر سیاہ خراشیں ابھی تک نمایاں تھیں اور وہ بار بار دھونے پر بھی نہیں اتریں..... صبح ہوئی تو وہ خراشیں بھی غائب تھیں.....!!

اسی شام ایرک اپنی دوست بیگی کے ساتھ ان کے گھر آپہنچا! وہ سب آتش دان کے سامنے براجمان تھے۔ اچانک نیگی اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جارج کو بلا کر ساتھ والی کرسی پہ بٹھا کر کہا۔

"کیا محسوس ہوا؟"

"یہ قدرے سرد ہے!" جارج نے فوراً جواب دیا۔

"وہ ابھی یہاں بیٹھی ہوئی تھی..... اب جا چکی ہے! یہ گذشتہ بھگتی ہوئی روحیں ہیں..... اگر تم ابھی خوشبو سونگھ سکتے ہو؟" کیتھی کی پتلیاں پھیل گئیں۔ جارج نے گندھے اپنے کاندھے۔ "میں تہہ خانے میں جاتا ہوں، ہوں" نیگی کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا..... اب وہ مسلسل بول رہی تھی!

"یہ گھر کسی قبرستان کی زمین پر تعمیر ہوا تھا.....!" اس نے خفیہ کمرے کے باہر بنی الماری کی طرف اشارہ کیا..... "لاشیں عین اس جگہ دفن کی جاتی تھیں۔ یہاں ایک غیر معمولی ناگوار بو تھی....." اس کے ہاتھ مضطرب تھے، وہ تختے کو بار بار ٹٹول رہی تھی..... "کوئی نہ کوئی شخص قتل ہوا تھا لیکن..... لیکن جس جگہ وہ قتل ہوا ہے..... یا دفن ہوا ہے اس جگہ پر کچھ چیز تعمیر کی گئی ہے۔" نیگی فضاؤں میں گھور رہی تھی اور اس کا لہجہ خواب ناک ہو رہا تھا۔ کیتھی خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔

اچانک نیگی مڑی اور تہہ خانے سے باہر نکل گئی.....

کیتھی اور جارج نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل گئے..... نیگی اب دوسری منزل پر سلائی والے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ "یہ کمرہ تمہیں تکلیف دیتا رہا ہے؟" کیتھی اور جارج دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جارج سمیت اندر داخل ہوگئی..... کیتھی اور ایرک باہر برآمدے میں ہی ٹھہر گئے۔

جارج کو ایسا لگا جیسے نیگی یکدم سراقے میں چلی گئی ہے اس کے لبوں سے مردانہ آواز نکلنی شروع ہوگئی..... "میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس گھر کو روحوں سے پاک کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔" جارج کو یہ آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ کسی کے بچے اور ایک چھوٹی لڑکی..... میں خون کے دھبے دیکھ رہی ہوں..... یہاں کوئی بری طرح گھائل ہوا تھا..... کسی نے انہیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

نیگی ایک جھٹکے سے جاگ گئی..... اور کوئی بات کئے بغیر باہر نکل گئی..... ایرک بھی ان سے سلام دعا کرتا ہوا اس کے پیچھے چلا گیا..... جارج اور کیتھی کتنی ہی دیر تک بہوت کھڑے رہے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے.....

جارج ڈارنگ روم میں اکیلا کھڑا کچھ سوچ رہا تھا..... شاید اس مانوس آواز کے بارے میں جو نیگی کے منہ سے نکلی تھی..... اچانک اس کے سر کے عین اوپر لگا فانوس دھڑام سے نیچے آگرا۔ اسی لمحے اس پر منکشف ہوا کہ نیگی کے منہ سے نکلنے والی مردانہ آواز فادر مانکسو کی تھی۔

9,8 جنوری..... آٹھ تاریخ کی شام کو کیتھی کا بھائی جمی اپنی نویلی دلہن سمیت ان کے گھر آ پہنچا۔ کیتھی نے ماسی کے کمرے میں ان کے سونے کے انتظامات کردیئے اور خود ماسی کھیل والے کمرے میں سونے پر تیار ہوگئی۔ لیکن آدھی رات کے بعد جارج کی آنکھ کھلی ہی تھی کہ ماسی کے کمرے سے نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دی..... وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا پہنچا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

جمی نے اپنی بیوی کو ساتھ لپٹایا ہوا تھا اور وہ مسلسل رو رہی تھی آخر بات کیا ہے؟ جارج نے بیارے سے پوچھا۔

"میرے پاؤں کی طرف کوئی چیز بیٹھی ہوئی تھی..... جارج نے فوراً وہاں ہاتھ رکھ دیا..... وہ جگہ ابھی تک گرم تھی جیسے کوئی شخص وہاں سے ابھی ابھی اٹھ کر گرگیا ہو۔

"وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا..... مگمکین سا، اور کہہ رہا تھا۔"

جارج کے پیچھے نراخ کی آواز آئی وہ چھ کے کر دوسری سمت میں ہٹ گیا..... دروازے میں کیتھی کھڑی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" کیتھی نے اپنی بھائی سے پوچھا۔

"کہتا تھا ماسی کہاں ہے؟" لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کیتھی جا چکی ہوئی ماسی کو دیکھنے چلی گئی۔ وہ بڑے سکون سے سو رہی تھی..... وہ لوگ جمی اور اس کی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے باہر نکل آئے.....

باہر صبح کی پہلی روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ خواب گاہ میں پہنچ کر وہ دونوں باآواز بلند دعائیں پڑھنے لگے تھے کہ اچانک کمرہ عجیب سی آوازوں میں گھر گیا..... وہ ابھی پوری صورتحال سمجھ ہی نہ پائے تھے اور اپنی دعاؤں کا ورد جاری رکھے ہوئے تھے کہ آوازیں ایک جگہ جمع ہونا شروع ہوگئیں..... اور جو کچھ انہوں نے سنا اس کے بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے..... "تم چپ نہیں رہ سکتے؟" اور آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

اگلے روز فادر نے اپنے سینئرز سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔ اسے حکما کہا گیا کہ وہ وہاں جانے کا خیال قطعی ترک کردے ہاں اگر وہ چاہے تو فون پر جارج کو ہدایات دے سکتا ہے۔ ہدایات بھی کیا صرف یہ کہ وہ لوگ فوری طور پر یہ گھر چھوڑ دیں..... فادر نے ایسا ہی کیا۔ لیکن وہ اور جارج ابھی باتیں ہی کررہے تھے کہ کیتھی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں..... اس نے فون بند کیا اور نیچے ڈارنگ روم میں چلا آیا۔

مائیکل، کرسٹوفر اور ماسی سر جھکائے ایک قطار میں کھڑے تھے اور کیتھی انہیں مسلسل ڈانٹ رہی تھی..... جارج کے ہونٹوں پر آتی مسکراہٹ اس وقت نہ جانے کہاں غائب ہوگئی جب اس نے کمرے کی دیواروں اور

چھت پر نظر ڈالی۔ تمام جگہ گہرے سبز رنگ کا لجلجا مادہ بکھرا پڑا تھا..... اور چند قطرے ابھی تک چھت سے ٹپک رہے تھے..... یہ مادہ مسلسل بہہ رہا تھا۔ یہ بچوں کا کام نہیں ہے۔ اس نے کیتھی کو کہا اور پھر قریب جا کر مادہ ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بے بو، بے ذائقہ لیکن جیلی کی طرح کا یہ مادہ روغن ہرگز نہیں تھا۔

"چلو پہلے سب باورچی خانے میں جا کر کچھ کھا پی لیں۔ پھر میں اور لڑکے صفائی کر ڈالیں گے۔" اس نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لئے کہا..... اور خود باہر جانے لگا۔ کھانے کے بعد کیتھی نے تجویز پیش کی کہ انہیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے۔

میں اسی لمحے کیتھی کو یوں لگا جیسے جارج میں کسی بدروح نے حلول کرلیا ہے..... وہ سارے گھر میں پاگلوں کی طرح بھاگنے لگا..... "دفع ہو جاؤ یہاں سے! سب لوگ چلے جاؤ!" وہ بار بار یہ کہتا اور سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے کھولتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دو بار باہر بھی گیا۔ گھر سرد خانہ بنا ہوا تھا۔ اور دوسرے لوگ سہمے ہوئے آتش دان کی آخری گرم سانسیں اپنے میں جذب کر رہے تھے۔

پھر نچلی منزل پر آ کر جارج دوبارہ نارمل ہو گیا..... اس کی آنکھیں بھیگ گئیں..... کیتھی اور بچے اس کے گرد جمع ہو گئے..... اس نے سب کو گلے لگایا..... اس سارے انسانی ڈرامے کا ایک گواہ اور بھی تھا۔ سراغ رساں فریڈ جو ایجی ٹائیل کے پولیس دفتر میں جا رہا تھا اور ایک پاگل شخص کی چیخیں سن کر رک گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دیکھا کہ وہ آدمی اندر جا چکا ہے اور گھر کی کھلی ہوئی کھڑکیاں ایک عورت بند کر رہی ہے عین اسی لمحے جارج کیتھی اور بچے نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

رات سونے وقت کیتھی اکیلی ہی خواب گاہ میں چلی گئی۔ اس کا دل چاہا کہ سامنے الماری میں سے سلیب نکال کر اپنے پاس رکھ لے لیکن جو نہی وہ اٹھی..... کمرے کی ہر دیوار پر لگے شیشے میں اس کے عکس بول اٹھے..... "ایسا مت کرو! ورنہ خطرہ سارے خاندان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا!"

10 جنوری..... علی الصبح جب کیتھی بیدار ہوئی تو اس کی ناف کے گرد سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے اور اس کا سارا جسم بخار میں پھنک رہا تھا اور درد کے مارے کراہ رہی تھی۔ جارج نے دھبوں کو چھونا چاہا تو اس کا ہاتھ جھلسے ہوئے پر سے پھسلا۔ دھبے تپتے ہوئے لوہے کی طرح گرم تھے..... باہر بارش کی وجہ سے ٹیلی فون کا کھمبا گر چکا تھا اور وہ فوری طور پر طبی امداد بھی نہ حاصل کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ چند خواب آور گولیاں کیتھی کو کھلا دیں اور آدھ گھنٹے بعد وہ سو چکی تھی۔

جارج نے پرانی لائبریری سے چڑیلوں اور بھوتوں کے بارے میں ایک کتاب تلاش کی اور شام تک اس کے مطالعے میں مستغرق رہا۔ کتاب میں لکھا تھا کہ کچھ مخصوص الفاظ پڑھ کر دروحوں کو تین بار پکارا جائے تو وہ حاضر ہو جاتی ہیں..... اچانک اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا..... اس نے خوف کے مارے آنکھیں موند لیں..... اس کے کندھے پر ایک ہاتھ پڑا..... یہ کیتھی تھی۔

"ارے تم یہاں ہو؟"

کیتھی نے اپنا بلاؤز اوپر اٹھایا..... نشانات ختم ہو چکے تھے وہ بے حد نارمل اور غیر معمولی حد تک سنجیدہ تھی۔ شام تک وہ لوگ بڑی تندہی سے گھر کی صفائی میں مصروف رہے اور کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہ ہوا۔ سب کے ذہن اب اس بات کے لئے تیار تھے کہ انہیں ہر حال میں اس انسانی یا غیر انسانی قوت کا مقابلہ کرنا ہے..... جارج نے سگریٹ سلگایا اور برآمدے میں آ گیا..... اس نے پڑوس کے گھروں پر نظر دوڑائی کسی گھر کا کوئی ایک شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا! سارا دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔

ادھر گرجا میں فادر مائکسو وکبار بار یہ خیال تنگ کر رہا تھا کہ اس بے حد نازک وقت میں اپنے دوستوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے..... لیکن وہ مجبور تھا۔ اس نے جب بھی کوئی عملی قدم اٹھانے کا سوچا اس کے منہ سے خون بہہ نکلا اور شدید بخار نے اس کو جکڑ لیا.....

اب وہ اس بات سے پوری طرح متفق تھا کہ ان کا واسطہ انسانوں سے نہیں..... بدروحوں کو اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر آنے کو کہا۔ وہی چیخیں دوبارہ شروع ہو گئیں..... مائیکل کی انگلیاں کھڑکی کے شیشے تلے دب جاتی تھیں..... جارج کی پوری طاقت بھی شیشہ اوپر نہ اٹھا سکی اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ شیشہ اچانک اوپر اٹھ گیا..... مائیکل کی انگلیاں ایک غیر انسانی ہاتھ کی انگلیوں کی مانند ہو چکی تھیں۔ بالکل فلیٹ! وہ اسے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ دانیال کی ہڈیاں جلد اکٹھی صحیح حالت میں تھیں..... صرف انگلیاں چپٹی ہو گئی تھیں..... انہوں نے پٹی باندھی اور اسپرین دے کر انہیں فارغ کر دیا..... باقی رات مائیکل آرام سے سویا رہا۔ لیکن صبح جس وقت جارج کی آنکھ کھلی تو گھر کی ساری لڑکیاں اور دروازے چوپٹ کھلے تھے۔ حالانکہ سونے سے پہلے اس نے خود چٹخنیاں چڑھائی تھیں..... اور بارش کی بوچھاڑ نے سارا فرنیچر بھگو دیا تھا۔

11 جنوری..... کیتھی کی قبیلی کو یہاں رہتے ہوئے پچیس روز گزر گئے..... آج کی اتوار ان پر بہت زیادہ بھاری تھی!

12 جنوری۔ اس رات کو سب گھر والے آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے..... اور چند ہی لمحوں میں ہر شخص غلاف معمول نیند کی آغوش میں چلا گیا..... غنودگی کے عالم میں جارج نے دیکھا کہ اس کی کرسی اوپر اٹھ گئی ہے اور سامنے سے آہنی ٹوپی پہنے ایک عجیب و غریب سینگوں والی مخلوق اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جارج نے یکی چہرہ آگ کے لپکتے شعلوں میں بھی دیکھا تھا۔ پھڑپھڑاتی اتری اور اس میں سے خود جارج کا چہرہ نکل آیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھا اور سارے گھر والے اس کے گرد جمع تھے۔ پھر اچانک مائسی بول اٹھی۔ "ڈیڈی ذرا میرے کمرے تک تو آیئے..... جوڈی آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔" جارج اچھل پڑا..... اس نے باقی لوگوں کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے بنی کے پیچھے پیچھے چل پڑا..... مائسی اندر چلی گئی تھی۔ وہ ابھی تک دہلیز پر کھڑا تھا..... "کہاں ہے جوڈی؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سامنے.....!" اس نے کشتی گھر کی سمت کھلنے والی لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا..... کمرے میں اور کوئی شخص موجود نہیں تھا..... جارج نے سامنے دیکھا..... وہ ایک بار پھر لرز اٹھا..... شیشے سے دو انگاروں کی طرح سرخ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں..... نہ کوئی چہرہ، نہ جسم!

"جوڈی اندر آنا چاہتا ہے۔" مائسی بولی۔

اچانک کیتھی چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی اور ایک کرسی اٹھا کر شیشے پر دے ماری۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی کسی جانور کے چیخنے کی آواز بلند ہوئی..... وہ آنکھیں اب غائب ہو چکی تھیں۔

صبح جارج کو دفتر میں بے حد ضروری کام آن پڑا۔ بچے اسکول جا چکے تھے اور گھر میں مائسی اور کیتھی تھے۔ کیتھی نے اچانک تیار ہونا اور مائسی کو کھلانا شروع کر دیا..... اتنے میں اس کی والدہ کا فون آ گیا..... فون پر باتیں کرتے کرتے اس نے چونک کر دیکھا کہ مائسی میز کے نیچے چھپے کسی شخص سے باتیں کر رہی ہے اور وقتاً فوقتاً اک آدھ جملہ اس کی زبان سے نکل جاتا ہے۔ فون بند کر کے وہ وہاں گئی تو میز کے نیچے کچھ بھی نہ تھا..... وہ مائسی سے جوڈی کے بارے میں سوالات کرنے لگی۔

"ممی جوڈی کہتا ہے وہ فرشتہ ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ میرے والے کمرے میں پہلے ایک بچہ رہتا تھا جو مر گیا تھا۔ رات جوڈی نے کہا تھا وہ مجھے ہمیشہ یہاں رکھے گا تاکہ میں اس سے کھیل سکوں.....!" کیتھی کا ہتھ بے ساختہ اپنے ہونٹوں کی طرف اٹھ گیا..... اس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو روکا تھا.....

جارج بڑی دیر سے گھر لوٹا تھا..... اور آج ان کا ارادہ تھا کہ وہ سب لوگ بڑے کمرے میں ہی سوئیں گے..... جارج نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری رات جاگ کر واقعات کا جائزہ لے گا۔ سب لوگ سو چکے تھے، گھڑی پر سوا تین کا وقت ہوا ہی تھا کہ موسیقی بجانے والے دوستوں کی پریڈ کی آوازیں جارج کے کانوں میں پڑنے لگیں۔ لیکن جارج نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب بکواس ہے اور انہیں خوفزدہ کیا جا رہا ہے..... اور وہ اونگھنے لگا۔ جب کیتھی کی آنکھ کھلی تو جارج بری طرح چیخ رہا تھا..... مختلف زبانوں میں..... جو آج تک کسی نے نہیں سنی تھی..... اچانک اس کا لہجہ بدل گیا..... "وہ کرسٹوفر کے کمرے میں ہے! وہ کرسٹوفر کے

کمرے میں ہے، اوہ بار بار چیخ رہا تھا۔"

13 جنوری..... یعنی بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لائی وہ اٹھ بیٹھا۔

"کرسٹوفر کہاں ہے؟..... وہ اس کے کمرے میں ہے، وہ اسے پکڑ لے گا.....!" جارج دیوانہ ہو رہا تھا۔

"او ہو گھر کا کرسٹوفر تو یہاں ہے۔" اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا جواب جاگ رہا تھا۔

"ممی میں صرف تھوڑی دیر کے لئے پیشاب کرنے اوپر غسل خانے میں گیا تھا۔"

"تم نے کچھ دیکھا؟" یعنی نے فوراً سوال داغا۔

"دیکھا تو خیر میں نے کچھ نہیں....." وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں اس وقت خوفزدہ ضرور ہو گیا تھا۔ جب مجھے فرش کے پار آپ لوگ صاف نظر آ رہے تھے.....!!" دہشت کے مارے وہ سمٹ کے رہ گئے اور صبح سورج نکلنے تک انہوں نے پلک تک نہیں جھپکی۔

صبح ہوتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ گرجا کا فون نمبر ملایا.....فون آنے سے چند ہی لمحے پہلے فادر مانگسو فیصلہ کر چکا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ جارج اور اس کی بیوی بچوں کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑے گا.....اور اس سے پہلے کہ وہ ریسیور اٹھاتا اسے انجانے میں علم ہو چکا تھا کہ ٹیلی فون کرنے والا شخص جارج ہے۔

"فادر ہم گھر چھوڑ کر کچھ عرصے کے لئے یعنی کی والدہ کے گھر جا رہے....."

لیکن مانگسو نے اس کی بات کاٹ دی اور بغیر مزید سوال جواب کے فوراً بولا۔ "جس جگہ مرضی چلے جاؤ صرف یہاں سے نکلنے کی کروا"

انہوں نے سارے گھر کو دوبارہ بڑی مشکل سے مقفل کیا اور یعنی بچوں سمیت گاڑی میں دھنس گئی..... جارج سستی گھر کا دروازہ بند کرنے گیا اور آتے ہی اس نے کار کی چابی تھما دی..... کار نے اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔

"کیا بات ہے جارج؟" یعنی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں..... میں بونٹ کھول کر چیک کرتا ہوں اور جونہی وہ کار کے باہر نکلا، اس کی نظر آسمان پر چاروں جہاں اندھیرا چھا گیا۔ بھر کی گھٹائیں امڈ آئی تھیں..... جلدی جلدی انجن چیک کرنے لگا اور ابھی وہ پوری طرح کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی..... دریا کی طرف سے ایک بے پناہ طاقتور جھکڑ چلا اور اس کی کار کا بوجھ سنبھالنا محال ہو گیا۔

بجلی زور سے کڑکی اور دوسرے ہی لمحے موسلا دھار بوچھاڑوں نے تباہی پھیلانے کا کام شروع کر دیا..... اس نے کار کا دروازہ کھولا اور یعنی اور بچوں کو گھر میں داخل ہونے کا اشارہ کیا..... جارج کا خاندان بدحواسی کے محاصرے میں آ چکا تھا!!

ساری دوپہر بارش پل بھر کو بھی نہ تھمی..... تین بجے سہ پہر یکدم لائٹ آف ہو گئی۔ بادلوں کا پھیلا ہوا زبردست اندھیرا اور گہرا ہو گیا..... 112 اوشن ایونیو دہشت اور خوف کے شدید تھپیڑوں کی زد میں تھا اور اس کے باسی خدا سے مانگ رہے تھے کہ انہیں اس جہنم سے نجات ملے..... بجلی اور ٹیلی فون کی لائنیں بے جان ہو چکی تھیں..... اور سرد ہوا چاروں طرف چنگھاڑ رہی تھی۔

لفٹ

لفٹ میں ایک ساتھ بہت سے لوگ سوار ہو گئے، آپریٹر نے بٹن دبایا لیکن لفٹ اپنی جگہ سے نہ ہلی، اس نے درخواست کی کہ کم از کم ایک فرد ضرور لفٹ سے اتر جائے۔ ایک نہایت موٹی خاتون نے انکار کا مظاہرہ کیا اور لفٹ سے اتر گئیں، کئی دوسرے لوگ لفٹ سے باہر اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ آپریٹر نے دوبارہ بٹن دبایا تو لفٹ اوپر روانہ ہو گئی۔ موٹی خاتون نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے شرمندگی سے کہا۔ "میرا وزن اتنا زیادہ تو نہیں کہ میری وجہ سے لفٹ رک جاتی۔ دراصل آج میرے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ہے۔"

(آ صفہ سراج لاہور)

شام کے چھ بجے جارج نے بڑی عجیب بات محسوس کی۔ سارے گھر میں درجہ حرارت یکدم بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن مانسی کے کمرے میں خاصی سردی تھی! وہ ٹارچ ہاتھ میں تھامے نیچے آنے لگا تو وہیں ٹھٹک گیا۔ سبز جیلی نما مادہ برآمدے میں کلبلا رہا تھا..... یہ مادہ سلائی والے کمرے سے آ رہا تھا..... اس نے شدید غصے کے عالم میں دروازہ دھڑ دھڑایا..... اسے توقع تھی کہ وہ یہ سراسر مذاق لگائے گا کہ یہ مادہ کہاں سے آ رہا ہے..... لیکن کمرہ بالکل خالی تھا..... سبز مادہ تالے کے سوراخ میں سے بہہ رہا تھا!! اس نے ادھر ادھر سے دریاں اٹھنی کیں اور مادے کے بہاؤ کے راستے میں رکھ دیں..... مادہ بہنا بند ہو گیا..... اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور نیچے آ گیا۔

رات کے ٹھیک دس بجے پورا گھر خ بستہ ہونا شروع ہو گیا..... اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر جارج مارے سردی کے نیلا پڑ رہا تھا۔ وہ بڑے بیڈ روم میں گیا۔ یعنی اور مانسی کو اپنی طرح ڈھانپا اور لکڑیاں اٹھا کر آتش دان میں پھینکنے لگا..... لیکن جب وہ تیلی لگانے لگا تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا..... آج کی رات بے حد خوفزدہ تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بار بار تنبیہ کر رہی تھی..... چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رات بھر اپنی بیوی اور بچوں کے سرہانے بیٹھا رہے گا.....

رات کے قدم اور آگے بڑھے..... چاروں طرف سناٹا چھا چکا تھا..... بارش اور طوفان تھم چکے تھے..... جارج نے اپنی آنکھیں موندنے کی کوشش ہی کی تھی کہ اس کے سر کے عین اوپر کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی..... اور وہ گویا طوفان بدتمیزی کی ابتدا تھی کیونکہ فوراً ہی سارے گھر کی کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ میزوں کے دراز خود کھلنے اور بند ہوتے رہے..... ڈرے سہمے جارج کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے تھے..... انسان کی بے بسی کے آنسو!!

اچانک جارج بری طرح چیخنے لگا۔ اس کے بستر میں اس کے علاوہ کوئی اور چیز بھی حرکت کر رہی تھی!! یہ کسی چالور کے سم تھے۔ جارج اچھل کر بستر سے الگ ہو گیا۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا..... اچانک اور پراسرار خواب گاہ سے مائیکل اور کرسٹوفر بھاگتے ہوئے آئے اور اس سے لپٹ گئے ان کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور ان کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ شق کر کے باہر نکل آئے گا۔

"ڈیڈی..... وہ ہمارے کمرے میں ہے..... وہ..... وہ بھوت.....!" مائیکل کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے! "بھوت کا چہرہ بھی غائب ہے ڈیڈی!"

"ڈیڈہ وہم پر مجھتا تھا!" کرسٹوفر نے لقمہ دیا وہ مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

جارج بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا..... اس نے بچوں کو سہلایا..... ابھی ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ وہیں جم کے رہ گیا۔ سامنے والے زینے میں وہی سفید بھوت کھڑا تھا۔ وہی سینگ اور وہی آہنی ٹوپی لیکن چہرہ غائب! بھوت اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

جارج بجلی کی طرح مڑا اور مانسی کو اٹھا کر مائیکل کی گود میں ڈال دیا۔

"اسے فوراً باہر لے جاؤ..... جلدی..... وقت بہت کم ہے..... اور کرسٹوفر! تم بھائی کے ساتھ باہر چلو!" اس نے کہنی کو بازو سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے اٹھا لیا..... وہ اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر کار تک لے گیا اور اسے اندر دھکیل دیا..... دروازہ بند کیا اور پیچھے سے ہوتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور کار کی چابی گھما دی..... کار فوراً اسٹارٹ ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ مڑ کوں پر جمع پانی کو چیرتا ہوا اندھا دھند کار ڈرائیو کر رہا تھا..... اس نے شیشے میں 112 اوشن ایونیو پر الوداعی نظر ڈالی..... "خدا حافظ و خوا ہم ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں.....!" اور کار دائیں ہاتھ مڑ کر تیزی سے بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس وقت صبح کے ٹھیک سات بجے تھے اور جنوری 1976ء کی چودہ تاریخ تھی!! جارج یعنی اور ان کے بچے اٹھائیس دن تک غیر انسانی قوتوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے اور اب وہ سب کچھ ہار کر واپس جا رہے تھے۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر:25

خرامان خرامان اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

ایسے بھی باپ ہوتے ہیں اس کائنات میں۔ موت منتخب کی میرے لئے۔ مسلسل کہانیاں تراش رہا تھا۔ پھر اسٹیم کا انجن بند ہو گیا۔ اس کے بعد تابوت میں جنبش ہوئی اور پھر میرا سر نیچے اور پاؤں اوپر ہو گئے۔

چھپاکا سا محسوس ہوا تھا، دل نے پھڑپھڑا کر سینے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تھی۔ آنکھوں میں تاریکیاں آ گئی تھیں۔ کچھ دیر نیچے کو جاتی محسوس کرتی پھر اوپر بلند ہونے لگی۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ ان حالات میں بھی دماغ نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ پہلے میرے وزن سے بلندی سے گرنے سے تابوت پانی کی گہرائیوں میں بیٹھا پھر چونکہ لکڑی سے بنا ہوا تھا اس لئے اوپر اٹھنے لگا لیکن سب سے خوفناک بات جو ہوئی تھی وہ پانی کی نمی تھی جو مجھے بدن کے مختلف حصوں پر محسوس ہونے لگی۔ تابوت ایئر ٹائٹ نہیں تھا کہیں نہ کہیں سے پانی اندر آ رہا تھا۔ زائرہ ایمان نے تو یہ غلطی کی تھی کہ تابوت میں ضروری وزن نہیں رکھا تھا جس سے وہ پانی پر بلند نہ ہوتا۔ لیکن اب وہ کسر پوری ہو رہی تھی اور تابوت میں آہستہ آہستہ پانی آ رہا تھا۔ دریا کے بہاؤ نے تابوت کا سفر جاری کر دیا، برق رفتار اتنی تیز تھی کہ ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے تھے، دماغ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ تابوت پھر کئی کی طرح گھومنے لگا اور میری بند آنکھوں میں سیاہ اندھیرا اتر آئے اس کے بعد کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا۔ نہ جانے عالم بے ہوشی میں کیسے مراحل سے گزرنا پڑا۔ ہوش آیا تو آسمان روشن تھا۔ سورج پر بادلوں کے ٹکڑے رکے ہوئے تھے۔ موسم معتدل تھا۔ بہت روشنی نہ گرمی۔ بدن بے حد ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ نہ جانے یہ کون سی جگہ تھی۔ حارث عبدالعلی رہائش گاہ بھی نہیں تھی اور..... اور..... پھر یاد داشت واپس دینے لگی اور سب کچھ یاد آ گیا۔ دل میں وحشت الجھن اپنے آپ پر غور کیا۔ معتدل کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ بدن اب بھی تابوت کا قیدی تھا لیکن تابوت کا ڈھکن غائب تھا۔ بس اس کا وہ مراجز اہوا تھا جسے باہر نکالا ڈال کر بند کیا گیا تھا۔ تابوت جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا غالباً دریا میں کہیں چٹانوں سے ٹکرایا ہو گا۔ لیکن میرے بدن پر معمولی سی خراش بھی نہیں تھی۔ لباس بے شک بھیگا ہوا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔ تابوت کے کنارے گرفت میں لے کر بدن کو جنبش دی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر حیران نظروں سے پورے ماحول کا جائزہ لیا، تابوت دریا میں تھا لیکن دریا یہاں آ کر دریا نہیں رہا تھا۔ وہ اس جگہ بہت وسعتوں میں پھیل گیا تھا۔ گول گول پتھر چاروں طرف

بکھرے ہوئے تھے اور پانی کے دھارے انہیں چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔

میرے بائیں سمت سرسبز و شاداب گھاس اور درختوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ صندل کی خوشبو میں سیب کی تیز خوشبو بھی شامل تھی۔ ان درختوں کے دوسری سمت شاید سیب کا جنگل تھا۔ نہ جانے کون سی جگہ ہے۔ لیکن خوب صورت ہے۔ تاہم اس پھیلاؤ میں آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اور میں نیل میں بھٹکنے سے بچ گئی تھی دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ پھر بچ گئی ہوں۔ زائرہ ایمان نے میری موت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن میں زندہ ہوں۔ نہ صرف زندہ ہوں، بلکہ اس بھیانک سفر کے باوجود میرے بدن پر ایک خراش بھی نہیں ہے۔ وہ قول تو پورے ہو گئے تھے جو مختلف لوگوں نے دیئے تھے۔ مگر اب کیا ہوگا۔ پتہ نہیں قاہرہ سے کتنی دور نکل آئی ہوں۔ آس پاس کوئی آبادی ہے یا نہیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا اب تابوت سے نکلا جائے۔

جنگلوں ہی کی طرف رخ کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اسی طرف چل پڑی۔ پتھروں پر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا تھا۔ جوتے تباہ ہو چکے تھے اور ان میں بری طرح پانی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ انہیں پہن کر چلنا بالکل ممکن نہیں تھا۔ میں نے ان سے نجات حاصل کرلی۔ اس طرح آسانی ہوگئی۔ میں اس گھاس کے فرش پر پہنچ گئی۔ بے حد فرحت محسوس ہوئی تھی۔ یہاں سیبوں کی خوشبو بہت تیز آرہی تھی۔ کوئی شکن یا الجھن نہیں تھی۔ اس لئے آگے بڑھنے لگی۔ یہ جنگل نہیں باغ تھا۔ درخت کنارے کنارے لگائے گئے تھے اور اندر پھلوں کے درخت تھے۔ سرخ بڑے بڑے سیب جھول رہے تھے۔ اتنے نیچے کہ ہاتھ بڑھاؤ اور توڑ لو۔

میں اپنی خواہش کو نہ دبا سکی اور ایک سیب توڑ کر کھانے لگی۔ شہد جیسے سیب سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر وہیں بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ باغ قدرتی نہیں۔ اس کے رکھوالے بھی ہوں گے، انہیں تلاش کر کے اس آبادی کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات میں الجھ کر وقت ضائع کرنا بے معنی تھا۔ کچھ دیر تھکاوٹ سی طاری رہی پھر اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ایک عجیب احساس ہوا۔ گردن کے پاس بھی سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ شاید کوئی کیڑا چڑھ گیا ہے۔ بے اختیار ہاتھ گردن پر جا پڑا۔

عسکری کا دیا ہوا نیکلس گلے میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور ابھارا پھر گردن مسلنے لگی مگر کوئی کیڑا نہیں تھا۔ نیکلس میں جنبش تھی۔ اس کی خوب صورت دھجی میری مٹھی میں پھسل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ دوسرے لمحے وہ میری گردن سے نکل کر سینے پر پھسلتا ہوا نیچے گر پڑا۔ یہ سوچ سکتی تھی کہ ممکن ہے کہ اس کا ہک کھل گیا ہو اور توازن بگڑنے کی وجہ سے وہ جنبش کرتا محسوس ہوا ہو لیکن نیچے گرنے کے بعد بھی وہ متحرک رہا اور سست رفتاری سے پھسلتا ہوا مجھ سے کچھ فاصلے پر جا رکا۔ ایسا ہی ایک منظر میں اس وقت دیکھ چکی تھی جب پہلی بار شلزانہ اوشیانوس مجھ تک پہنچا تھا لیکن اس کا زیور سے کیا تعلق۔ وہ روشاق کا طلسم تھا۔ اور یہ عسکری کا تحفہ۔ پھر اس کی بناوٹ ناگن کی تھی اور یہ ایک خوشنما نیکلس، البتہ میری آنکھیں مجھے دھوکہ نہیں دے رہی تھیں۔

نیکلس بدستور متحرک تھا اور اب وہ سٹ کر گول ہو رہا تھا۔ پھر اس نے شکل اور حجم بدلنا شروع کر دیا اور میں منہ پھاڑے اسے دیکھتی رہی۔ سونے کا زیور سنہری مورت کی شکل اختیار کر گیا اور وہ مجھے دیکھ کر سا حرانہ انداز میں مسکرادی۔

"نشا دانش۔" اس نے کہا لیکن اس کے حسین ہونٹوں سے روشاق کی منحوس آواز نکلی تھی بالکل اسی طرح جیسے ایک بار حارش عبداللہ کی رہائش گاہ میں اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔

"روشاق.....!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہیں۔ ایمنی ترا وزی۔"

"تم اس زیور کی شکل میں۔ مگر یہ زیور تو مجھے عسکری نے بھجوایا تھا۔"

"کیا کروں تمہاری اس مکار دنیا نے مجھے بھی اتنا مکار بنا دیا ہے کہ مجھے مکر کرنے پڑتے ہیں۔"

"گویا یہ زیور عسکری کے نام سے تم نے مجھے پہنچایا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی نام مجھے تمہاری قربت دے سکتا ہے دوسرے تمام راستے تو تم نے بند ہی کر دیئے تھے اور پھر تمہیں ایک انوکھے علم والے کا قرب حاصل ہو گیا تھا۔"

"کون انوکھے علم والا۔"

"حارش عبداللہ کی بات کر رہا ہوں۔ میں اس انوکھی شخصیت کے رو برو دم بخود فراموش نہیں کر سکوں گا۔ نہ جانے کون سا علم تھا جو کسی ذی روح کو کاغذ میں تبدیل کر دیتا تھا۔ تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس وقت تم نے خود کو کاغذ کی تصویر میں کیوں نہ بدل لیا جب زائرہ ایمان تمہیں دریا برد کر رہی تھی جبکہ میرے قید خانے میں تم نے یہ منتر کھایا تھا۔"

"روشاق مجھے ایک بات بتاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"حارش عبداللہ کے نگار خانے میں کس نے آگ لگائی تھی؟"

"میں نے۔" وہ سکون سے بولا۔

"کیوں.....؟" میرے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں۔

"پہلی بار میں نادیدہ شکل میں اس کے نگار خانے میں داخل ہوا تو مجھے وہ جگہ ایک انوکھا طلسم کدہ محسوس ہوئی۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں جاندار تھیں۔ میں نے بڑا حیرتناک منظر دیکھا وہ صرف تصویریں تھیں لیکن جنبش کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، اسے میری موجودگی کا علم ہو گیا اور میں وہاں زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ لیکن مجھے تجسس رہا اور یہ سچ ہے کہ حارش عبداللہ کے بارے میں مجھے اب بھی کچھ نہیں معلوم لیکن تمہاری اور اس کی قربت پہلی بار مجھے خطرناک محسوس ہوئی تھی۔ نتیجے میں، میں نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر وہ کسی کاغذ کی طرح چھٹ گیا اور اس کی زندگی قائم رہی۔ آخری خطرہ مجھے اس وقت محسوس ہوا جب ایمنی ترا وزی کے دانش کدے میں تمہیں قید کرنے کے بعد میں نے تمہیں آزاد پایا۔ قید خانے میں تمہاری تصویر رہ گئی تھی۔ تب حارش عبداللہ مجھے بے حد خطرناک محسوس ہوا اور بالآخر میں نے اسے اس کے نگار خانے سمیت جلا دیا۔"

شدت غضب سے میرا سارا وجود پھٹنے لگا۔ حارش عبداللہ سے مجھے بڑی عقیدت تھی۔ اس کی موت کو میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا نقصان محسوس کرتی تھی۔ میں خونی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"صدیوں کی جدوجہد اس نتیجے پر آکر ختم ہو گئی۔ اب آگے کی کہانیاں شروع ہوں گی جن سے نہ میں واقف ہوں نہ تم....."

"یہ کون سی جگہ ہے.....؟" میں نے پوچھا۔

"تھہ کا جنوبی حصہ۔ اس سے آگے صحرائے ترشت ہے جسے مجبور کر کے ڈیلٹائی حکومت کا دارالخلافہ وذخیرہ آجاتا ہے۔" روشاق نے جواب دیا۔

"یہ سارے نام تو اجنبی ہیں، قاہرہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا اور شلزانہ اوشیانوس کے روپ میں روشاق ہنس پڑا۔

"کون سے قاہرہ کی بات کر رہی ہو۔ جس قاہرہ کے بارے میں تم پوچھ رہی ہو اس تک کا سفر اب دو ہزار چھ سو تریسٹھ سال آگے ہے۔ اب تم جس دور میں سانس لے رہی ہو یہ دور سیت کہلاتا ہے۔ دو ہزار چھ سو تریسٹھ قبل مسیح کا دور جب مصریوں نے ہکسوس خاندان کا اقتدار ختم کر کے دوبارہ مصر پر حکومت قائم کی تھی۔"

"کیا.....؟" میں نے سرد لہجے میں کہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

"تو.....تو کیا؟"

"ہاں.....تم وہاں آچکی ہو جہاں تمہیں آنا تھا۔ اب تمہیں علم ہو گیا کہ میں تم سے کیا چاہتا تھا جس کہانی سے میرا براہ راست تعلق ہے نشا دانش اس میں میرے کردار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ انا تم سلاطیہ کے لئے میں نے صدیاں کھودیں۔ لیکن تمہارا غاصب باپ فائدہ اٹھا کر یہاں تک آگیا۔ بعد میں جو کچھ بھی ہوا وہ الگ بات ہے

لیکن میرے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں یہاں آنا چاہتا تھا اور تم اس کا سب سے بہتر ذریعہ تھیں۔ میں شلزانہ اوشیانوس کے روپ میں آنے کا خواہش مند تھا۔ آخر میں یہی ہوا بس تھوڑی سی مکاری سے کام لینا پڑا۔ تم مجھے اپنے محبوب کی یادگار سمجھ کر یہاں لے آئیں۔"

میں دیر تک گنگ رہی۔ روشاق کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہ واقعی ہزاروں سال قبل کی سرزمین ہے۔ کیا یہ ماحول گزری ہوئی سینکڑوں صدیوں قبل کا ماحول ہے۔ کیا مجھے اب صدیوں پرانی روحوں کا سامنا کرنا پڑے گا جو اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ دل پر عجیب سی دہشت طاری ہوگئی تھی۔ روشاق پر شدید غصہ تھا وہ قاتل تھا۔ شیطان تھا لیکن اس وقت واحد کردار تھا جس سے میرا تعلق رہ چکا تھا۔ تھوڑا سا رویہ بدلنا ہوگا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور پھر نرم لہجے میں بولی۔

"جو کچھ تم کہہ رہے وہ سچ ہے روشاق؟"

"اب دیر کہاں۔ حالات خود تصدیق کردیں گے۔"

"تم اب کیا کرو گے؟"

"بہت کچھ کرنا ہے۔ نہ جانے کیا کیا۔ میری کاوشوں کا صلہ ایک حد تک مل گیا ہے۔ اب دوسرا مرحلہ ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"جواب تک کرتی رہی ہو۔ تم نے اب تک کیا، کیا ہے جواب کرو گی، جو کچھ کریں گے دوسرے ہی کریں گے۔"

"یہاں تم اسی شکل میں رہو گے......؟"

"کون جانے کیا ہوگا؟"

"تمہاری خواہش پوری ہوچکی ہے۔ روشاق۔ تم نے اپنی منزل پالی ہے۔ میری مدد کرو میں تنہا ہوں۔ کچھ نہیں جانتی۔ میں پریشان ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا...... میرے ساتھ رہو۔"

"صد افسوس۔ تم نے مجھ سے کبھی تعاون نہیں کیا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے بل پر کیا۔ اب میں تعاون سے انکار کرتا ہوں۔ یوں بھی خود میرے لئے یہ جگہ اجنبی ہے۔ اس ماحول سے واقفیت حاصل کروں گا۔ پھر اپنا کوئی مقام بناؤں گا اور پھر...... اسے تلاش کروں گا جس کی ایک جھلک میرے لئے روح افزا ہوگی۔ اور جسے تمہارے غاصب باپ نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ آہ! میری جدوجہد تو اب بھی طوفانی حیثیت رکھتی ہے۔ نہ جانے کیا کیا کرنا پڑے گا۔ اچھا...... بس...... اب اجازت دو۔" سنہری عورت کھڑی ہوگئی۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"یہ اچھی بات ہے کہ اس منزل تک آ کر مجھے تمہارا کوئی احسان نہ لینا پڑے۔ ورنہ مجھے بھی تمہارے ساتھ مروت کرنی پڑتی۔ اب میں جو کچھ بھی کروں گی آزادی سے کروں گی۔" میرے ان الفاظ پر سنہری عورت نے روشاق کی آواز میں قہقہہ لگایا اور پھر ایک جانب چل پڑی۔ میں جلتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی، دل تو چاہ رہا تھا کہ کوئی وزنی پتھر اٹھا کر اس پر دے ماروں اور اس کا سارا وجود پاش پاش کردوں۔ بدبخت نے ایک بہت بڑے شخص کو فنا کردیا تھا لیکن اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جو انکشاف وہ منحوس کرکے گیا تھا۔ اگر وہ درست تھا تو یہ دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ تھا۔ ایک انسانی روح صدیوں کے فاصلے طے کرکے ماضی میں لوٹ جائے اور ماضی کے کردار اس کی آنکھوں کے سامنے اجاگر ہوجائیں بذات خود ایک حیرت انگیز داستان تھی۔ زمانہ جدید کی سائنس نے ٹائم مشین کا فارمولا پیش کردیا تھا...... لیکن وہ ابھی فینٹسی کی حدود میں تھا جس طرح کبھی چاند پر پہلے آدمی کا تصور صرف ایک اختراع سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ابھی ٹائم مشین کہانیوں کی شکل میں موجود تھی۔ لیکن میں اس لمحے سے گزر رہی تھی جو سائنس دانوں کے دماغ میں محفوظ تھا اور مجھے یہاں تک پہنچانے کا ذریعہ دریائے نیل میں بہتا ہوا وہ تابوت بنا تھا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو اپنی ہی کہانی پر حیرت سے ششدر رہ جانے کو جی چاہتا تھا۔

کیا میں واقعی زمانہ قدیم کے مصر میں ہوں۔ جب مصر پر فرعونوں کی حکمرانی تھی۔ آہ! پتہ نہیں یہ پراسرار حقیقت کیا نوعیت رکھتی ہے۔ ایک جیتے جاگتے انسان پر

یہ وقت گزر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دیدہ ور کی حیثیت سے گزر جاؤں یا ان پریشانیوں کو محسوس کروں جو اب مجھ پر مسلط ہونے والی تھیں۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن بے بسی کی انتہا بالآخر اعتماد ہوتی ہے۔ جب انسان یہ سوچ لے کہ اب جو ہونا اسے ٹالنا مشکل اور ہونی سے گزرنا ہے تو پھر اندر ایک پتھریلی کیفیت بیدار ہوجاتی ہے۔

میری زندگی کے ان پراسرار واقعات میں کتنی ہی بار میرے اندر یہ کیفیت بیدار ہوئی تھی، کوکونٹ آئی لینڈ پر بھی مصیبتوں سے گزرتے ہوئے میرے اندر یہ پتھریلا پن بیدار ہوا تھا۔ اس کے بعد بھی بے شمار مراحل آئے تھے، سو اب بھی اپنے آپ کو ان واقعات کے لئے تیار کرنا ہوگا۔ یہی میرے حق میں بہتر ہے اور اس سے زندگی کی یہ سانسیں برقرار رکھی جاسکتی ہیں بس جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت سے پہلے مرنے سے کیا فائدہ۔

شلزانہ اوشیانوس میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور باغ کے درختوں سے گزرتی ہوئی بہت دور نکل آئی۔ ماحول بے حد شفاف تھا اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ مشینی دور کی آلودگی نے درختوں کو دھندلاہٹوں کا شکار نہیں کیا تھا۔ ہر طرف صاف و شفاف مناظر بکھرے ہوئے تھے، پھلوں کے گچھے کے گچھے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی بالآخر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں ایک عمارت بنی ہوئی تھی، بظاہر تو خاموشی نظر آ رہی تھی۔ چبوترے کی بلندی تک پہنچنے کے لئے چار وسیع سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں کو عبور کرکے اوپر پہنچی اور پھر اس چبوترے پر جا کھڑی ہوئی۔ سوچ رہی تھی کہ کس کو آواز دوں، چند ہی لمحات کے بعد بغلی سمت سے ایک نوجوان شخص آتا نظر آیا۔ زمانہ قدیم کے لباس میں ملبوس، حسین و جمیل نوجوان جس کی عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ سر جھکائے بے خیالی کے انداز میں چلا آ رہا تھا۔ پھر اس نے سیڑھیاں عبور کیں۔ ابھی تک اس نے مجھے نگاہ اٹھا کر دیکھا نہیں تھا۔ میں البتہ اس انداز میں اسے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظریں مجھ سے ملیں تو اس جگہ کے بارے میں سوال کروں۔ وہ مجھ سے بہت قریب آ گیا۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھائیں، مجھے دیکھا، یوں جیسے میرا برسوں کا شناسا ہو، لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی مسکراہٹیں سمٹتی چلی گئیں اور ان کی جگہ حیرت نے لے لی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے چھونے کی کوشش کی تو میں جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور نوجوان جیسے خواب سے چونک پڑا۔ اس کا جسم شدت حیرت سے کانپنے لگا۔ چہرے کے نقوش بھی یہی بتاتے تھے کہ جیسے وہ ششدر رہ گیا ہو۔ پھر اس کے تاثرات میں انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے محبت کا آبشار بہہ رہا تھا۔ اس کے بعد اس کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔

"دیوتا آمون کی قسم!...... آمون کی قسم! مجھے یقین تھا کہ میری محبت تمہیں زندگی دے گی۔ دیوتا آمون کی قسم آؤ دیکھنے والو، تم مجھ کو دیوانہ سمجھتے تھے۔ میری ماں نحلہ کی حمیمہ دیکھ میرے فن نے زندگی پالی۔ دیکھ میرے فن کی معراج، دیکھ میرے پیار کی انتہا جس نے اس میں زندگی دوڑا دی ہے، میں پتھروں کا جادوگر ہوں اور بوڑھی آزر کی پیش گوئی کو غلط کہنے والو، آزلہ عظیم ہے اور اس نے اب تک کوئی جھوٹی پیشن گوئی نہیں کی۔ دیکھو آج خنساء کو اپنی نگاہوں سے متحرک دیکھو۔ خنساء میری زندگی میری روح میری محبت، آخر تو نے زندگی پا ہی لی۔ دیوتا آمون کی قسم یہ میرا فن نہیں میری محبت ہے، جس نے تجھے متحرک کیا۔"

اس کے عجیب و غریب الفاظ۔ اس کی آواز مجھے بہت حیرتناک لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیا چکر ہے، نہ جانے یہ کون ہے۔ تب ہی کچھ اور آوازیں بھی ابھریں اور اس کے بعد چند افراد کچھ فاصلے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ ان آہٹوں پر میری نگاہیں بھی اس طرف گھوم گئی تھیں۔ نوجوان نے سرگوشی کے عالم میں کہا۔

"جرار، میرے بہت پیارے دوست، میری ماں حمیمہ اور دیکھو آنے والو اب بھی اگر یقین نہ کر پاؤ تو تمہاری عقلوں پر ماتم کرنے کے علاوہ کیا کرسکتا ہوں میں، دیکھو آج خنساء نے زندگی پالی ہے وہ متحرک ہے اور

یہی آزلہ کہتی ہے۔ میرے فن کو زندگی مل گئی ہے۔ آج حنان پتھروں کا جادو کر کہلانے میں حق بجانب ہے، دیکھو اس مجسمہ ساز کو جس نے اپنی زندگی میں ایک ہی بت بنایا اور اسے زندگی دے دی۔ ہاں آزلہ کی پیش گوئی کبھی غلط نہیں ثابت ہو سکتی تھی۔ دیونا آمون کی قسم دیکھو، دیونا آمون کی قسم۔"

وہ سب قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک معمر عورت کو دیکھا، نہایت پروقار شخصیت کی مالک، بڑی بڑی گہری آنکھوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ دوسرے چند افراد بھی تھے جن میں سے ایک کو جرار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر پریشان کن انداز میں معمر عورت کو، معمر عورت نے اچانک ہی اپنے چہرے کے تاثرات بدل لئے اور محبت بھرے انداز میں آگے بڑھ آئی۔ اس نے نوجوان کے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں چوم لیا۔

"میں جانتی تھی، میرا بیٹا جب بھی کوئی کام کرے گا اسے تکمیل تک پہنچا کر رہے گا۔ خوش آمدید خناصاہ آسمان سے اترنے والی خوش آمدید، میرے اکلوتے بیٹے کی محبت خوش آمدید، میں تیرا خوش دلی سے استقبال کرتی ہوں۔ آہ! حنان، یہ واقعی بہت خوب صورت ہے۔ تیرے فن کا زندہ جاوید کارنامہ اور اب کیا تو اے ویرانوں میں پڑا رہنے دے گا۔ اسے مجھ کی سب سے خوب صورت عمارت میں لے چل جو تیری اپنی ملکیت ہے۔"

"شکریہ مادر مہربان، تیری محبت کو میں آسمان کی طرح بلند سمجھتا ہوں۔ میں بے حد خوش ہوں۔"

"جرار، خناصاہ کو گھر لے جانے کی تیاریاں کرو۔" میں تو کچھ بول ہی نہیں پائی تھی۔ البتہ ایک بات پر میں نے غور کیا تھا۔ وہ سب عبرانی زبان بول رہے تھے جسے میں بخوبی سمجھ رہی تھی اور ضرورت پڑنے پر بول بھی سکتی تھی پھر میری زندگی کا سب سے تیز تر تاک واقعہ یہی تھا باقی تو جو کچھ تھا وہی ہو رہا تھا۔ لیکن نہ جانے یہ عبرانی زبان مجھے کہاں سے آ گئی۔

معمر عورت نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولی۔

"میرے بیٹے کی حسین تخلیق، میں تیرا خلوص دل سے استقبال کرتی ہوں۔ آ کہ تیرا اب یہاں رہنا مناسب نہیں۔ تو میرے لئے محبت اور احترام کا مرکز ہے۔"

نوجوان بھی ہمارے ساتھ ہی چل پڑا تھا، میں ایک عجیب سی پریشانی کا شکار ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس انوکھی داستان کے بارے میں اظہار خیال کیسے کروں، انہیں کیسے بتاؤں کہ وہ سب نہ جانے کیا حماقت کر رہے ہیں، میں مس نشادانش ہوں، ایک عجیب و غریب مشکل کا شکار لڑکی..... کیسی خاموشی ہی مناسب تھی اور اس خوب صورت گاڑی میں آبنوسی جس میں چار گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ دو تین گھوڑے سوار کے آس پاس بھی موجود تھے۔ میرے عقب میں ایک نوجوان بھی چلا آ رہا تھا۔ جسے حنان کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دو مراقبی ہیکل نوجوان جو جرار تھا۔

کوچوان نے نہایت احترام سے مجھے گاڑی میں سوار کرایا اور حمیمہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔ حنان کو گھوڑا دے دیا گیا تھا یا شاید اس کا گھوڑا پہلے سے یہاں موجود تھا اور اس طرح اس باغ سے نکلنے والی ایک خوشنما سڑک سے گزرتے ہوئے ہم شہر کی آبادیوں کی جانب چل پڑے۔ میں سحر کے عالم میں گزر رہی تھی کو دیکھ رہی تھی۔ صدیوں پہلے کا مصر آنکھوں کے سامنے تھا۔ موجودہ دور سے بالکل مختلف روایات کا حامل، خوب صورت، پرسکون، سبزہ زار تھم ہوئے آبادیاں نظر آنے لگیں۔ شہر کے لوگ اپنی مصروف زندگی میں مگن تھے۔ کسی نے اس گاڑی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ مکانوں کے سلسلوں سے گزر کر بالآخر ایک خوب صورت عمارت منزل قرار پائی جو کہ بے حد خوشنما تھی۔ یہاں مجھے احترام سے اتار کر اندر لے جایا گیا۔ یہ یقیناً صاحب ثروت لوگوں کی رہائش گاہ تھی۔ حمیمہ مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ وہ احتی اس طرح شرمایا شرمایا ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر اپنی ملکیت کو لئے

چلا آ رہا ہو۔ گویا اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ میں اس سے متعارف ہو سکتی ہوں۔ اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آنے لگی لیکن اس وقت ہوشیاری ہی مشکلات سے بچا سکتی تھی۔ بعد مصر قدیم کا ایک شہر جس کا موجودہ دور میں نہ جانے کیا نام ہو میرے قدموں تلے تھا اور اب ماضی کی وہ تمام باتیں سچ ہی لگ رہی تھیں۔ جنہیں اب تک میں نے ایک ناقابل یقین کہانی تصور کیا تھا۔

حمیمہ نے مجھے ایک خوب صورت کمرے میں پہنچا کر کہا۔

"میرے نزدیک یہ ایک خوب صورت خواب گاہ ہے اور یہاں تمہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اپنی ضرورتیں کنیزوں کو بتا دینا، وہ تمہاری خدمت کریں گی۔ میں تم سے رات ہونے سے پہلے دوبارہ ملاقات کروں گی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور حمیمہ مجھے دیکھتی ہوئی اس جگہ سے باہر نکل گئی۔ میں نے اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پائی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتی تھی وہ دونوں کنیزیں جو میرے احکامات کی تعمیل کے لئے وہاں موجود تھیں میرے حکم اور اشارے کی منتظر تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔

"مجھے تنہائی درکار ہے۔ تم لوگ باہر رکو..... اور اگر کوئی مجھ سے ملنا چاہے تو اس سے کہو کہ میں آرام کر رہی ہوں۔" عبرانی زبان کے یہ الفاظ کنیزوں نے گردن خم کر کے سنے اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا اور میں عالم سکوت میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا، جو خوفناک پیشن گوئیاں کی جاتی رہی ہیں کیا ان کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے اور کیا یہ واقعی اتمام سلاطیہ کا دور ہے اور کیا در حقیقت اس دور میں فرعون نہم رامسن عوص حکمران ہے۔ یہ سارے خیالات ذہن میں گردش کرتے رہے۔ دماغ کی رگیں کچ رہی تھیں اور پھر سارا رہا تھا لیکن پھر خود کو سنبھال کر یہی سوچا کہ جب اب تک کی تمام باتیں درست ثابت ہو گئی ہیں تو آگے جن واقعات کی تھوڑی بہت نشان دہی کر دی گئی ہے وہی پیش آئیں گے لیکن ان میں میرے لئے خوف کا کوئی لمحہ نہیں تھا۔ بہتر ہے کہ آرام کر لوں اور یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ بھٹکنے سے بچ گئی ورنہ ساحل سے لے کر نخلہ کی آبادیوں کا جو راستہ گھوڑوں نے اتنی دیر میں طے کیا تھا مجھے وہ طے کرنے میں بہت وقت لگ جاتا۔

زمانہ قدیم کی آرام دہ مسہری پر لیٹ کر در حقیقت میں نے اپنے آپ کو ماضی کا کوئی کردار ہی سمجھا اور اب اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ پھر حمیمہ کی آمد کی اطلاع کنیزوں کے ذریعے ملی۔ میں بھی تازہ دم ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نے حمیمہ کا استقبال کیا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی، مجھے یوں لگا جیسے وہ غصہ میں ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اس خیمہ النحواس کو بمنتقل تمام تم تک پہنچنے سے باز رکھا گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ تمہارے نزدیک آئے میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں، اور ان کے درست جوابات پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔" حمیمہ کا لہجہ ٹھنڈا خنک اور گوں میں سنسنی پھیلا دینے والا تھا۔ میں سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ تو اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"تم در حقیقت کون ہو؟"

یہ سوال غیر متوقع تھا لیکن پریشان کن تھا۔ ان سب نے مجھے کچھ سمجھا تھا۔ میں وہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ نہ ہی مجھے حنان سے کوئی دلچسپی تھی۔ میں تو اپنی ہی مشکل کا شکار تھی۔ چنانچہ میرے دل سے خوف نکل گیا۔

"نشادانش۔" میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں۔" حمیمہ بولی۔

"یہ میرا نام ہے۔" میں پورے سکون سے بولی۔

"بہت عجیب ہے، پہلے کبھی نہیں سنا، خیر تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم خناصاہ نہیں ہو؟"

"ہاں، میں کسی خناصاہ کو نہیں جانتی۔"

"اور کیا یہ بھی کہ تمہیں میرے بیٹے حنان نے تخلیق نہیں کیا؟"

"یہ ایک مضحکہ خیز تصور ہے، لیکن بزرگ خاتون کیا

تمہیں اس کا یقین ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" حمیمہ کے چہرے کے تاثرات نرم پڑنے لگے۔ اس کا تیکھا انداز ختم ہوگیا۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی تک حالات سمجھ ہی نہیں پائی، میری ایک الگ کہانی ہے، میں اپنی مشکل میں ڈوبی یہاں تک پہنچی تو یہاں ایک نئی الجھن کا شکار ہوگئی، لیکن تم نے بھی تو اس وقت مجھے اپنے بیٹے کی تخلیق کہہ کر خوش آمدید کہا تھا۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔" حمیمہ نے آہستہ سے کہا۔ پھر بولی۔

"لیکن تمہاری کیا مشکل ہے، ہوسکتا ہے میں تمہاری مدد کروں کیونکہ وہ نہیں ثابت ہوئیں جو میں سمجھی تھی۔"

"تم نے کیا سمجھا تھا مجھے؟"

"چھوڑو، جانے دو، میرے خیالات تمہیں پسند نہیں آئیں گے۔ اب میں تمہاری ہمدرد اور بزرگ کی حیثیت سے تم سے مخاطب ہوں، حقیقت یہ ہے کہ حنان حشام کا اکلوتا بیٹا ہے اور بہت سے امراء حشام سے رابطہ جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حشام راعمن عوس کے خاندان سے ہے اور اس کا منظور نظر چنانچہ ان کی خواہش ہے کہ ان کی بیٹیاں حنان کی قربت حاصل کرلیں۔ ان میں سے چند یہ بھی جانتے ہیں کہ حنان سنگ تراش ہے اور سنگ کری میں بے مثال، لیکن وہ ایک ہی بت تراشتا ہے، جس کے نقوش اس کے ذہن میں سمائے ہوئے ہیں اور وہ اس کے حصول کے لئے سرگرداں ہے۔ چنانچہ میں نے یہی سمجھا تھا کہ کوئی سنگمر میرے بیٹے کے جنون سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

میں صورت حال سمجھ گئی۔ اور میں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے کسی نے نہیں بھیجا، اور نہ میں ایسی کسی خواہش میں مبتلا ہوں۔"

"لیکن حنان کا جنون اگر تمہیں ہی خنساء سمجھنے پر مصر ہو تو تم کیا کرو گی؟"

"میں اسے قبول نہیں کروں گی۔"

"وہ ضد کرے تو....."

"یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔"

"تم قابل اعتماد ہو اور ضرور میری مدد کرسکتی ہو، لیکن تمہارا نام عجیب ہے اور اس سے قبل میں نے ایسا نام نہیں سنا، مجھے اپنا ہمدرد سمجھو اور اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو۔"

میں نے چند لمحات سوچا۔ وہ حقیقت جو میں خود نہیں سمجھتی تھی وہ کیا سمجھاتی۔ اس کے چند الفاظ نے مجھے سحر میں مبتلا کردیا جن میں اس نے راعمن عوس کا نام لیا تھا کیا یہ راعمن عوس ہی کا دور ہے اور داستان اپنے اصل رنگ میں چل رہی ہے۔ اس عورت کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہے اور اسے کوئی کہانی سنانی پڑے گی۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری زندگی پر اسرار واقعات سے عبارت ہے، میں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا نہ کسی ہمدرد کو۔ ہاں کچھ نادیدہ دشمن ضرور میرے اردگرد رہے ہیں۔ جو مجھے طرح طرح کے نقصانات پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میں اس دشمنی کی وجہ سے بھی نہیں جانتی نہ کبھی ان دشمنوں سے مقابلے کی سکت پیدا کرسکی۔ مختلف حالات سے گزرنے کے بعد تازہ ترین ظلم ہو رہے، مجھ پر کہ انہوں نے مجھے ایک تابوت میں قید کرکے دریا میں پھینک دیا تھا اور میں تابوت میں بہتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ دریا کے تھپڑوں اور شاید اس میں اکٹھی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا کر تابوت ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں دریا کا پھیلاؤ بہت زیادہ تھا اس لئے تابوت بہتے بہتے رک گیا۔ میں نیم بے ہوشی کی کیفیت کا شکار تھی۔ ہوش آیا تو یہ ساحل دیکھا اور تابوت سے نکل کر اس باغ کی جانب چل پڑی۔ جس کے بارے میں مجھے علم نہیں تھا کہ یہ محفہ میں ہے۔ ابھی اپنی مشکل پر غور کررہی تھی کہ آپ کے بتائے ہوئے نام کے مطابق حنان نظر آیا اور اس نے مجھے خنساء کے نام سے پکارا، تردید بھی نہ کرپائی تھی کہ آپ آگئیں اور مجھے یہاں لے آیا گیا، بس اتنی سی کہانی ہے میری....."

"آہ! بے حد عجیب اور قابل افسوس بھی۔ ایک اتنی خوب صورت لڑکی سے کون سگندل دشمنی کررہا ہے۔ کیا نام بتایا تم نے اپنا؟"

"نشادانش۔"

"تمہارے نام پر مجھے حیرت ہوتی ہے ایسے نام میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنے۔ تاہم نشادانش اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں نہ صرف تمہارے دشمنوں سے دور رکھوں گی بلکہ تمہارے دشمنوں کا پتہ لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچاؤں گی۔ یہ میری ذمہ داری بھی ہے اور وعدہ بھی۔ میں تمہاری کہانی پر بے حد حیران ہوں، بہت عجیب اور ناقابل یقین سی ہے۔"

"میرے پاس اپنی کہانی کا یقین دلانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے ہاں اگر تم چاہو تو دریا کنارے اس ٹوٹے ہوئے تابوت کو دیکھ سکتی ہو، جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔"

"نہیں..... نہیں، تم مجھے جھوٹی معلوم نہیں ہوتیں۔ حالانکہ پہلے میرے دل میں تمہارے لئے بغض تھا اور اس کی وجہ میں نہیں بتا چکی ہوں۔ لیکن اب میں تم سے مکمل ہمدردی رکھتی ہوں اور تمہاری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔ اصل میں کچھ ایسی سازشیں ہوئی ہیں جن کا کوئی جواز میرے سامنے نہیں آیا۔ میرا مطلب ہے میرے بیٹے اور حشام کے خلاف۔ میں نہیں جانتی کہ حنان کے ذہن میں وہ تصور کس نے ڈالا اور اسے بت تراشی کس نے سکھائی، حالانکہ حکم ہے کہ جب بھی کوئی بت تراشا جائے اس کے خدوخال راعمن عوس کے ہونے چاہئیں کوئی اور بت سرزمین مصر پر تراشنا جرم قرار دیا گیا ہے اور کبھی راعمن کو علم ہوجائے کہ اس کے عزیز حشام کا بیٹا کسی ایسی حسینہ کا بت تراشتا ہے جس کے خدوخال بھی نہیں ہیں اور جس کا چہرہ سیاٹ ہے اور جس کی صورت اس کی نگاہوں میں واضح نہیں ہے تو بہ طور دوہ بادشاہ وقت ہے۔ وہ شہنشاہ ہے اور حکم عدولی کی سزا حنان کو دے سکتا ہے۔ گویا یہ کوشش اس بات کی نماز ہے کہ یہ کام دشمنوں کا ہے اور دشمن کس کے نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے درپردہ بہت سے دشمن حشام کے خلاف مصروف عمل ہوں۔ میں نے بارہا یہی کوششیں کی ہیں۔

حنان تخلیق کار ہے، وہ پتھروں کے ٹکڑوں سے اپنی محبوب کی صورت بنانا چاہتا ہے لیکن خود داش اس کے علم میں نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن زندگی پائے گی۔ پتھروں میں جان پڑ جائے گی۔ میں عموماً یہی کرتی ہوں کہ جب اس کا مجسمہ مکمل ہوتا ہے تو اپنے خاص خادموں کے ذریعے اسے وہاں سے غائب کردیتی ہوں اور توڑ کر کسی ایسی جگہ پر ٹھکانے کردیتی ہوں جس پر کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ اس بار بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا اور حنان کے علم میں نہ تھا اور یہ وہی جگہ تھی جہاں اس کا تازہ مجسمہ ایستادہ تھا کہ تم وہاں آ کھڑی ہوئیں اور اسی لمحہ حنان نے تمہیں دیکھا اور یہ جانا کہ شاید اس کی تخلیق میں جان پڑ گئی اور اب وہ تمہیں اس حیثیت سے قبول کرنے پر آمادہ ہے۔

سنو نشادانش میں تمہیں اتنی مراعات دوں گی کہ تم مصر میں ایک باعزت اور معزز عورت کہلاؤ گی اور اہالیان مصر تمہاری قدم بوسی کے لئے بے چین ہو جائیں گے۔ یہ وعدہ کرتی ہوں میں تم سے اور میں کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتی، لیکن یہ حیثیت حاصل کرنے کے لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی، لیکن یہ وعدہ کرو کہ میری مدد پر آمادہ ہو، یا نہ ہو، میرا راز اپنے سینے میں رکھو گی۔"

میں نے گہری نگاہوں سے اس ماں کو دیکھا جو اپنے بیٹے کی مشکل کا حل چاہتی تھی۔ اور اچانک ہی میرے ذہن میں ایک دلگداز تصور پیدا ہوا۔ مائیں شاید اولاد کے لئے اتنی ہی پریشان ہوتی ہیں۔ میں تو ان جذبوں سے ہی ناآشنا ہوں، میں نے تو کبھی ماں کا خواب بھی نہیں دیکھا، کیوں نہ اس ماں کی مدد ہی کی جائے اور میرا جاتا ہی کیا ہے۔ یہاں آ کر بھی میں اپنے آئندہ کے مشاغل سے ناآشنا تھی۔ بس یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہی یہاں آ کر ہونا تھا میں نے اس سے کہا۔

"اگر میں تمہارے کسی کام آسکتی ہوں تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

"تو پھر سنو، حالانکہ مجھے فوراً ہی تمہیں یہ بات نہیں بتانی چاہئے تھی لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم میری مددگار بنو گی اور میری مشکل کا حل تلاش کرلو گی۔ حنان کی منسوبیت

میرے ایک بہت ہی قریبی ذوالنون مصری کی بیٹی راعنہ سے ہے اور ذوالنون مصری کی دلی خواہش ہے کہ حنان اسے قبول کرلے، کوئی مشکل نہیں تھی اس میں، اور ہم دل و دماغ میں یہ طے کئے ہوئے بیٹھے تھے کہ بلا خر ایک لمحہ ایسا آئے گا جب راعنہ کو حنان کی بیوی بنادیا جائے گا لیکن اب جبکہ حنان اس وحشی کیفیت کا شکار ہوگیا ہے تو نہ صرف میں بلکہ شمام، ذوالنون مصری اور راعنہ سب پریشان ہیں، ہم نہیں جانتے کہ حنان کو کیسے راہ راست پر لایا جاسکتا ہے لیکن تمہیں دیکھ کر یہ تصور میرے ذہن میں بیدار ہوگیا ہے کہ اگر تم تھوڑی سی محنت کرو تو شاید میرے اس تصور کو مکمل جامہ پہنا سکو۔"

"مجھے بتاؤ، میں کیا کرسکتی ہوں۔" میں نے خلوص دل سے کہا اور حمیمہ کسی سوچ میں ڈوب گئی، پھر اس نے کہا۔

"حنان تم سے ملاقات کرے گا اور ظاہر ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ تم اس کی تخلیق ہو، لیکن تم اس سے کہو گی کہ تم درحقیقت وہ نہیں ہو جسے اس نے تراشا ہے بلکہ اس کی نمائندہ ہو اور وہ جو اصل ہے وہ حنان کی تخلیق ہے، وہ حنان کا انتظار کررہی ہے اور اس سے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے کہ تم حنان کو اس تک لے جاؤ اور اگر حنان تمہاری باتوں کے جال میں آجائے اور اس بات کو تسلیم کرلے کہ تم اس کی تخلیق نہیں بلکہ اس کی تو تخلیق ہے وہ تم سے ہزار گنا زیادہ حسین اور ہزار گنا زیادہ دلکش ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ راعنہ اتنی ہی خوب صورت ہے اور پھر جب تم اسے اس بات پر آمادہ کرلو کہ وہ خنساء سے ملے تو میں تمہیں ذخیرہ بھیجنے کے انتظامات کردوں گی اور تم صحرائے ترشت کو عبور کرکے ذخیرہ پہنچ جاؤ گی۔ وہاں اسے راعنہ کے پاس پیش کردینا اور راعنہ خود کو خنساء کہہ کر اس سے روشناس کروائے گی اور یوں ذوالنون مصری کی بیٹی کی حیثیت سے نہ سہی، خنساء کی حیثیت سے حنان کی زندگی میں داخل ہوجائے گی اور اس بات کے خواہش مند دونوں باپ بیٹی ہیں۔"

میں نے حیرت و دلچسپی سے یہ عجیب و غریب فرمائش سنی اور مجھے بڑا دلچسپ کھیل محسوس ہوا ایسا کرنے میں بھلا مجھے کیا عار ہوسکتی تھی۔ یہ تو واقعی ایک عمدہ مشغلہ بھی تھا اور اس پر بہت زیادہ سوچنا حماقت، چنانچہ میں بخوشی اس کے لئے تیار ہوگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو واقعی ایک دلچسپ کام ہے اور میں اپنے آپ کو بخوشی اس کے لئے آمادہ پاتی ہوں۔"

"اور یہ ایک پریشان حال ماں کی امداد بھی ہے، جس کے لئے میں تمہارا احسان مند نہ ہوں گی۔"

"لیکن ایک سوال میرے ذہن میں گردش کررہا ہے، بزرگ خاتون؟"

"وہ کیا؟"

"کیا تمہارے اس عزیز کی بیٹی راعنہ کو حنان نے کبھی نہیں دیکھا؟"

"یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے، ایسا ہی ہے، اس نے راعنہ کو کبھی نہیں دیکھا اور اسی لئے یہ کام وہی سکتا ہے دیوتا تمہاری مدد کریں گے اور تمہیں اس میں کامیابی عطا ہوگی۔"

"میں خوش دلی سے اس کام کے لئے تیار ہوں۔"

حمیمہ نے اٹھ کر پرمحبت انداز میں میری پیشانی کو بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

"بعض اوقات جسے ہم دشمنوں میں شمار کرتے ہیں وہی سب سے اچھا دوست نکل آتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم میری مشکلات کی بجائے میری مشکلات کا حل لے کر میرے سامنے آئی ہو۔"

پھر حمیمہ چلی گئی اور میرے لئے انوکھی سوچیں چھوڑ گئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد ساری داستان پر غور کیا تو نہ جانے کیوں مجھے اس میں لطف آنے لگا۔ کیا ہی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا تھا اور کرنی کیا، کیا کام تھا مجھے؟ اپنی مرضی سے تو نہ جانے کب سے کچھ نہیں کیا تھا۔

حنان کو حمیمہ نے نہ جانے کیا کہہ کر میرے پاس آنے سے روکا تھا، اب جونہی اسے موقع ملا وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں پہلے کی نسبت بہت مطمئن ہوگئی تھی اور اس بار میں نے نہایت خوش دلی سے حنان کا استقبال کیا۔ خوب صورت سا نوجوان چہرے سے معصوم بھی نظر آتا

تھا۔ معصوم نہ ہوتا تو ایک ایسے احمقانہ تصور کا شکار کیوں ہوجاتا جس کا سر تھا نہ پاؤں۔ اس نے محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں بتا نہیں سکتا تمہیں خنساء کہ جب شادی مرگ کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ مجھے اپنی محبت پر یقین تھا حالانکہ مجھے اپنے فن پر اعتماد تھا اور یہ لوگ مجھے ایک عام سا انسان سمجھتے تھے اب کس طرح منہ کے بل گرے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرا فن دیوتاؤں کا فن ہے اور وہی میرے نگہبان اور محافظ کہ انہیں خنساء کی میری خلوت میں بھیجا تھا۔ سوائے آسمانی حسینہ، اے دیوتاؤں کی خدمت گار، اے دیوتاؤں کی منظور نظر میں تیرا استقبال کرتا ہوں۔ میں وہ الفاظ نہیں رکھتا جس سے تیری ستائش کرسکوں....."

"تو عظیم فنکار ہے تو بہت عظیم فنکار ہے حنان، لیکن معصوم ہے، بہت بھولا ہے، دیوتاؤں کی تخلیق مجھ جیسی نہیں ہوتی، وہ تو حسن و جمال میں ایسی ہوتی ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور سانس لینا بھول جائیں تیری سادگی نے مجھے خنساء بنادیا۔ جبکہ میں وہ نہیں ہوں جو تو سمجھ رہا ہے، میں خنساء نہیں ہوں۔"

میرے ان الفاظ پر یوں لگا جیسے حنان کے چہرے پر کھلے ہوئے پھول مرجھا گئے ہوں، اس کی آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی ہو، ایک لمحے کے لئے اس کے بدن میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی، پھر وہ غم آلود لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کہا تو نے..... یہ کیا کہا، کیا دی جو میں نے سنا تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ تو خنساء نہیں ہے؟"

"ہاں حنان، میں تجھے دھوکا کیسے دے سکتی ہوں جبکہ میں خنساء کی خادمہ ہوں، وہ خنساء جسے تیرے فن نے تخلیق کیا، وہ جس کے حسن و جمال کے سامنے میں ایک مدھم چراغ کی مانند ہوں، جبکہ وہ ایک روشن قندیل! تو اسے دیکھے تو ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ تیری خنساء میں نہیں ہوں۔ میں تو اس کی ایک خادمہ ہوں، کنیز ہوں، میرا نام رابعہ ہے سنا تو نے اور خنساء نے ہی مجھے تیری خدمت میں بھیجا کہ تو نے اس کی تخلیق مکمل کی تو وہ آسمانوں میں پرواز کرگئی اور اس کے بعد دیوتاؤں نے اسے واپس بھیج دیا اور اس سے کہا کہ تو ایک فنکار کی تخلیق ہے اور اسی کی ملکیت، دیوتاؤں کے بیچ تیرا گزر نہیں، ہر چند کہ تو دیوتاؤں ہی کا عکس لگتی ہے۔ تو پھر یوں ہوا کہ خنساء واپس آگئی اور اس نے شمام ہوکر مجھے تیری خدمت میں بھیجا اس نے کہا کہ میں عظیم فنکار سے کہوں کہ اس کی خنساء اس کی منتظر ہے۔"

میں خاموش ہوکر اپنے الفاظ کا ردعمل دیکھنے لگی جو کہ خاطر خواہ ہوا تھا۔ حنان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے پھر اس نے گردن جھکالی پھر دونوں ہاتھوں سر پکڑ لیا دیر تک سوچتا رہا، عجیب سی کشمکش کا شکار تھا پھر وہ کسی قدر شرمندہ لہجے میں بولا۔

"کیا تو اس بات کا یقین کرے گی کیا نام بتایا تو نے مجھے اپنا شاید رابعہ..... تو اے رابعہ کیا تو اس بات کا یقین کرے گی کہ مجھے حسن جمال کی طلب نہیں۔ میں اپنی مرکز نگاہ کو حسن و جمال میں بکتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں تو ایک بت تراش ہوں اپنی محبت کو خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہوتی، اپنے سامنے پانے کا آرزومند تھا، مگر تو نے عجیب کہا۔ حالانکہ تجھے دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا، میں نے سوچا تھا کہ میری تلاش اتنی حسین تو نہیں جتنی حسین ہے لیکن تو کہتی ہے کہ تو خنساء نہیں رابعہ ہے تو یقیناً غلط نہیں ہوگا۔ اے رابعہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو مجھے خنساء کے پاس لے چلے تو نے جو کچھ کہا ہے غلط نہیں ہے اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے جلد بازی کی۔"

"بے شک ..... بے شک۔" میں نے اس معصوم نوجوان کو شیشے میں اترتے دیکھ کر کہا۔ بہت آسانی سے اس نے میری بات مان لی تھی۔ جبکہ مجھے اس کی امید نہیں تھی پھر وہ بے چین نظر آنے لگا۔ اور بولا۔

"تو بتا مجھے، کیا تو مجھے خنساء کے پاس لے جاسکتی ہے؟"

"میری یہاں آمد کا مقصد اور کیا ہے، یہی کام کرنے کے لئے تو خنساء نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

"تو پھر چل ابھی چل۔ فوراً تیار ہوجا۔ میں اس سے

ملنے کے لئے بے چین ہوں۔"

"تو بہت معصوم نوجوان ہے۔ حنان بالکل بچوں جیسا، بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم پورا منصوبہ بنا کر یہاں سے چلیں، تیری ماں تجھے اجازت دے کر تو وہ زیور جا سکے کہ وہ زیورہ کے ایک خاص حصے میں خنساء تیری منتظر ہے۔ اگر میں اس طرح تجھے لے گئی تو مجھے تلاش کرنے والے مصر کے چپے چپے میں پھیل جائیں گے اور تجھے خنساء تک نہ پہنچنے دیں گے۔ اس کے برعکس تو اپنی ماں سے یوں کہہ کہ تو زیورہ جانا چاہتا ہے اور اس سے یہ بھی کہہ کہ میں تیری دوست ہوں اور تیرے ساتھ زیورہ جاؤں گی بس پھر زیورہ پہنچ کر میں تجھے خنساء کے پاس لے چلوں گی۔ وہ بڑی بے چینی سے تیری منتظر ہے۔"

"تو نے ٹھیک کہا، اگر میں اپنی ماں کو یہ سب کچھ بتا کر زیورہ جانے کی کوشش کروں تو وہ انکار نہیں کرے گی ٹھیک ہے میں اپنی ماں سے آج ہی بات کرتا ہوں، بلکہ ابھی۔ کیا میں جاؤں؟"

"میں نے مسکرا کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ پھر اس کے بعد میں نے خود کو سوچوں کے الجھاؤں میں نہیں ڈالا تھا۔ ایک سنسنی خیز کہانی کا آغاز ہو گیا تھا اب یہ کہانی کون کون سے رخ اختیار کرتی ہے، یہ دیکھنا تھا اور مجھے کوئی تردد نہیں تھا۔ کیونکہ اب تھوڑا سا اعتماد بھی قائم ہو گیا تھا اس بات پر کہ جو کچھ بتایا گیا ہے وہی سچائی ہے اور میں سیت کے دور میں داخل ہو گئی ہوں جہاں رامسن عوس عکمران ہے اور یہ ساری کہانی اسی سے متعلق ہے۔ دیکھنا یہ تھا کہ تاریخ کے اس دور میں مجھے کون کون سی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔

سویوں وقت گزرتا رہا اور میری خدمت گار اسی طرح میری خدمت کرتی رہیں جس طرح بھی امیر نمیری کے محل میں میری پذیرائی ہوتی تھی، پھر ایک رات حمیہ نے مجھ سے ملاقات کی اور مسکرا کر میرے قریب پہنچ گئی۔ پھر میرا سر اپنے سینے سے لگا کر بولی۔

"میری مونس، تمہارے اس احسان کو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے میری مشکلات کا حل مجھے دے دیا ہے، اس کے صلے میں، تمہارے لئے وہ سب کچھ کروں گی جس کی تم خواہش مند ہو۔ کل دن کی روشنی میں تم حنان کے ساتھ زیورہ کا سفر طے کرو گی اور میں تمہیں ساری تفصیلات بتائے دیتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ محافظ تمہارے ساتھ سفر کریں گے اور سحرائے ترشت عبور کرتے ہوئے تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ اذوؤں کی محمل نہایت آرام دہ ہوں گی۔ ترشت کو عبور کر کے تم زیورہ میں داخل ہو جاؤ گی اور میرا ہی معتمد خاص جسے تمام تفصیلات معلوم ہیں اور جو سیاہ رنگ کے لباس میں ملبوس ہوگا اور اس کے شانے پر مور کی کلغی لگی ہوگی، بس سمجھنا کہ وہی سب کچھ ہے اور اسے ہی تمام صورت حال معلوم ہے وہ جس جانب رخ کرے اسی طرف چلتی رہنا اور زیورہ کے مشرق میں ایک پرانا معبد ہے، جو اب عبادت کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ راجدہ اسی پر نصف مقام پر تمہاری منتظر ہوگی اور یہ سب کچھ ذوالنون مصری کے علم میں آچکا ہے اور اس نے پورے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے راتوں رات کیا کارروائیاں کی ہیں۔ نوجوان اور حسین راعنہ جو حنان کے نام پر جیتی ہے اس سلسلے میں مکمل تعاون کر رہی ہے کہ حنان اس کا محبوب ہے۔ سو وہ خود کو خنساء ہی کہہ کر مخاطب کرے گی۔ بس یہاں تک تمہارا کام ہے اور اس کے بعد ذوالنون مصری تمہارا میزبان ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ وقت کے بعد میں خود تمہارے پاس پہنچوں اور تم سے تمہاری ضروریات معلوم کر کے اس کی تکمیل کروں۔"

میں نے بے فکری سے اس تمام منصوبے کو قبول کر لیا تھا بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وقت گزارنے تھی جس طرح مصر میں آ پھنسی تھی اور زمانہ جدید میں بے شمار مشکلات کا شکار رہ کر تاریخ کے اس دور میں پہنچ گئی تھی اسی طرح تاریخ کے ہم رکاب یہ سفر جاری رکھوں گی یہ سفر کہیں تک پہنچے مجھے اس کی فکر نہیں تھی۔ سحرائے ترشت کا سفر دن کی روشنی میں ممکن نہیں تھا کیونکہ سورج کی تمازت اور جھلسا دینے والی گرم ہوائیں اس سفر کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ البتہ دن میں حنان نے زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گزارہ اپنی غلط فہمی پر شرمسار تھا اس نے کہا۔

"میری محسنہ یہ بات راز میں رکھنا کہ میں نے تجھے خنساء سمجھ لیا تھا اور اپنی محبت کے دروازے تیرے لئے کھول دیئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا انتظار کرتے کرتے، میری مراد خنساء سے ہے، میں اتنا بے حواس ہو گیا تھا کہ جب تو مجھے نظر آئی تو میں نے تجھے خنساء سمجھ لیا۔ اگر خنساء کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اسے اچھا نہ سمجھے گی۔"

میں نے مسکرا کر حنان کو یقین دلایا کہ میں اس کی خواہش کے مطابق ہی عمل کروں گی اور اسے کسی مشکل کا شکار نہ ہونے دوں گی۔ اس کے بعد حنان بار بار مجھ سے خنساء کے سراپا کے بارے میں سوال کرا رہا وہ کیسی ہے، اس کے حلیے کا انداز کیسا ہے کس طرح مسکراتی ہے، ساری باتیں دیوانگی کا درجہ رکھتی تھیں۔ لیکن محبت میں اسی طرح دیوانگی کا شکار ہوا جاتا ہے، اب میں اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھی۔

پھر سورج چمکا، حنان نے حمیہ سے اجازت لے لی تھی کہ وہ زیورہ چلا جائے۔ حمیہ تو پہلے سے تمام صورت حال سے واقف تھی چنانچہ اپنے لاڈلے بیٹے کے لئے اس نے وہ تمام تیاریاں کر دیں جو ضروری ہو سکتی تھیں اور دھلتی ہوئی شام ہم نے اذوؤں پر بیٹھ کر وادی ترشت کا رخ کیا یہ اسے صحرا ہی کہا جائے تو بہتر ہوگا اور میں نے سیاہ لباس میں ملبوس اس شخصیت کو دیکھ لیا جس کے بازو پر مور کی کلغی لگی ہوئی تھی۔ اور یہی وہ شخص تھا جو حمیہ کا معتمد خاص اور پرانے معبد تک رہنمائی کرنے والا تھا۔ یقینی طور پر ذوالنون مصری سے اس کی شناسائی ہو گئی کیونکہ اس کی معرفت وہ تمام کارروائی تکمیل تک پہنچنے والی تھی جس کے لئے تیاریاں کی گئی تھیں۔

صحرائے ترشت کی چمکدار ریت کے ٹیلے تیزی سے ٹھنڈے ہونے لگے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ سرد مہر ہوائیں ریت کے ٹیلوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں، بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ پراسرار ریتیں ریت سے گزر رہی ہیں جن کا وجود نظر نہیں آتا۔ ہم صحرا سے گزرتے رہے۔ حنان گھوڑے پر سوار تھا چند افراد اونٹوں پر تھے، میرے لئے جو محمل سجایا گیا تھا وہ بلاشبہ حمیہ کے کہنے کے مطابق نہایت پر آسائش تھا اور اس میں سفر کرتے ہوئے یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اونٹ کی پشت پر سفر کیا جا رہا ہے۔ صحرائے ترشت یقینی طور پر آگ کی جہنم ہوتا ہوگا۔ لیکن شام کے سفر میں وہ بہت پرسکون تھا اور اسے عبور کرتے ہوئے ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

آدھی رات کو جب چاند نے آسمان پر واپسی کا سفر شروع کر دیا، ہم زیورہ کی آبادی میں داخل ہو گئے اور خاموشی سے سفر کرتے رہے، حنان نے اپنا گھوڑا محمل کے قریب لا کر مجھے زور زور سے آوازیں دیں اور میں اس کی جانب متوجہ ہو گئی تو حنان بولا۔

"ہمیں کس سمت سفر کرنا ہے۔" کیا اس کا کوئی تعین کر لیا گیا ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں، میں اس کا تعین کر چکی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو براہ کرم ہماری رہنمائی کر....."

"چلتے رہو صحیح جگہ پہنچ جائیں گے۔" میں نے سیاہ لباس والے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

حنان تو مجھ پر جیسے ایمان ہی لے آیا تھا، خاموشی سے آگے کا سفر کرنے لگا۔ میں مطمئن تھی کیونکہ حمیہ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ ذوالنون مصری حمیہ کے منصوبے میں پورا پورا شریک ہو گیا ہے۔ الغرض یہ سفر جاری رہا۔

پرانا معبد جس کے بارے میں کہا گیا تھا در حقیقت ایک خوب صورت علاقے میں تھا اور زیورہ کی آبادیوں سے دور۔ راستے میں کئی باغ اور چراگاہیں نظر آئی تھیں پھر زیتون کے گھنے درختوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، کچھ فاصلے پر صنوبر کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے، مہندی اور سوسن کی جھاڑیوں نے روشنی کو زمین تک پہنچنے سے روکا ہوا تھا۔ معبد کے سامنے کے حصے میں ایک شفاف چشمہ ابل رہا تھا جس کا پانی سبزے کی بہتات سے کائی کی طرح گہرا سبز دکھائی دیتا تھا۔ رات اپنا سفر مکمل کر چکی تھی اور صبح

کی سہانی روشنی پھوٹنے لگی تھی، غالباً راعنہ بھی اسی طرح دل و جان سے حتان پر فریفتہ تھی کہ ساری رات اس کے انتظار میں اس نے آنکھوں میں گزار دی تھی اور اس وقت چشمے کے کنارے ہاتھ میں انجیر کی ٹہنی تھامے ایک عجیب سی شان دُربائی کے ساتھ وہ کھڑی پانی میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے بغور دیکھا، پھولوں سے زیادہ حسین و خوب صورت تھی، اس کا سراپا صنوبر سا، جسم بید کی طرح لچکدار تھا، اس کے نقوش بھی انتہائی حسین تھے اور اس کے اس پراسرار حسن نے فضاؤں کی کیفیت بدل دی تھی۔ میں نے حتان کو گھوڑے سے اترنے کا اشارہ کیا اور پھر سہارا لے کر محمل سے نیچے اتر آئی۔ حتان سحر زدہ نگاہوں سے راعنہ کو دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے کچھ مبہم الفاظ نکلے اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم مجھ سے کچھ کہا حتان؟"

"نہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ کیا میرے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے بدنما اوزار اس قدر حسن کو تخلیق کر سکتے ہیں؟"

"یہ اوزاروں کی تخلیق نہیں بلکہ تیرے دل میں اترے ہوئے وہ آسمانی نقوش ہیں جو دیوتاؤں کی تخلیق کہلاتے ہیں۔"

"آہ! تو نے سچ کہا، آسمان کی قسم ایسا ہی ہے۔ میں نے اس حسن کا تصور بھی نہیں کیا مگر اب تو بتا میں کیا کروں؟"

"وہ تیری منتظر ہے۔"

"کیا اسے میری آمد کا علم ہوگا؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔"

"تو میں جاؤں؟" وہ بچوں کی طرح معصومیت سے بولا اور میں نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی، تب وہ لڑکھڑاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔

مجھے تردد نہیں تھا میں نے جو ذمہ داری قبول کی تھی اسے پورا کر دیا تھا اب اس کے بعد جو بھی ہو، تمام تفصیل حمیرہ کو معلوم تھی اگر اس نے ذوالنون مصری اور راعنہ کو مکمل صورت حال بتا دی ہے تو کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی اور اگر کوئی ستم چھوڑ دیا ہے تو اس کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

شتربان اور دوسرے لوگ واپسی کے لئے مڑے تو میں بھی ان کے ساتھ پلٹ پڑی اسی وقت سیاہ لباس والے نے دست بستہ مجھ سے کہا۔

"میری مالکہ نے کہا ہے کہ میں تجھے ذوالنون مصری کے پاس لے جاؤں، چنانچہ میں تیری رہنمائی کرنا چاہتا ہوں۔" میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی، ہم سبزہ کے خوب صورت سبزہ زار عبور کر کے اس کے عقب میں پہنچے تھے کہ کچھ فاصلے سے گھوڑوں کے ٹھنوں سے نکلنے والی کھر کھراہٹ سنائی دی اور سہانی روشنی میں وہ گھوڑا گاڑی نظر آ گئی جو سونے کے پتر جڑی تھی اور چمچما رہی تھی اس کے قریب گاڑی بان کے علاوہ دو گھوڑے سوار بھی تھے مور کی کلغی والے شخص نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"آؤ ذوالنون مصری شاید خود تیرے استقبال کے لئے موجود ہیں۔" مجھے دیکھ کر ایک عمر رسیدہ شخص اپنے گھوڑے کو میرے قریب لے آیا اور اس نے کہا۔

"قابل احترام لڑکی، میرا یہاں رک کر تجھ سے باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ سواری تیرے لئے ہے اس میں بیٹھ جا بعد میں تجھ سے ملاقات کروں گا۔" میں نے گردن خم کر دی اور آگے بڑھ کر گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گھوڑا گاڑی میں سفر کرتے ہوئے میں نے ذخیرہ کی آبادی دیکھی سب الف لیلوی کہانیوں جیسا تھا۔ کسی حیرتناک بات تھی کہ میں ماضی میں سانس لے رہی تھی وہ جس کے بارے میں کتابوں میں تحریر تھا میری نظر کے سامنے متحرک تھے، یہ کس عمل کے تحت ہوا تھا ایسا کیوں ہوا تھا اس کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

بعد کے حالات میرے بیشتر تجربات سے مختلف نہیں تھے۔ میرے لئے ایک پرآسائش جگہ منتخب کی گئی تھی جس کے اطراف سبزہ زار بکھرے ہوئے تھے۔ عمارت ایک حسین آبشار کے کنارے واقع تھی۔ جس کا ایک حصہ بلندیوں سے گزرتے ہوئے آبشار سے اتنا نزدیک تھا کہ آبشار کی ننھی ننھی بوندیں اس کی دیوار سے ٹکرا کر اندرونی سمت آتی تھیں اور وہاں کیف و سرور کی بارش ہوتی تھی۔

حسین کنیزیں میری خدمت پر مامور تھیں اور مجھے ہر آرام فراہم کیا جاتا تھا۔ باہر نکلو تو ان سبزہ زاروں کو دیکھو جنہیں دیکھنے سے زندگی بڑھے لیکن اس کی تہیں جس کے سامنے اس کا مستقبل نہ ہو، یا جس کے تصور میں اس کے ماضی کی المیہ داستانیں رقم ہوں اور اس میں کہیں دلکشی کا کوئی ایسا نقوش ہو جو کارمائی سے معمور ہوتا ہے۔ لیکن یہاں وہ سب کچھ تھا جس سے صرف سرتیں وجود میں آتی ہیں تاہم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے ہر ماحول سے شناسائی پیدا کرنا پڑتی ہے۔ ذوالنون مصری یہاں میری آسائشوں کا بندوبست کر کے واپس چلا گیا تھا۔

سورج اور چاند کے طلوع و غروب نے گزرے ہوئے تین دنوں کا احساس دلایا تھا۔ چوتھے دن حمیرہ میرے پاس پہنچی تھی۔ اسی خوب صورت گھوڑا گاڑی میں جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا اور اس نے نہایت محبت بھرے انداز میں میری پیشانی کو بوسہ دیئے۔ وہ خوش تھی میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے حتان کے بارے میں بتاؤ بزرگ خاتون اس پر کیا گزری.....؟"

حمیرہ نے ایک مطمئن ہنسی ہنس کر کہا۔

"نوجوان دل بس عجیب ہی ہوتے ہیں اور یہ جوانی ایسی ہی ناہموار چیز ہے۔ دوڑتے ہیں تو اس طرح لگتا ہے کہ کہیں رکیں گے ہی نہیں اور رکیں گے تو یوں کے پیچھے چھوڑ آنے والی ہر شے کو سمیٹ لیا جائے گا، سو یہی ہوا کہ راعنہ کے حسن نے اسے مسحور کر دیا ہے اور چونکہ اس کی ایک انتقامانہ خواہش تکمیل ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب وہ وقت کا سب سے مطمئن نوجوان ہے۔ خنساء کی قربت نے اس کے افکار کی تکمیل کر دی ہے۔ کیا ہی خوبصورت تدبیر ذہن میں آئی تھی۔

ذوالنون بھی ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ میرے ذہن نے ایک انوکھا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ خیر یہ تو ہوئیں میرے مطلب کی باتیں۔ مجھے بتاؤ نیک لڑکی میں اب تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ اب میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرا کام ہو گیا ہے۔ تمہارا شکریہ اور اب تم اپنا کام بتا کر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرو..... نہیں ہرگز نہیں..... میں صاف گو ہوں اور کوئی لفظ جھوٹ نہ کہوں گی، تمہارے اس احسان کا کوئی صلہ نہیں ہے۔ میرے پاس اور اس کے جواب میں تم جو بھی مانگو گی میں تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ سوال میں نے صرف اس لئے کیا ہے کہ کہیں تم یوں نہ سمجھو کہ اپنی مقصد براری کے بعد میں نے تمہیں نظر انداز کر دیا۔"

میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں، معزز حمیرہ، میں ایسی کوئی بات نہیں سوچتی لیکن جتنا میں نے تمہیں بتایا اتنا ہی ہے۔ بس کہ دشمنوں کی گرفت سے نکل کر میں یہاں آ گئی ہوں، باقی میری زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ اگر میں قیام کے لئے کچھ وقت مل جائے تو مجھے مسرت ہوگی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو آگے اپنی تقدیر آزماؤں گی۔"

حمیرہ نے محبت سے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

"ایسی..... ایسی ہزار جگہیں تم پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ اس جگہ کو اپنی ملکیت سمجھو ہر شخص تمہارا مطیع اور فرمانبردار ہے۔ آرام سے رہو۔ ذوالنون بھی تمہارا اتنا ہی احسان مند ہے جتنی میں، اور تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار، سو جب بھی کسی شے کی حاجت ہو، کسی کنیز سے ذوالنون مصری تک پیغام پہنچا دینا۔"

حمیرہ مسکرا کر چلی گئی۔ حقیقت یہی تھی میرے رابطے ہی کیا تھے۔ روشناق یہاں تک آیا تھا لیکن وہ بھی اپنے کام سے چلا گیا تھا اور اب کون تھا، جس سے میں رجوع کرتی، اپنے خیال میں تنہا تھی جو ماحول دیکھ رہی ہوں اگر میرا خواب نہیں ہے تو پھر بھی سوچ سکتی ہوں کہ تاریخ نے مجھے ماضی میں طلب کر لیا ہے۔ اب اس کے کیا فیصلے ہیں ان کا خاموشی سے انتظار کرنا ہے۔ وہ دن بھی گزر گیا پھر کئی اور دن بیتے۔

ایک صبح ابر آلود تھی۔ بادلوں کے غول آسمان پر اٹکھیلیاں کر رہے تھے خوش رنگ پرندے درختوں پر اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ کہیں کہیں وہ غول کی شکل میں زمین پر اتر آتے اور ان کے مختلف رنگ سبز گھاس پر بے

حد حسین لگتے۔ میں باہر آئی اور سبزہ زار پر دور تک نکل گئی۔ پھر خوب دیر تک سیر کرتی رہی اور غیر محسوس انداز میں آبشار تک آگئی لیکن یہ اس کی عقبی سمت تھی۔ ایک پتلی سی پٹڑی جگہ جہاں گرتے ہوئے جھرنے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹان وہاں سائبان بنی ہوئی تھی۔ باہر بارش ہونے لگی اور کہاں دلچسپ بات تھی کہ پانی کے لاانتہا بہاؤ کے نیچے یہ ایک محفوظ جگہ تھی جہاں بھیگنے سے بچا جاسکے۔ میں چٹانی سائبان کے نیچے رک گئی اور سفید جھرنے کو دیکھنے لگی۔ پھر میری نگاہ عقب میں پڑی، وہاں مجھے ایک وسیع دہانہ نظر آیا جس میں ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یقیناً جھرنے کے عقب میں کوئی کشادہ غار تھا لیکن یہ روشنی حیران کن تھی۔

میرا تجسس مجھے اندر جانے سے باز نہ رکھ سکا اور میں غار میں داخل ہوگئی روشنی مشعلوں کی تھی جو دیوار میں نصب تھیں۔ کافی کشادہ غار تھا لیکن دہانے سے کچھ ہی فاصلے پر زمین پر دو تابوت رکھے نظر آرہے تھے۔ تابوتوں کے عقب میں ایک چوڑی سل ایستادہ تھی جس پر عبرانی زبان میں ایک تحریر کندہ تھی۔ نہ جانے ان تابوتوں میں کون ہے۔ یقیناً یہ دور قدیم کا کوئی مقبرہ ہوگا۔ اب ایسی چیزوں سے دہشت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ایک تابوت کے قریب پہنچ کر میں نے اس کا ڈھکن کھول دیا۔ اندر ایک انسانی جسم سکون کی ابدی نیند سو رہا تھا۔ حنوط شدہ چہرے کے خدوخال نمایاں تھے لیکن ان نقوش پر غور کرکے اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سر میں چکر آ گیا۔ یہ نظر کا دھوکہ ہے یا حقیقت یہ چہرہ اجنبی نہیں تھا.....!

میں نے اب ہارون دانش کے کتب خانے میں دیکھا تھا میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب روشاق اور احمد جنیدی نے مجھے اس پراسرار عمارت میں بھیجا تھا۔ میں نے اسے جزیرہ کوکونٹ پر دیکھا تھا لیکن یہ سلانو یہ تھی جسے روشاق نے سجدہ کیا تھا اور جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ میرے باپ کی نگران ہے۔ وہ خاموشی سے اس تابوت میں سو رہی تھی۔ پرسکون، بے جان بالکل یوں جیسے ایک ہلکی سی آہٹ پر جاگ اٹھے گی۔ میرے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بس آنکھیں کھولنے والی ہو۔ میری سانسوں کی مدھم آواز پر جاگنے والی ہو لیکن میں اس کے پاس سے نہ ہٹی۔ زیادہ سے زیادہ وہ جاگ جائے گی۔ مجھے کیا نقصان ہوگا۔ اس خیال سے میں نے خود کو سنبھال لیا۔ دل میں ہمت پیدا کی اور سوچنے لگی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

اچانک مجھے اس دوسرے تابوت کا خیال آیا۔ اس میں کون ہوسکتا ہے یہ تابوت دیکھا ہے تو دوسرے تابوت کو بھی دیکھو۔ ہمت کرکے اپنی جگہ سے ہٹی دوسرے تابوت کے پاس جا کر میں نے لرزتے ہاتھوں سے طاقت آزمائی کی اور دوسرے تابوت کا ڈھکن کھول دیا۔ اس میں بھی انسانی جسم موجود تھا۔ ایک مرد کا جسم، میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور میرے پورے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ آہ! میرے معبود، میرے مالک، کیا کیا دیکھنا ہے مجھے۔ کتنا صبر آزمائے گا تو میرا، کیسے سینگھالوں خود کو، کہیں پاگل نہ ہوجاؤں، کہیں مر نہ جاؤں، آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا۔ دماغ قبول نہیں کررہا تھا لیکن جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ خواب بھی نہیں تھا۔

یہ میرے ابو، ہارون دانش تھے۔ وہی چہرہ، وہی جاندار آنکھیں، وہی ستواں ناک، وہی دلکش ہونٹ جو میں طویل عرصے تک ایک تصویر میں دیکھتی رہی تھی۔ وہ تصویر جسے میں نے اپنے تصور میں زندگی دے دی تھی۔ یہ دوسری تصویر تھی لیکن یہ تصویر کہاں ہے۔ ایک مجسم وجود ہے۔ جسے میں چھو سکتی ہوں جسے چوم سکتی ہوں، جس کے سینے پر سر رکھ سکتی ہوں، بے اختیار ہو کر تابوت کے قریب بیٹھ گئی، زندگی میں پہلی بار اس خیالی وجود کو مجسم دیکھا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ یقین کرنا چاہتی تھی۔ اب کوئی خوف نہیں تھا۔

میرے ابو میرے قریب تھے میں نے انہیں چھو کر دیکھا۔ سخت بال، نرم رخسار جو برف کی مانند سرد تھے، لیکن پتھرائے ہوئے نہیں تھے۔ دونوں ہاتھ سیدھے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے ایک ہاتھ کو جنبش دے کر

دیکھا بالکل لچکدار، کوئی سختی نہیں تھی ان کے جسم میں، میں نے وہ ہاتھ اٹھا کر رخسار سے لگایا اسے چومنے لگی۔ نہ جانے کب کی آرزو پوری ہورہی تھی۔ نہ جانے کب کے ارمان نکل رہے تھے۔ کتنی محرومی تھی اس لمس سے کتنی آرزو تھی اس لمس کی، آنکھوں میں دھندلاہٹیں سوار ہوئیں اور مجھے ان آنسوؤں پر غصہ آنے لگا جو یہ صورت دھندلائے دے رہے تھے جس کے لئے میں ازل سے ترسی ہوئی تھی لیکن ان کا بھی حق تھا۔ میں انہیں نہیں روک سکی۔ امنڈتے چلے آرہے تھے۔ منہ سے سسکیاں بھی نکلنے لگی تھیں۔ میرے کان ان سسکیوں کو سن رہے تھے، دل بے قابو ہوا جارہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ بس دل تڑپ رہا تھا۔ آرزو تھی کہ وہ کچھ بولیں کچھ کہیں۔

اچانک کچھ آہٹیں ہوئیں۔ انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی جو دوڑنے کی شکل اختیار کرگئی۔ پھر کچھ غضبناک آوازیں سنائی دیں۔

"کون ہے..... کون ہے یہ؟" دوڑنے والے کئی تھے اس کی آن میں وہ میرے سر پر پہنچ گئے۔ نیزوں کی انیاں میرے بدن میں چبھے لیں۔ میں نے آنکھوں سے آنسوؤں کی چادر ہٹا کر انہیں دیکھا قدیم طرز کے لباس میں ملبوس، فوجی سپاہی تھے۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ ہماری آنکھیں تمہیں دیکھ کیوں نہ سکیں۔ یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میں نے چہرہ اٹھا کر رحم طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا اور وہ سب حیرت سے چیخ پڑے۔"

"دیوتا آمناس کی قسم۔ یہ تو ناتم سلاطیہ ہے۔"

"ہاں وہی ہے، دیوتا آمناس کی قسم، بالکل وہی ہے۔" دوسرے محافظ نے کہا۔

"لیکن..... لیکن یہ یہاں کیسے آ گئی، ہم تو ہوشیار تھے اپنی جگہ چوکس پھر یہ کیسے ہوا؟"

نیزوں کی انیاں میرے بدن سے ہٹ گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مرعوب ہوں۔ لیکن اس وقت کوئی چالاکی میرے ذہن میں نہیں تھی۔ میں تو اپنے درد کا شکار تھی، میں نے عاجزی سے ان سے کہا۔

"سنو، میں یہاں کسی برے ارادے سے نہیں آئی۔ تم لوگ مجھے جو سمجھ رہے ہو۔ میں وہ نہیں ہوں۔ یہ میرے باپ ہیں۔ میں..... میں نشا دانش ہوں اناتم سلاطیہ نہیں۔"

"غزلہ نفوت تم کچھ بھی کہو ہم بصیرت سے محروم نہیں۔ تمہارا احترام ہمارے دلوں میں ہے لیکن یہاں کی حفاظت کے ذمہ دار ہم ہیں اور ہم تو جرم بن چکے ہیں کہ ہمیں حکم تھا کوئی یہاں تک نہ پہنچے اور جب ذمام کو معلوم ہوگا کہ ہماری نگاہیں دھوکہ کھا گئیں اور کوئی یہاں تک پہنچ گیا تو ہم قابل سزا ہوں گے لیکن جھوٹ بولنا بھی ممکن نہیں۔ ہمیں بس اتنا بتا دو کہ تم یہاں تک کیسے آ گئیں اور ہمیں کیوں دھوکہ ہوگیا؟"

"میں نہیں جانتی کہ تم کس طرف پہرہ دے رہے تھے لیکن وہ میرے ہاتھ کی سیدھ میں اس دہانے کو دیکھو جس کا دور سے رخ آبشار ہے اور اس آبشار کے عقب میں یہ دہانہ جہاں سے میں اندر داخل ہوئی، لیکن مجھے اس ماحول سے محروم نہ کرو۔ میں بہت دکھی ہوں اور بڑے غموں کا شکار، نہ جانے کیسی کیسی مشکلات سے گزر کر مجھے یہ لمحات نصیب ہوئے ہیں مجھے کچھ دیر تو یہاں رہنے دو۔ دل کو سکون تو پا لینے دو۔ جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے آیا ہے میرے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

محافظوں کی تعداد چار تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھیں اور شاید کشمکش کا شکار نظر آنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"غزلہ نفوت، تم جو کچھ بھی کہو نہ ہم جھوٹے، نہ ذمام کے غدار اور نہ اپنے فرض سے گریزاں، آہ! یہ دہانہ پہلے نہیں تھا لگتا ہے پانی کی کاٹ نے غار میں ایک نیا سوراخ پیدا کردیا اور یہی ہماری بچت کی دلیل ہے بہتر طریقہ تم ہم سے دشمنی نہ کرو۔ فیصلہ تو ذمام ہی کرے گا لیکن یہ کیا کہا تم نے کہ تم اناتم سلاطیہ نہیں ہو۔ آہ! اگر تم نے یہ اعتراف نہ کیا تو ہمارے جرم کو نا قابل معافی قرار دیا جائے گا۔ اناتم سلاطیہ کو تو ویسے بھی کوئی یہاں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا سوائے اس کے کہ ذمام کو اس کی اطلاع دے

دی جائے لیکن یہ پتہ چل گیا کہ تم خود کو اناتم سلاطیہ نہیں تسلیم کرتیں تو شاید ذمام ہمیں معاف نہ کرے۔"

"دیکھو میں نے سچ بولا ہے اور میں یہاں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ تم مجھے کچھ دیر یہاں رہنے دو اس کے بعد تمہارے احکامات کی تعمیل کروں گی کہ اگر تم مجھے جی بھر کر آنسو تو بہا لینے دو۔"

محافظ ایک بار پھر مشکل میں نظر آنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہم تمہیں حکم دینے کا درجہ نہیں رکھتے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے مجبور ہیں۔ تم یوں کرو کہ پہلے ذمام سے ملاقات کرلو اور اس سے اپنی مشکل بیان کرو۔ ذمام کا فیصلہ ہمارے لئے آخری ہوتا ہے اور ہم بخوشی تمہیں یہاں رہنے دیں گے اور جو بھی بن پڑے گا تمہاری خدمت کریں گے۔" میں نے لاچار ہو کر گردن خم کردی اور انہوں نے احتیاط سے تابوت کے ڈھکن بند کردیئے۔ پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"بچت کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ ذمام کو اس نئے دہانے کے بارے میں بتاؤ جو اچانک نمودار ہوا اور اس سے پہلے موجود نہ تھا اور قابل عزت اناتم سلاطیہ انہیں یہ بتائیں کہ وہ اسی دہانے سے یہاں پہنچیں جبکہ ہم کسی طور ان سے منحرف نہیں اور راعمن عوس کی بہن کے غلام ہیں۔ عظیم سلاطیہ! ہمارے ساتھ چلو ذمام سے مل لو ہم تمہارے غلام تمہارے سامنے سرنگوں ہیں۔"

"چلو۔" میں ٹھنڈی سانس لے کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ جی تو شاید عمر بھر یہ بھرتا ابو کی صورت دیکھتے ہوئے لیکن جو کچھ سامنے آرہا تھا اس سے نہ پہلے انحراف کیا جاسکتا تھا اور نہ اب ممکن تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہولی۔ مڑ مڑ کر ان نابوتوں کو دیکھتی جارہی تھی اور دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ یہ خیال آرہا تھا کہ عقب سے آواز ابھرے کہ رک جاؤ، وہ میری بیٹی ہے، میرے پاس آئی ہے۔ اسے مجھ سے جدا کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ رک جاؤ، لیکن کان اس آواز کو ترستے رہے۔ وہ سرد وجود میرے لئے نہ بول سکا ویسے بھی وہ ساری عمر بولا کب تھا۔

وہ لوگ مجھے ایک طویل سرنگ سے گزار کر ایک وسیع غار میں لائے اور پھر اس غار کے بیرونی سوراخ سے باہر نکل آئے۔ ان کا انداز میرے ساتھ نہایت مودبانہ تھا اور ان میں سے کوئی سرکشی پر آمادہ نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ چل پڑی۔ دوسری جانب کا منظر بھی آبشار کی سمت والے منظر سے مختلف نہیں تھا۔ بلکہ شاید اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ یہاں بھی پھلوں کے باغات لگے ہوئے تھے اور ان باغات میں لگے ہوئے درختوں پر پھل اس طرح جھول رہے تھے کہ ان کی بہتات دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اسی باغ کے ایک گوشے میں ایک خوب صورت رہائش گاہ بنی ہوئی تھی اور اس رہائش گاہ میں بڑا سا دام موجود تھا۔

یہ ایک دراز ریش شخص تھا جس نے جو گیا نہ لباس پہنا ہوا تھا۔ لمبے لمبے بال شانوں سے نیچے چلے آئے تھے اور آنکھوں میں عجیب سی پرجلال کیفیت تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھ کر وہ بدحواسی کے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ پھر داہنا ہاتھ سینے پر رکھ کر رکوع کے انداز میں جھکا اور سیدھا ہو کر اپنے محافظوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اناتم سلاطیہ اور تم لوگوں کے ساتھ بھلا کیسے؟"

جواب میں محافظوں نے ہکلاتے ہوئے انداز میں اسے تفصیل بتائی اور وہ حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ پھر اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے مجھ سے کہا۔

"کیا آپ کیس زا کی میعاد پوری ہوگئی؟"

"سنو ذمام، میں نہیں جانتی کہ تمہارا علم کیا ہے، نہ ہی میں تم سے اس بارے میں کوئی مشکل گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے راعمن عوس کے پاس پہنچاؤ۔ بس مجھے لگتا ہے کہ اسی کے سامنے میں حقیقتوں کو بیان کرسکتی ہوں۔ تم لوگ شاید میری زبان نہ سمجھو گے اور ہو سکتا ہے کچھ بھی اس پر یقین نہ کرپاؤ گے۔"

"ہمیں حکم ہے کہ ہم اس قید خانے کی نگرانی کریں اور اس میں کسی چڑیا تک کو نہ داخل ہونے دیں لیکن محافظوں نے عجیب کیا اب اس دہانے پر بھی پہرہ لگوا پڑے گا تا کہ وہاں سے کوئی اور اندر داخل نہ ہوسکے۔ اور اگر ایسا ہو تو یہ قابل سزا نہیں قرار پاتے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ پانی کاٹ نے ایک نیا دروازہ غار میں نمودار کردیا۔ اور اس کے لئے یہ لوگ مجرم نہیں لیکن راعمن عوس کے پاس تمہیں پہنچانے کے لئے وقت درکار ہوگا۔ اور قابل احترام عزمل نفوت یہ ممکن نہیں کہ ہم تمہیں ان محلات میں غار میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ ہماری ذمہ داریوں کو گستاخی نہ تصور کرنا اور ہمیں اس انحراف کے لئے معاف کردینا لیکن یہ وسعتیں تمہارے لئے ہیں اور تمہاری ملکیت ہیں۔ یہاں قیام کرو اور ہمیں اطاعت گزار سمجھو۔ میں بہت جلد تمہیں راعمن عوس کے پاس پہنچانے کے انتظامات کرلوں گا۔"

میرے لئے خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کے خاموشی ہوگئی۔ ذمام نے میرے لئے اپنی رہائش گاہ خالی کردی اور خود باہر نکل گیا۔ میں ایک نشست گاہ پر بیٹھ گئی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ابو کا سراپا آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد دل کو قرار آیا۔ حالات پر غور کیا۔ وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو اب تک سنا تھا۔ اس سے قبل گو گو کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ کیا سچ ہے، کیا غلط لیکن اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ہنگامہ بے مقصد نہیں تھا۔ ہوش مندوں کی دنیا سے الگ روحانیت کی ایک دنیا بھی ہے جہاں بعید از عقل زندگی ہے لیکن کسی ذی روح کا اس زندگی سے گزرنا اس قدر اذیت ناک ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا میری زندگی اس قدر کربناک نہ ہوتی تو شاید میں بھی ان ہوشربا واقعات کی تاب نہ لاسکتی اور پاگل ہوجاتی۔ مجھے شاید وسکن ڈیزل نے بتایا تھا یا اناطور نے کہ میرے باپ کا بدن تاریخ کا قیدی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا مجھے بتایا گیا تھا سلاتھوبیہ نے بھی میرے باپ کی حفاظت کے لئے بے بدنی اختیار کرلی ہے، وہ بھی نگاہ کے سامنے آگیا تھا۔

بوڑھا دام کچھ دیر کے بعد واپس آیا۔ وہ کچھ برتن اٹھائے ہوئے تھا جو چاندی سے بنے ہوئے تھے اس کے عقب میں دو آدمی بھلوں کے طشت سنبھالے ہوئے تھے۔ یہ تمام اشیاء میرے سامنے رکھ دی گئیں اور ذمام نے کہا۔

"عزمل نفوت کے خدمت گار بے وسیلہ ہیں اگر یہ نذر قبول ہو تو عزت افزائی ہوگی؟"

"مجھے راعمن عوس سے ملا دو۔ تمہارا یہ احسان سب سے بڑا ہوگا۔"

"اس کا انتظام میرے لئے نجات کے راستے کھولتا ہے، میں نے بندوبست کئے لئے غلام روانہ کردیئے ہیں بس ان کی واپسی کا انتظار ہوگا۔"

چاندی کے برتنوں میں سنہرے رنگ کا مشروب تھا میں نے اسے ایک پیالے میں انڈیل کر دیکھا یقیناً وہ عرق انگور نہیں تھا پھل تو فرحت بخش تھا نا؟ کسی پھل کا رس بنایا گیا تھا اب میں خود راعمن عوس کے سامنے پیش ہونے کے لئے تیار تھی۔

انتظار کا وقت ختم ہوگیا۔ ایک گھوڑا گاڑی پہنچ گئی جو شاہی ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ کوچوان نے دست بستہ پائیدان لگایا اور میں اس پر قدم رکھ کے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد گاڑی آگے بڑھی۔ مرغزاروں سے گزرتے ہوئے میں باہر کے مناظر دیکھتی رہی ان مناظر کی تحریری تصویر کشی کتابوں میں پڑھی تھی لیکن اب وہ نگاہوں سے گزر رہے تھے۔ اہرام تعمیر ہو رہے تھے۔ غلام معماری کر رہے تھے اور جگہ جگہ یہ کام تیزی سے جاری تھا۔ یہاں تک کہ گاڑی آبادی میں داخل ہوگئی۔ رنگین لباس میں ملبوس مرد و عورتیں بازاروں میں اشیاء فروخت کرنے والے پھر ایک پرشکوہ محل کے اندر گاڑی داخل ہوئی اور وسیع و عریض صحن میں پھیلی ہوئی سنگی سیڑھیوں کے سامنے رک گئی۔ یہاں مجھے اس احترام سے اتارا گیا جو اب تک دیا جاتا رہا تھا۔ اس کے بعد کچھ مسلح نگہاں مجھے لے کر چل پڑے، سیڑھیاں عبور کر کے بلند و بالا دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ دروازے کے دونوں جانب پتھروں سے تراشے ہوئے دو عظیم الشان مجسمے ایستادہ تھے جن کے جسم شیر کے اور سر انسان کے تھے۔ اندر داخل ہو کر ایک دروازے سے گزری جس کے دونوں سمت غلام قطار سے

کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے ایک تخت زیریں پر شاید رامسن عوس بیٹھا ہوا تھا۔ سانولی رنگت اوپری جسم سے برہنہ، سونے اور جواہرات کے تاج سے آراستہ پتھرائے ہوئے نقوش کا مالک جس کے دو اطراف بہت سے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دو آدمی اس کے سامنے لے گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"سجدہ ریز ہو جا فرعون وقت مصر کے حکمران رامسن عوس کے سامنے.....؟" میں ساکت کھڑی ہوگئی۔

"سجدہ ریز ہو جا، سجدہ ریز ہو جا۔" بہت سی آوازیں ابھریں اور میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"یہ گستاخی کیوں، کیا تو فرعونی جاہ و جلال کی منکر ہے؟ کیا تو خداوند رامسن عوس کی عظمت سے منحرف ہے۔" کسی اور نے کہا۔

"میں..... میں نشادانش ہوں، نہ میں اسے خداوند مانتی ہوں اور نہ کسی انسان کے سامنے سجدہ کرسکتی ہوں۔ میری مشکل سنی جائے میں تو اس دور سے صدیوں بعد کی ایک لڑکی ہوں جسے تاریخ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔"

"آہ! کیا یہ انا تم سلاطیہ نہیں ہے لیکن یہ کس دور کی بات کرتی ہے؟" بہت سی آوازوں نے کہا۔ اسی وقت ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر کہا۔

"یہ عظمت فرعون سے واقف نہ ہوگی۔ ان واقعات سے جو انا تم سلاطیہ سے منسوب ہیں اور جن کی بنا پر وہ زنداں میں ہے اور مستقبل کا ہونا پاک وجود جو ہمارے درمیان آگیا تھا اور جس نے جلال فرعون کو انداز کیا تھا یہ یقیناً اس جرم کا گناہ ہے جسے لے کر وہ تاریخ کو داغدار کر گیا تھا اور اپنا جسم چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ خداوند سالوت نے سلاطیہ کو زندان دیا تھا یہاں وہ قید ہے۔"

رامسن عوس نے کہا۔

"کیا یہ انا تم سلاطیہ نہیں ہے؟"

"نہیں غزل لغفت، یہ سلاطیہ ثانی ہے۔"

"اس کی ہم شکل۔"

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے کہ یہ سلاطیہ کا گناہ ہے۔ وہ گناہ، جس کی پاداش میں وہ زندان میں ہے۔"

"ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ اس نے ہمیں سجدہ نہیں کیا۔ یہ ہمیں خداوند نہیں مانتی۔ سب سے پہلے اس جرم میں پابند سلاسل کیا جائے کہ اس نے حکم خداوندی نہیں مانا۔ اس کے بعد ساری باتیں بتائی جائیں۔"

"قبیل حکم فرعون عوس ہو۔"

"سلاسل شاہی منگوائی جائے۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"میں بغور اس کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ہنسی آئی کہ بلاوجہ دنیا والے اپنے دور کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ اپنے دور کے مسائل سے ناواقف صرف حکمرانی کے شوقین یہ سلسلہ صدیوں سے ایک جیسا ہے۔ رامسن عوس کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ غلام سونے کے طشت میں سونے کی ایک زنجیر لے کر آئے جو اس طرح سے میرے بدن کے گرد لپیٹ دی گئی کہ میرے بازو اس میں قید ہو گئے۔

"زندان..... زندان..... زندان۔" آواز آئی۔

"شاہی زندان!" دوسری آواز نے کہا اور سپاہی مجھے لے کر چل پڑے۔ میں سخت بدلی کا شکار تھی یہاں بھی سب ہی ایسے تھے نواقف، نا سمجھ، خود میں کھوئے ہوئے۔ رامسن عوس کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں اسے کیا بتاتی۔ اس سے کیا فریاد کرتی۔ حالات کافی خراب ہو گئے تھے۔ سپاہیوں کے ساتھ مجھے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ سیڑھیاں بلندی کو گئیں پھر گہرائیں میں اتریں۔ بدنما کھنڈرات جیسے نظر آئے اور پھر ہم تاریک قید خانے میں پہنچ گئے جہاں سپاہی مستعد تھے۔ اس کے بعد مجھے ایک سلاخوں والے دروازے کے پیچھے پہنچا دیا گیا جہاں اور کچھ تھا یا نہیں لیکن ٹھنڈک نے شک بھی میری زنجیریں بھی کھول لی گئیں اور سپاہی مجھے اسی طرح چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ شکر تھا زنجیر سونے کی تھی اور زیادہ وزنی نہیں تھی۔ مجھ پر کسی قدر تھکن طاری ہوگئی تھی اور میں اضمحلال کا شکار تھی۔ شاید یہ حالات مجھ پر اثر انداز ہوئے تھے۔

چنانچہ ایک صاف ستھری جگہ دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئی اور دیوار سے پشت لگا لی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور بند آنکھوں میں پھر وہی تصویر ابھر آئی۔ ابو کی تصویر..... بھرا بھرا بدن، حسین نقوش، لگ رہا تھا جیسے سو رہے ہوں۔ کتنے پیارے تھے میرے ابو..... آنکھوں میں آنسوؤں کی گرمی اترنے لگی رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ دفعتاً میں چونک پڑی یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بدن کے گرد کسی ہوئی زنجیر خود بخود ڈھیلی پڑتی جارہی ہو اس کی بندشیں پہلے کسی ہوئی تھیں لیکن اب..... پھر اس وقت میں خوفزدہ ہو گئی، جب میں نے زنجیر کے سروں کو کھلتے ہوئے دیکھا پوری زنجیر سانپ کی مانند جنبش کر رہی تھی اور میرے بدن پر سرسراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی اور میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر گر پڑی اور سرسراتی ہوئی مجھ سے کئی قدم کے فاصلے پر چلی گئی پھر اس کا ایک سر ابلند ہونے لگا۔

میرے حواس گم تھے اور میں اس جادوئی منظر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ اچانک شلزانہ اشیانوس کے نقوش نمودار ہوئے اور چند لمحوں میں مکمل ہو گئے لیکن ابھی اس میں کچھ تبدیلی اور ہو رہی تھی۔ پھر یہ نقوش بھی بدلے اور پھر دیر کے بعد روشناق کی مکمل شکل نظر آئی اور میں پتھرائی ہوئی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ روشناق کچھ مختلف نظر آرہا تھا اس نے نرم اور ہمدرد لہجے میں کہا۔

"پریشان نہ ہو نشادانش میں موجود ہوں۔"

"مسٹر دشاق.....؟"

"نہیں، اب مجھے ایمنی ترا وزی کہو، وہ نام ختم ہو چکا ہے، اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

"کیا آپ کا غصہ ختم ہو گیا آپ تو دوبارہ میرے پاس نہ آنے کے لئے کہہ گئے تھے۔"

"ہاں، بعد میں اپنا فیصلہ بدل دیا میں نے۔"

"کیوں.....؟"

"اس لئے کہ تاریخ کے اس دور میں بلکہ اس مردہ دور میں چند ذی روح ہیں، میں، تم اور ہارون دانش، حالانکہ میں نے پہلے بھی کہا تھا نشا دانش ہارون دانش کتنا ہی

والدین کے 6 درجات

☆ والدین کا احترام کرو تا کہ تمہاری اولاد تمہارا احترام کرے۔

☆ والدین کی باتیں غور سے سنو تا کہ دوسروں کی نہ سننی پڑے۔

☆ والدین کے سامنے اونچا نہ بولا کرو ورنہ اللہ تمہیں نیچا کردے گا

☆ والدین کے سامنے نظر جھکا کر رکھا کرو تا کہ اللہ تمہیں دنیا میں بلندی نصیب کرے

☆ والدین کی سختی برداشت کرو تا کہ باکمال ہو سکو۔

☆ یاد رکھنا باپ کے آنسو تمہارے دکھ سے نہ گریں ورنہ اللہ تمہیں جنت سے گرادے گا۔

والدین کے سائے سے عظیم تر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

باکمال سہی لیکن میں اس کے بہت کام آسکتا تھا۔ وہ ایک مورخ ہے تحقیق ہے، ذہین ہے لیکن پراسرار علوم کا ماہر نہیں جبکہ میرے باپ نے مجھے بہت سے علوم سکھائے تھے۔ شکر ہے تمہارے باپ کو ان علوم کی ہوا نہیں لگی۔ ورنہ وہ ان کے حصول کا بھی خواہاں ہوتا جیسے شلزانہ اشیانوس اپنے وجود کو تبدیل کرنے کا یہ فن صرف میرے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں۔"

"یہ کیا فن ہے؟" میں نے کہا اور ایمنی ترا وزی ہنس پڑا۔

"واہ! میرا داؤ مجھ پر ہی آزما رہی ہو۔ یہ فن جو کچھ بھی ہے دیکھو تمہارے کتنا کام آیا۔"

"میرے کام کیسے آیا؟"

"رامنہ عوس جیسا فرعون کو تم نے دیکھ لیا عیش و عشرت میں ڈوبے شخص کو یہ بھی یاد نہیں کہ اس کی بہن انا تم سلاطیہ زندان میں ہے اور اس کا باپ سالوت آمن عوس اسے زندان میں چھوڑ کر مر گیا تھا اور اسے کچھ ہدایات دے گیا تھا۔ اس کے دربار میں جب تم اس کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوئیں تو اس نے تمہیں بھی زندان میں ڈالنے کا حکم دیا اس وقت جانتی ہو ایک کار آمد آواز کس نے لگائی تھی۔"

"کون سی آواز؟"

"تمہارے لئے زنجیر منگائی گئی تھی اور ایک آواز نے کہا تھا کہ سلاسل شاہی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"وہ میری آواز تھی۔"

"تمہاری؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں میں نادیدہ شکل میں وہاں موجود تھا پھر جب تمہارے لئے زندان منتخب کیا گیا تو دوسری بار اس آواز نے شاہی زنداں کی آواز لگائی تھی۔ تم غور کرتیں تو پہچان لیتیں اسی طرح میں طلائی زنجیر بن کر تمہارے ساتھ اس زندان میں آ گیا یہ عمل ہم دونوں کے لئے سود مند رہا جانتی ہو کیوں؟"

"نہیں..... وہ بھی بتا دو۔"

"مجھے اپنی منزل تک پہنچنا نصیب ہو گیا اور تمہیں اپنی ماں تک۔" اس نے کہا اور میں نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی پھر اچانک میرے دل میں ہیجان برپا ہو گیا۔

"کیا..... کیا کہا تم نے..... کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"انا تم سلاطیہ بھی اسی زندان میں ہے۔"

"میری ماں؟" میں کانپ گئی۔

"یقیناً وہی۔" ایمنی تراوزی نے جواب دیا۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت ایک بار پھر خراب ہو گئی تھی میری ماں جس کی کوئی خیالی تصویر بھی میرے ذہن میں نہیں تھی یہاں زندہ سلامت موجود ہے حالانکہ ماں اور باپ دونوں ہی لمس سے نا آشنا تھی محبت کا وہ معیار جو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے کبھی نہیں حاصل ہو سکا تھا۔ میں ترجیحی، ترستی اور جھلستی ہی رہی تھی ہوش مند ہونے کے بعد جب یہ احساس ہوا کہ وہ ملازم جو مجھے ایک محبت کا دھوکہ دیتے تھے میرے اپنے نہیں بلکہ ان کی محبت میں صرف وفا پرستی شامل ہے اور وہ اپنا فرض نبھا رہے ہیں جبکہ ماں باپ ایک الگ ہی حیثیت کے حامل ہیں۔ ایوکا جسم خاکی تھا لاپروا میری جانب سے بے نیاز، اپنی آگ میں سلگتے ہوئے ساکت و جامد لیکن پیار آیا تھا ان پر، بکلیو بل کر رہ گیا تھا۔ انہیں دیکھ کر۔ ان کا تصور ابھی تک آنکھوں میں بسا ہوا تھا اب بھی یہی آرزو تھی کہ جنبش کریں مجھے دیکھ کر مسکرائیں اور میرا سر اپنے سینے سے لگائیں۔ باپ کے سینے کی وسعت میں جو تحفظ پوشیدہ ہوتا ہے شاید کائنات میں کسی اور چیز میں نہ ہو۔ میں مامتا کے جذبوں سے بھی آشنا تھی اور باپ کی شفقت سے بھی ان کی آواز مجھے سنائی دی تھی لیکن صرف اپنی مشکلات کا رونا روتے ہوئے اور اب ایمنی تراوزی کہہ رہا تھا کہ میری ماں اسی زندان میں موجود ہے میری آنکھوں میں حسرت دیکھ کر اس نے کہا۔

"اور میں نے تجھ سے کہا تھا میں نے تجھ سے بھوٹ بھی کہا تھا کہ یہ تیری دنیا کے بوجھ جھکوا اپنے خیال میں مست ہیں نہ تجھے کوئی تحفظ دے سکتا ہے اور نہ تیری مشکلات کا حل۔ واحد میں ہوں جو نہ صرف یہاں بلکہ ماضی میں ان تاریخی لمحات میں بھی تیرے کام آ سکتا ہوں جو تیرے لئے سب سے کٹھن لمحات ہوں گے لیکن ہارون دانش نے اپنے بھرم ضمیر کی آواز پر تجھے بھی مجھ سے دور رکھا۔ ہاں اب میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے حالات کی بنا پر ہی سہی تو مجھے یہاں تک لانے کا باعث بنی۔ چنانچہ میں تو خود پر تیرا احسان تسلیم کرتا ہوں اور اب بے لوث تجھ سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ دیکھ انسان کیسے کیسے ہوتے ہیں اصل میں ہر شخص کی طلب اسے ہر طرح کے کاموں پر مجبور کرتی ہے دنیا کی تاریخ میں جرم اور محبت صرف ایک ہی جذبے کے پیدا کردہ ہیں اور وہ ہے طلب میں اپنی محبت کا شکار ہوں تو بھی اپنے ماں باپ کی الفت چاہتی

ہے خیر چونکہ ہم دونوں کی مشکل ایک ہی ہے اس لئے میں اب بھی تجھ سے تعاون کروں گا۔"

"میری ماں یہاں موجود ہے؟" میرے لہجے میں ہزاروں حسرتیں تڑپ رہی تھیں۔

"ہاں میری محبوب یہیں موجود ہے۔" روشاق نے بھی اسی طرح حسرت زدہ لہجے میں کہا اور میں اس کے لہجے کی حسرت پر چونک پڑی۔

عجیب سا احساس ہوا تھا مجھے میں نے اس سے کہا۔

"ایمنی تراوزی کیا تو اس جگہ یہاں زندان میں میری ماں کو تلاش کر لے گا۔"

"اب تو فاصلے ختم ہو گئے ہیں میرا علم ناقص نہیں ہے اسی زنداں میں وہ موجود ہو گی اسے تلاش کرنا کیا معنی.....؟"

"کیا میں اس تک پہنچ سکتی ہوں؟"

"اس کا ذریعہ بھی میں ہی بنوں گا۔"

"تو مجھے وہاں لے چل مجھے حیرت ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ انا تم سلاطیہ یہاں زندان میں ہے تو ابھی تک مجھ سے باتیں کر رہا ہے اور اس تک نہیں پہنچ گیا۔"

روشاق کے چہرے پر ایک عجیب سی افسردگی چھا گئی اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں خود بھی اندرونی کشمکش کا شکار ہوں نشاد دانش وہ کیا جانے مجھے میری کون سی شناسائی ہے اس سے، کیا کہہ کر میں اس سے اپنا تعارف کراؤں گا ایک داستاں سنا دوں گا اسے اپنے بارے میں۔ نہ جانے کتنے برس سے وہ زنداں کی قید میں ہے نہ جانے کیا جذبات ہوں گے اس کے؟ جانا چاہتا ہوں اس کے سامنے لیکن کسی سفارش، کسی سہارے کے ساتھ اور وہ سہارا ابھی تو ہی ہو گی نشاد دانش اس سے بھی انکار کر دے۔" اس نے حزنیہ مسکراہٹ سے کہا اس کے اس انداز نے میرے دل پر اثر کیا تھا میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایمنی تراوزی کیا تیرے دل میں اب بھی اس کے لئے اتنی ہی محبت موجود ہے جبکہ تو جانتا ہے کہ وہ میرے باپ کی بیوی ہے اور میں اس کی بائیس سالہ بیٹی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"محبت کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا جب یہ تجربہ ہوا تو میری تحقیق نے بتایا کہ اس کے بعد ہر جذبہ کمزور ہو جاتا ہے، نہ کوئی طلب افضل ہوتی ہے اس سے، نہ کوئی ہوس، بس ایک جنون ہوتا ہے جاہے جانے کا، اور یہی جنون صدیوں کے لئے مٹی میں دبا دیتا ہے ورنہ کون دنیا جیتا گتا ہے۔ میں اب بھی اسے چاہتا ہوں اور اس سے ملنے کا آرزو مند۔ وہ اگر اپنے ہونٹوں سے اپنی آواز میں کہہ دے کہ مجھے چاہنے والے میری چاہت کی مدد کر مجھے ہارون دانش سے ملا دے تو میں ہارون کی زندگی کے عوض خود کو سزا کے لئے پیش کر دوں گا۔"

روشاق کے لہجے کی سچائی نے مجھے بے حد متاثر کیا کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔

"کیا اس قید خانے میں اسے تلاش کرنا ممکن ہو گا؟"

"ہاں، ہم ایسا کر سکیں گے۔"

"لیکن یہاں چپے چپے پر محافظ موجود ہیں۔"

"وہ ہمیں نہ دیکھ سکیں گے۔"

"لیکن کیسے.....؟"

"ہم پوشیدہ زاویہ اختیار کریں گے۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"ہارون دانش کی بیٹی میں نے تیرے باپ کو اپنا راز دار بنایا اور اس نے میرے سینے میں خنجر اتار دیا، آج میں تجھے ایمنی تراوزی کے ایک اور علم سے روشناس کرا رہا ہوں، جانے اس کا نتیجہ کیا ہو لیکن نتیجہ کچھ بھی ہو اس وقت میری غرض اول ہے تیرے باپ کو گرداوروں کے فن کا علم ہونا تو شاید آج اس کہانی کا وجود نہ ہوتا، وہ اپنے جسم سمیت یہاں سے نکل گیا ہوتا۔ زاویوں کے علم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اسے اپنا قیدی بدن یہاں چھوڑ نا پڑا، ابن سورج کے کھیل، بہت عجیب ہیں۔ اس نے ذہن کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔ ایمنی تراوزی نے اپنے دانش کدے میں اور کیا سیکھا تھا سوائے ان انوکھے تجربات کے۔ چاند کی سنہری کرنوں سے اس نے شلزانہ اوشیانوس کی تخلیق کی اور سونے کے رنگ پر تجربات کئے

انہی تجربات نے مجھے سنہرا کھلاڑی بنادیا اور تو نے مجھے کبھی سونے کا زیور پایا کبھی سونے کی زنجیر اور کبھی سونے کی عورت۔"

"کیا مطلب.....؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ موضوع تو بالکل مختلف ہے اس لئے تجھے اس کے بارے میں بتانا بے معنی ہے۔ وہ ان جواس وقت میرے اور تیرے لئے ضروری ہے۔ میں زاویوں کی بات کررہا تھا زاویوں کا کھیل دن کے اجالے میں ممکن ہے، رات کی تاریکیوں میں نہیں، سورج کا نکات کو روشن کردیتا ہے اور یہ اس جگہ کا امتیاز ہوتا ہے جہاں اس کے محفوظ رہنے کی انتہائہ کردی جائے یعنی اس قدر تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجائی دے۔ دن کے اجالے میں اس جگہ جہاں پیہائی ساتھ دے رہی ہو زاویوں کا کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔ اس تجربے کی بنیاد میں سمجھ کسی آئینہ خانے میں جہاں دو یا تین آئینے مثلث بنائے ہوں کھڑی ہو کر دیکھ پہلے تیرا وجود دو حصوں میں اور تین حصوں میں تقسیم دکھائی دے گا۔ پھر زاویے تبدیل کرتی رہو آہستہ آہستہ وہ آئینوں کے جوڑ پر تو ایک باریک لکیر کی مانند جائے گی پہ زاویوں کا جادو ہے سورج کی شعاعوں میں یہ کھیل زیادہ آسانی سے کھیلا جاسکتا ہے اور اگر شعاعوں کا زاویہ پالے تو انسانی آنکھ سے اوجھل ہوسکتی ہے۔"

"میرے خدایا..... کیا یہ کھیل ہر ایک کے لئے ممکن ہے؟"

"سیکھے بغیر کوئی علم آ سکتا ہے بھلا، آ میں تجھے اس بارے میں بتاؤں کیونکہ میں تیری مدد کا وعدہ کرچکا ہوں اور جانتا ہوں کہ جب وہ تجھ سے ملے گی تو اس کی محبت کے سوتے تیرے لئے کھل جائیں گے اور اس کے لئے مجھے تیرا تحفظ کرنا پڑے گا اور شاید ہارون دانش کا بھی، دیکھ میں تجھے بتاتا ہوں۔" روشناق نے اپنے جسم کو جنبش دینا شروع کردی وہ پہلے ہاتھوں سے زاویے بنا کر تکرار اور چند لمحات کے بعد اس کا ہاتھ ایک شانے کے پاس سے غائب ہوگیا یہ زاویہ پا کر اس نے اپنے بدن کو جنبش دی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم کئی نادیدہ دیوار کے پیچھے پوشیدہ ہوتا جارہا ہو دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس دیوار کے پیچھے گم ہوگیا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا ہیولا تلاش کرنے لگی یہ منظر بھی ناقابل یقین تھا۔ اس پوری کہانی کی مانند جو اب تک میری زندگی کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی میں ساکت وجامد اسے دیکھتی رہی۔ اس نے کہا۔

"کیا کہیں تمہیں میری پرچھائیں بھی نظر آرہی ہے۔"

یہ آواز مجھے اپنے عقب سے سنائی دی تھی، آواز کی سمت کا الاؤ مجھے نہ ہوسکا تھا میں پلٹی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔"

"یہی زاویوں کا جادو ہے اور اس وقت میں تیرے انہی زاویوں میں پوشیدہ کر کے اس قید خانے سے نکالوں گا اور ہم دونوں نادیدہ شکل میں اتنا سلاطیہ کو اس زندان میں تلاش کریں گے۔"

میں نے بے خیالی کے انداز میں گردن ہلادی کہ اچانک ہی وہ نمودار ہوگیا میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آہ! یہ جادو تو انوکھا ہے۔"

"یہ جادو نہیں جدید دور کی سائنس ہے اور تم دیکھ لینا نشاد دانش کہ جب بھی کبھی ذہین سائنسدانوں نے زاویوں پر کام کیا انسان کا انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجانا ایک عام عمل ہوگا کیونکہ یہ بہت زیادہ مشکل کام نہیں ہے بلکہ جدید دور کی سائنس بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ ہاں اب زیادہ وقت ضائع کیا جائے اور ہم لوگ اپنا کام شروع کریں۔"

"لیکن میں زاویوں کا جادو کیسے اپنا سکتی ہوں۔"

روشناق نے کچھ نہ کہا آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میری پشت اپنے سینے سے لگالی اس کے بعد وہ مختلف زاویے تلاش کرتا رہا اور کچھ دیر کے بعد اس کام سے فارغ ہوگیا میں نے بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"غالباً ہم اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں انفرادی طور پر ہی کارگر ہوسکتی ہے۔" جواب میں روشناق نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"نہیں، تو زاویے میں پوشیدہ ہوچکی ہے اور کوئی ذی

روح تجھے دیکھ نہیں سکتا۔"

میں نے شدت حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں اور بے یقینی کے انداز میں روشناق کی صورت دیکھنے لگی تب روشناق نے کہا۔

"ہاں اس کا تجربہ تجھے آسانی سے ہوجائے گا۔"

"زندان کا دروازہ بند تھا اور روشناق نے زور زور سے چیخنا شروع کردیا اور چند ہی لمحات کے بعد محافظ زندان کے دروازے پر آگئے، تین چار کی تعداد میں تھے یہاں پہنچتے ہی انہوں نے جیرانی سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر شور مچانا شروع کردیا۔

"قیدی لڑکی بھاگ گئی..... قیدی لڑکی بھاگ گئی۔"

ان میں سے ایک نے بے اختیار زندان کا سلاخوں والا دروازہ کھولا اور وہ سب فوراً اندر داخل ہوگئے۔ روشناق نے میرا ہاتھ پکڑا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ میں واقعی ششدر تھی اور ایک عجیب وغریب کیفیت محسوس کررہی تھی۔ روشناق پراطمینان انداز میں دیواروں سے لگا، لگا زندان کے دوسرے حصوں کی تلاشی لینے لگا ایک عظیم الشان قلعہ نما عمارت تھی جس کی پتھریلی دیواروں کے اطراف میں سپاہی بھاگ دوڑ کررہے تھے اور مجھے تلاش کررہے تھے۔ بارہا میرے قریب سے گزرنے کے باوجود وہ میری صورت نہ دیکھ پائے اور اب مجھے اعتماد ہوگیا تھا کہ میں عام نگاہوں سے اوجھل ہوچکی ہوں۔ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ حارث عبداللہ نے مجھے تصویر بنا کر متحرک کردیا تھا اور روشناق نے انسانی نگاہ سے پوشیدہ۔ نہ جانے اور کیا کیا رنگ ملیں گے مجھے۔ ہم زندان میں بھٹکنے لگے کچھ دیر کے بعد روشناق رک گیا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے شاید اس نے کچھ دیکھا تھا میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور میرا وجود بھی پتھرا گیا آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوگئیں۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی بکھرے ہوئے بال، خشک ہونٹ، لیکن حسن وجمال کا مرقع، میری شکل اس سے ملتی تھی مگر میں اس کے قدموں کی دھول بھی نہیں تھی وہ اب بھی مجھ سے ہزار گنا حسین تھی۔

"تیرا شکریہ نشاد دانش تیرا بے حد شکریہ یہی تو تھی جس نے مجھ سے میرا قرار چھین لیا تھا، یہی تو تھی جس نے میرے تصور میں بس کر مجھ سے دنیا چھین لی تھی تیرا شکریہ، میری ہزاروں سال کی محنت بارآور ہوئی ہے۔ تیرے طفیل یہ تیری ماں ہے، نشاد دانش یہ تیری ماں ہے۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو روشناق نے میرا بازو جھنجھوڑا۔

"نشاد دانش.....؟" میں چونک پڑی۔

"وہ تیری ماں ہے۔"

"ہاں ماں میں دیکھ رہی ہوں۔"

"اس سے مل، اسے بتا تو کون ہے میں زندان کا دروازہ کھلوانا ہوں، یہاں میرا انتظار کر۔ خود کو سنبھال ہمیں جو کچھ کرنا ہے احتیاط سے کرنا ہے خود کو سنبھال۔" روشناق دور ہٹا سے آگے بڑھا اور پھر کہیں دور نکل گیا میں نے چند قدم آگے بڑھائے اور سلاخوں والے دروازے کے پاس پہنچ گئی، یہاں کھڑے ہو کر میں اسے دیکھنے لگی بیزار بیزار..... چہرے کے نقوش میں اداسی آنکھوں میں بے کسی منجمد، یہ میری ماں ہے کیسی عجیب ہے میری تقدیر ماں باپ کو دیکھا تھا لیکن مجبوں کی شکل میں ایک زندہ بشکل مردہ تھا اور دوسرا قیدی۔

روشناق واپس آ گیا اس کے پاس زندان کی چابیاں تھیں اس نے چابیاں بڑے تالے پر آزمائیں پھر دروازہ کھل گیا روشناق نے تالا ایک طرف ڈال دیا پھر سرگوشی میں بولا۔

"اندر داخل ہونے سے قبل ہمیں اصل شکل میں واپس آجانا چاہئے۔"

میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے اس عمل سے کیسے گزرنا ہے۔ روشناق نے میری مدد کی اور مجھے جسم کی وہ جنبش بتائیں جن سے میں دوسروں کو نظر آنے لگوں اس کے بعد وہ بولا۔

"میں آگے نادیدہ رہوں تو بہتر ہے، ہوسکتا ہے میری موجودگی میں وہ تجھ سے بھرپور جذبات کا اظہار نہ کرسکے۔"

"جیسا تم پسند کرو۔ اپنی تراوزی۔" میں نے مضمحل لہجے میں کہا، میرے دل میں دھماکے سے ہورہے تھے سارا

وجود ہلکا ہلکا لگ رہا تھا۔ وہ ماں ہے۔ وہ میری ماں ہے۔ ایمنی تراوزی نے کہا۔

"اب تم اس کے پاس جاؤ اور اسے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

میں بوجھل قدموں سے زندان میں داخل ہوگئی۔ سیاہ لباس میں ملبوس مرقع حسن و جمال کے کے کانوں میں کسی کی آہٹ ابھری تو اس نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں صبح کی طرح روشن تھیں مجھے دیکھ کر ان آنکھوں میں کوئی تبدیلی نہ نمودار ہوئی جبکہ شدت جذبات سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گئی اور میں نے آنسوؤں سے گندھی آواز میں کہا۔

"میں نشا دانش ہوں۔" اس کے ہونٹ کھلے اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔

"کہو مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں ہارون دانش کی بیٹی ہوں۔"

"بے معنی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" تم جو کوئی بھی ہو اور جس کی بیٹی ہو، مجھے اس سے کیا غرض ہو سکتی ہے کس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں..... میں تمہاری بیٹی ہوں۔" میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں بے اختیار ہو کر رو پڑی۔ وہ سہم گئی اور آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر رنگ بدل رہے تھے۔ آنکھوں میں شدید حیرت امنڈ آئی تھی۔

"ماں، میں تمہاری بیٹی ہوں۔ تمہارے وجود کا ٹکڑا ہوں کب سے ترس رہی ہوں میں تمہارے لمس کے لئے اور مجھے دیکھ کر تمہارے سینے میں کوئی جذبہ نہیں جاگا۔ تمہارے ہاتھ جنبش بھی نہیں کر سکے۔ ماں ہو تم میری۔ وہ رشتہ ہے تم سے میرا جس کا اس کائنات میں کوئی بدل نہیں۔" میں نے رو رو کر کہا۔

"دیوتا ارساس کی قسم تم جھوٹی ہو، دیوتا آمنوں کی قسم تم بالکل جھوٹی ہو۔"

اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور میرے آنسو یکلخت رک گئے، میری آنکھوں کی دھندلاہٹیں ختم ہوگئیں۔

"کیا..... میں جھوٹی ہوں؟" میرے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"آمدن میرا گواہ ہے تم میرے لئے کوئی نئی سازش ہو کوئی اور فریب کیا جا رہا ہے، میرے ساتھ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ میں حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے کہا۔

"کیا تم انا تم سلاطیہ نہیں ہو؟"

"ہاں میں انا تم سلاطیہ ہوں، تمہیں یقیناً میرا پتہ دے کر بھیجا ہوگا گروہ اب اور کیا چاہتے ہیں۔ میری عمر تو زندان میں بسر کرادی، انہوں نے، اب کس بات کے خواہش مند ہیں۔ آہ! میں سمجھ گئی اب شاید راگمن عوس میری زندگی کا خاتمہ چاہتا ہے۔ یقیناً اس کے منصوبہ کا دوسرا دور شروع ہوگیا ہے۔"

"کیا میں تمہاری بیٹی نہیں ہوں؟"

"یہ بات تم بھی اسی طرح جانتی ہو جس طرح میں۔"

"میں تمہاری ہم شکل ہوں ماں، مجھے سلاطیہ ثانی کہا جاتا ہے۔"

"میری ہم شکل۔" اس نے غور سے مجھے دیکھا پھر پھیکے انداز میں مسکرا کر بولی۔

"میں اپنی صورت بھول چکی ہوں۔ کیا میں تم جیسی ہوں۔ البتہ راگمن عوس کی مذہبر سمجھ میں آ رہی ہے۔ کہیں میرا ہم شکل ہی ہونا چاہئے تھا..... ورنہ کھیل کیسے کھیلا جاتا۔"

"کیا تم ہارون دانش کو بھی نہیں جانتیں؟"

"میں کسی کو نہیں جانتی۔ جاؤ راگمن عوس سے کہہ دو یہ سب کچھ کر کے مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے، خوشی سے اتار دے۔ یوں بھی میں زندہ بشکل مردہ ہوں۔ میری موت سے کیا فرق پڑے گا۔" میں نے گھبرا کر ایمنی تراوزی کو آواز دی۔ وہ اپنا جسم حاصل کر چکا تھا اور شاید اندر آنے کے لئے تیار تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ میرے قریب آ گیا۔ انا تم سلاطیہ بھی اسے دیکھنے لگی۔ ایمنی تراوزی کے چہرے پر قربان ہونے والے تاثرات بھائے ہوئے تھے اور اس کی نگاہیں بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ (جاری ہے)

زندگی کا خاتمہ

خلیل جبار۔ حیدرآباد

نوجوان چیخ چیخ کر لوگوں کو بلانے لگا اور جب لوگ اس کے نزدیک پہنچے تو وہ بولا لوگو! دیکھو میری محبوبہ مجھے لینے آگئی ہے، میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں، اور پھر اس نے اپنا دل پکڑلیا اور فرش پر گرتا چلا گیا، اس کی روح اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔

جسم وجاں پر سکتہ اور لرزہ بر اندام کرتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب سراسیمہ کرتی کہانی

میں اس شخص کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ قتل جیسی چھ واردات میں کر چکا ہے۔ اگر وہ اس روز پکڑا نہ جاتا تو یقیناً ساتواں قتل بھی کر چکا ہوتا، اس کے علاوہ بھی اور نہ جانے کتنی وارداتیں کر چکا ہوتا لیکن اس کی قسمت خراب ہی تھی، اس لئے رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا، جس عورت کو وہ قتل کر رہا تھا وہ عورت تقریباً پینتالیس سال کی ہوگی۔ اور بازار میں خریداری کے لئے نکلی تھی، سڑک پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔ وہ سیدھی بازار جا رہی تھی کہ عین اس وقت جب ہتھوڑے سے وار کر کے اس عورت کا سر پھوڑ دینا چاہتا تھا، عورت نے پلٹ کر دیکھ لیا اور اس نے بے اختیار دوڑ لگادی، وہ بھی اسے مارنے کو دوڑا تھا، عورت کا نصیب اچھا تھا کہ ایک پولیس موبائل ادھر آ نکلی۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ پولیس کو

دیکھ کر عورت نے شور مچادیا۔ پولیس کے جوانوں نے پھرتی دکھائی اور بھاگتے ہوئے ملزم کو گرفتار کرلیا اور اب وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

قتل کی چھ وارداتوں نے شہر میں خوف و ہراس پھیلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ وارداتیں شہر کے مختلف علاقوں میں ہوئی تھیں لیکن سب کا طریقہ کار ایک جیسا تھا، یعنی سر پر ہتھوڑا مار کر عورتوں کو ہلاک کیا گیا تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو بھی یہ وارداتیں کررہا تھا، وہ کیوں کررہا تھا، اس کے پیچھے کیا راز تھا، محض اتفاق ہی تھا کہ ملزم رنگے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا۔ مجھے تفتیش افسر مقرر کیا گیا تھا اور مجھے اس سے یہ راز اگلوانا تھا کہ اس نے کیوں یہ قتل کیے تھے اور ان قتل میں کیا کسی اور نے بھی اس کی معاونت کی تھی۔

"تم نے مجھے ابھی تک بتایا نہیں کہ تم نے یہ قتل کیوں کیے؟"۔

"انسپکٹر صاحب میں جرم قبول کرچکا ہوں، اس کے بعد تفتیش کی گنجائش نہیں رہتی۔" وہ بولا۔

"کیا نام ہے تمہارا....." میں نے پوچھا۔

"مجھے نفیس احمد کہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"نفیس مجھے میرا کام کس طرح کرنا ہے، یہ میں زیادہ بہتر جانتا ہوں تم سے جو سوالات کررہا ہوں اس کا صاف، صاف جواب دیتے جاؤ تاکہ میرا کام آسان ہوجائے۔"

"میں اگر بتانے سے انکار کردوں تو....." وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"نفیس احمد میں ابھی تم سے پیار سے بات کررہا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تفتیش اس طرح ہوجائے کہ ہر بات واضح ہوجائے، ہوسکتا ہے کہ ان قتل کی وارداتوں کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہو اور وہ سزا کا مستحق ہو، ایسے میں تمہارے اکیلے پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے وہ صاف بچ جائے گا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں کسی کو بچانے کی کوشش نہیں کررہا، میں نے صاف صاف بتادیا ہے کہ یہ قتل میں نے کیے ہیں اور بس۔"

"اچھا یہ سب قتل تم نے کیے ہیں، پھر قتل کرنے کی وجوہات بھی بتادو کہ تم نے یہ قتل کیوں کیے؟" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ بات نہیں بتاسکتا۔"

"کیوں؟"

"بس میری مرضی۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"اس کمرے میں یہ سامان تم دیکھ رہے ہو، یہ سب سامان ملزم سے قبول جرم کرانے میں استعمال ہوتا ہے۔" میں نے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

چمڑے کا کوڑا، ڈنڈے اور دیگر سامان دیکھ کر ایک لمحے کو اس کا دم خشک ہوگیا مگر پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔

"اس سامان کو اس صورت میں استعمال کیا جاتا ہے جب کوئی جرم قبول نہ کرے جبکہ میں پہلے ہی جرم قبول کرچکا ہوں، پھر کیوں مجھے یہ سامان دکھا کر ڈرایا جارہا ہے۔"

"جب تک قتل کرنے کی اصل وجوہات معلوم نہ ہوجائے، ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوتی، اس لئے تم سے یہ بات نہیں جارہی ہے کہ تمہارا جرم قبول کرلینا ہمارے لئے کافی نہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آگیا۔

"میرے اصل وجوہات بیان کردینے پر بھی تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ میری بات کو مذاق سمجھو گے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے گردن جھکالی۔

"یہ تم کیسے کہہ رہے ہو کہ مذاق سمجھوں گا، ہوسکتا ہے کہ میں تمہاری بات سچ سمجھ لوں۔"

"یقین سے کہہ رہا ہوں کہ تم میری بات کو مذاق سمجھ کر ہنسی میں اڑادو گے۔" نفیس احمد نے کہا۔

"میں تمہاری بات کو مذاق میں نہیں اڑاؤں گا، جو بات بھی تم کہہ دو۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بات مجھے بتائے یا خاموش رہے، وہ چور نگاہوں سے تفتیش کے دوران تشدد کرنے کے سامان کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔

"سلامت ادھر آؤ۔" میں نے کانسٹیبل محمد سلامت کو آواز دی۔

"جی سر۔"

"یہ چمڑے کے ہنٹر کو تیل لگادو۔" میں نے ہنٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھ..... ٹھ..... ٹھہرو میں سب..... سچ سچ بتاتا ہوں۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے سلامت تم جائو، ضرورت پڑنے پر تمہیں بلالوں گا۔" میں نے کہا۔

کانسٹیبل سلامت کے جانے پر میں نے نفیس احمد کو گھورا۔

"ہم ملزمان پر تشدد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ملزم خود ہمیں تشدد کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

"میں سب کچھ سچ سچ بتادوں گا۔" نفیس احمد نے کہا۔

"ہاں میں سچ ہی سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ گویا ہوا۔ "نوشابہ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو تھی۔ فری پیریڈ ہمارے کینٹین میں گزرتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ تعلیم مکمل ہونے پر مجھے سب سے پہلے اچھی نوکری تلاش کرنا تھی اور پھر نوکری کا اچھا انتظام ہوجانے پر مجھے نوشابہ کا ہاتھ اس کے والدین سے مانگنا تھا تاکہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہوجائیں۔ فائنل ایئر کے پیپرز کے ہم رزلٹ کا انتظار کررہے تھے، لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ نصیب کا لکھا ہوکر رہتا ہے، ہماری قسمت میں بھی شاید ملن نہیں تھا۔ اس لئے نوشابہ کی مرضی کے خلاف اس کے گھر والوں نے اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں کردی تھی، مجھے اس کی شادی کا بہت دکھ ہوا تھا۔ کئی دنوں تک میں گم صم سا ہوکر رہ گیا تھا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا پھر جیسے جیسے وقت گزرتا رہا، میرا زخم بھی بھرنے لگا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے، میں بازار میں کچھ خریداری کرنے گیا تھا کہ اچانک میری ملاقات نوشابہ سے ہوگئی۔ وہ اس وقت اکیلی ایک دکان کے باہر کھڑی تھی۔ اسے وہاں اکیلا دیکھ کر میں چونکا۔

"ارے نوشابہ تم یہاں کیسے کھڑی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ مجھے دیکھ کر بری طرح چونکی۔

"ت..... ت..... تم۔"

"کیا بات ہے تم مجھے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے پریشان ہوگئی ہو۔" میں نے کہا۔

"و..... وہ..... میرے شوہر کامران دکان کے اندر گئے ہیں۔" نوشابہ کے چہرے پر مجھے اہٹ طاری تھی۔

"تم نے اپنی شادی پر مجھے دعوت نہیں دی، اس بہانے تمہارے شوہر سے ملاقات ہوجاتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ن..... نن..... نہیں..... تم ان سے ملاقات مت کرنا۔"

"کیوں؟"

"تم میرے موبائل پر بات کرلینا، میں سب کچھ بتادوں گی۔" نوشابہ نے کہا۔

"تمہارا نمبر ہی بند رہتا ہے، میں کس نمبر پر بات کروں۔"

"میں پرانے نمبر کو آن کردوں گی، اب تم جاؤ۔" نوشابہ نے دکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت ایک کالا، بدصورت سا آدمی جس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی، اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ وہ دکان سے باہر آیا، اسے دیکھتے ہی نوشابہ اس کے ساتھ چل دی۔ میں ان دونوں کو جاتا دیکھتا رہ گیا۔

شام میں میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ موبائل کی اسکرین پر میں نے نمبر دیکھا وہ نوشابہ کی کال تھی۔ اس کی کال دیکھ کر میں خوش ہوگیا۔ میں نے فوراً کال اوکے کردی۔

"نوشابہ تم کیسی ہو کیا وہ شخص واقعی تمہارا شوہر تھا، یا

تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا، تمہیں تمہارا شوہر خوش رکھتا ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے ایک دم ڈھیر سارے سوال کر ڈالے ہیں۔ میں باری باری ان سوالات کے جوابات دیتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں تمہاری کال دیکھ کر بے قابو ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"نفیس وہ شخص واقعی میرا شوہر ہے۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف کی گئی ہے۔ مجھے وہ بالکل بھی پسند نہیں ہے، میں نے اس رشتے پر بہت اعتراض کیا تھا۔ لیکن کسی نے میری نہیں سنی، حتیٰ کہ میرا موبائل بھی مجھ سے چھین لیا گیا تاکہ میں کسی سے بھی رابطہ نہ کر سکوں۔"

"تمہارے والدین نے ایسا کیا، مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"یہ بات سن کر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا لیکن یہ حقیقت ہے میری ماں کا انتقال ہو چکا ہے جس امی کو تم جانتے ہو وہ دراصل میری سوتیلی امی ہیں۔ میرے شوہر کامران سوتیلی امی کا بھانجا ہے اور دبئی میں بہت عرصہ رہا ہے۔ دبئی کی کمائی سے ہی ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے، لیکن دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، جیسی شکل وصورت کا میرا شوہر مالک ہے، ایسا ہی وہ بدداغ بھی ہے۔ ذرا، ذرا سی بات پر گھر کی گھر ہی سنانے میں دیر نہیں کرتا۔ ہر وقت مجھ پر شک کرتا ہے۔ کسی مرد سے بات کر لینے پر مجھے گالیاں سناتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ کیا میرا باپ لگتا ہے جو میں اس سے بات کر رہی تھی۔ اس لئے میں نے پرانی سم بھی چھپا کر رکھی ہوئی ہے تاکہ یونیورسٹی کا کوئی ساتھی رابطہ نہ کرے، ورنہ وہ خواہ مخواہ مجھ پر شک کرے گا، اور تہمت لگانے میں بھی تاخیر نہیں کرے گا۔" نوشابہ نے کہا۔

"اچھا!! اس لئے تم نے اپنے یونیورسٹی کے ساتھیوں کو بلایا نہیں۔"

"میں اپنے دوستوں کو شادی کی دعوت دے کر مذاق کا نشانہ بنانا نہیں چاہتی تھی، جو میرے شوہر کو، کہ میرا مذاق بناتا کہ تمہیں یہی شخص ملا تھا، شادی کرنے کے لئے ہم مر گئے تھے کیا۔"

"تمہارے ساتھ واقعی بہت برا ہوا ہے، تمہارے ابا اس رشتے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"میرے ابا کا مت پوچھو، امی جو کہتی ہیں وہ آنکھیں بند کر کے مان لیتے ہیں، اس میں ان کا بھی قصور نہیں ہے۔ میری سوتیلی امی کی جو بہنیں ہیں وہ جادو ٹونا کرانے میں بہت مشہور ہیں۔ انہوں نے ہی ابو پر ایسا کالا علم کرا دیا ہے کہ وہ امی کے علاوہ کسی اور کی بات کا یقین نہیں کرتے۔ سوتیلی امی کی بہنوں نے ہی یہ رشتہ کرایا ہے۔" نوشابہ نے بتایا۔

"واقعی کالے جادو کی بدولت ہی ایسا ہوا ہے۔"

"اچھا میں کال بند کر رہی ہوں کوئی آ رہا ہے۔" کہتے ہوئے نوشابہ نے کال آف کر دی۔

نوشابہ کے حالات کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ میرے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ مجھے اس سے سچی محبت تھی اور میں یہ کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی اس پر ظلم کرے، اس کی کامران کے ساتھ شادی کر کے سراسر ظلم و زیادتی کی گئی تھی۔ اب اکثر جب بھی نوشابہ کو فرصت اور بات کرنے کا موقع ملتا وہ مجھ سے بات کرنے لگی تھی۔ اس گھر میں نوشابہ کے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی تھی۔ اس کا شکی مزاج شوہر کامران بات، بات پر شک کرتا تھا۔ اکثر نوشابہ کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ وہ کس سے شکایت کرتی۔ ماں باپ کو شکایت کرنے پر وہ الٹا اسے ہی ڈانٹ دیتے تھے۔ گھر میں کوئی بھائی بھی نہیں تھا جو اس کی سنتا، احتجاج کرتا، ایک سال کے اندر، اندر نوشابہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بن کر رہ گئی تھی۔

وہ اکثر مجھے اب یہ کہنے لگی تھی کہ "اس زندگی سے بہتر ہے کہ وہ موت کو گلے لگا لے تاکہ اس جہنم سے نجات مل جائے۔" میں اسے سمجھاتا کہ وہ مایوس نہ ہو، حالات جلد بہتر ہو جائیں گے۔

ایک صبح جب میں سو کر اٹھا تو میں نے اپنے موبائل پر نوشابہ کا Sms دیکھا۔ اسے پڑھنے پر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ نوشابہ نے رات بارہ بجے یہ Sms کیا تھا اور اس میں لکھا تھا "وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہے۔ اس لئے خواب آور گولیاں کھا کر زندگی کا خاتمہ کر رہی ہے۔"

میں Sms پڑھ کر پریشان ہو گیا اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں رات جلدی کیوں سو گیا تھا۔ حالانکہ میں رات دیر سے سونے کا عادی تھا۔ رات کو میں بہت تھکن سی محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں نے دن بھر کوئی خاص کام بھی نہیں کیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بستر پر گرتے ہی نیند آ گئی تھی اور میں گہری نیند سو گیا۔ صبح ہونے پر ہی بیدار ہوا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کیا واقعی نوشابہ نے خواب آور گولیاں کھالی ہوں گی، میں نے نوشابہ کو کال کی۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ پھر میں نے ہمت کر کے نوشابہ کے ابو کے گھر پر کال کی۔ فون اس کے ابو نے ہی اٹھایا تھا۔

"فرحان صاحب میں نفیس احمد بات کر رہا ہوں۔ میں نوشابہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔"

"میں تمہاری آواز سنتے ہی پہچان گیا کہ نفیس بیٹا بات کر رہا ہے۔" فرحان صاحب نے کہا۔

"میں نے نوشابہ کے بارے میں آپ کو فون کیا ہے کہ وہ....."

"ہاں بیٹے یہ خبر درست ہے نوشابہ بیٹی نے خواب آور گولیاں تعداد سے زیادہ کھالی تھیں جس کے سبب اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ ہم اس کی تدفین کے سلسلے میں گھر سے نکلنے والے ہیں۔" فرحان صاحب نے کہا۔

نوشابہ کے انتقال کی خبر سن کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور خود کو میں بے قابو سا محسوس کرنے لگا تھا۔ پھر میں نے خود پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میں خاموشی سے نوشابہ کی تدفین میں شرکت کر کے چلا آیا۔ اس کی موت کے بعد میں گم سم سا رہنے لگا تھا۔

ڈائجسٹوں کی دنیا میں ایک اور خوب صورت اضافہ

خواتین کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ صائمہ کراچی

مئی کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

جس میں نامور رائٹرز کی کہانیاں، افسانے، ناول اور سچ پر مبنی بہت سی کہانیاں، اور بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتی ہیں ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا ہاکر سے نام لے کر طلب فرمائیں۔

معزز خواتین! آپ سب کے لئے سنہری موقع ہے کہ آپ دیگر رسالوں میں اپنی تحریریں بھیج کر انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہیں۔ لہٰذا اپنی تحریریں صائمہ میں ارسال کریں۔ پہلی فرصت میں آپ سب کی تحریریں شامل اشاعت ہوں گی۔

قیمت فی شمارہ ـــــــ -/50 روپے صرف

تحریریں بھیجنے کا پتہ

نورانی آرکیڈ سیزانائن فلور رتن تلاؤ نمبر 3 کراچی

PH:32711915

0334-3649610

ہر وقت اس کی یادوں میں کھویا رہتا۔ اس کے ساتھ بیتے دن کے منظر چلتے پھرتے نظروں کے سامنے آجاتے تھے۔ میرے خوابوں میں بھی متواتر نوشابہ نظر آجاتی تھی اور مجھ سے کہتی تھی ”کیا تم کو مجھ سے سچی محبت نہیں تھی۔“

میں کہتا۔ ”ہاں مجھے تم سے آج بھی سچی محبت ہے۔ میں تمہاری یادوں کو بھلا نہیں سکا ہوں۔“

وہ کہتی۔ ”پھر وہ عورتیں زندہ کیوں ہیں، انہوں نے ہی مجھے خودکشی جیسے عمل پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ابھی تک زندہ گھوم پھر رہی ہیں۔“

”تم کہو میں کیا کروں۔“ میں کہتا۔

”وہ جب تک مر نہیں جاتیں میری روح کو قرار نہیں آئے گا، کیا تم میرے لئے اتنا کام نہیں کرسکتے کہ میری روح کو قرار آجائے۔“ نوشابہ کہتی۔

”تم کیا چاہتی ہو کہ میں ان عورتوں کو قتل کردوں۔“

”ہاں میں یہی چاہتی ہوں، میں تمہیں ہاری ہاری ان کی شکلیں دکھاؤں گی اور تم ایک ایک کرکے انہیں قتل کردو، اگر تم نے ایسا کردیا تو میں سمجھوں گی کہ واقعی تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے ورنہ.....“

”میں ثابت کردوں گا کہ مجھے تم سے سچی محبت ہے۔ میں ایک، ایک کو قتل کردوں گا، اس کے بعد چاہے پھانسی لگ جائے۔“ میں کہتا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ مجھے ایک عورت کی صورت دکھاتی اور میں اسے قتل کردیتا۔ عورت کے قتل ہوجانے پر وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ ان عورتوں کو قتل کرکے نوشابہ پر میں نے ثابت کردیا تھا کہ میں واقعی اس سے سچی محبت کرتا ہوں۔

”تمہارا بیان مجھے کسی ڈرامے یا فلم کی اسٹوری لگ رہا ہے پھر بھی اس کو سچ مان لیتا ہوں، لیکن یہ بتاؤ ان عورتوں کا کیا قصور تھا جن کو تم نے قتل کیا؟“

”جس عورت کو میں قتل کردینا چاہتا تھا کاش وہ قتل ہوجاتی۔ تو یہ راز راز ہی رہتا مگر اس کا قتل نہ ہونے سے سارا راز فاش ہوگیا۔

”ان قتل کی وارداتوں میں بھی راز ہے۔“ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں نوشابہ کو خودکشی جیسا اقدام اٹھانے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ میں جس کو قتل کرنا چاہتا تھا وہ نوشابہ کی ساس تھی اور جو میرے ہاتھ عورتیں قتل ہوئیں وہ نوشابہ کی سوتیلی ماں اور اس کی بہنیں تھیں جنہوں نے کالے علم کے ذریعے نوشابہ کی شادی کامران سے کرائی تھی، وہ نہ نوشابہ کی شادی کراتیں اور نہ نوشابہ خودکشی جیسا اقدام اٹھاتی۔“ نفیس احمد کی آنکھوں میں آنسو موتی بن کر چمک رہے تھے۔

وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا بلکہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور گویا ہوا۔ ”انسپکٹر صاحب! جو کچھ بتانا تھا، میں نے واضح اور صاف صاف بتادیا۔ اب آگے آپ لوگوں کی مرضی ہے اور ویسے بھی میں صرف آج کے دن یہاں موجود ہوں۔ رات کے کسی بھی پہر نوشابہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گی۔

انسپکٹر صاحب پلیز! اب آپ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“ اور یہ بول کر میرے سامنے سے وہ اٹھ گیا اور آنکھیں بند کرکے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اور پھر اس کی بات ٹھیک نکلی۔ رات کا ڈھائی بجے کا وقت تھا کہ نفیس کی بلند آواز سنائی دی۔ ”انسپکٹر صاحب..... انسپکٹر صاحب..... دیکھیں نوشابہ آگئی ہے مجھے لینے کے لئے، میں نوشابہ کے ساتھ جارہا ہوں۔“

اس کی آواز سن کر میں جب وہاں پہنچا تو مجھے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہوئی وہ بولا۔ ”انسپکٹر صاحب اچھا ہوا کہ آپ آگئے، نوشابہ مجھے لینے آگئی ہے، میں نوشابہ کے ساتھ جارہا ہوں۔“

اور یہ بولتے ہی اس نے اپنا دل پکڑ لیا اور بے فرش پر گرتا چلا گیا۔ فوراً نبالا کھول کر ہم اندر پہنچے، مگر اتنی دیر میں اس کی روح اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔

شیطانی تصویر

راشد نذیر طاہر

دیوار پر لٹکے فریم میں لڑکی کی تصویر میں اچانک حرکت پیدا ہوئی، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تصویر والی لڑکی حقیقت میں فریم سے باہر نکلی اور خراماں خراماں چلتی ہوئی.....

ایک عجیب و غریب دل و دماغ میں وسوسے ڈالتی..... حیرت ناک..... حقیقی روداد

آرٹ گیلری کو اگر دوسرے لفظوں میں دانیہ کے جنون کے نام سے منسوب کردیا جاتا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ کیونکہ اسے اس فن سے جتنا لگاؤ تھا یہ سب ہی جانتے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ دوسرے آرٹسٹوں کی تصویروں کو اپنے گھر کی زینت بناتی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی ایک اچھی مصورہ تھی۔ اس لئے اس کے ذاتی فن پارے بھی یہاں موجود تھے۔

وہ اس گھر کی لاڈلی تھی، کیونکہ اکلوتی تھی، اس لئے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کے پاپا نے گھر کے اندرونی حصے میں اس کے لئے ایک وسیع کمرہ مخصوص کردیا تھا، جو خود بھی کسی آرٹ گیلری کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ایک طرف کینوس بھی موجود تھا، جس پر دانیہ اپنی صلاحیتوں کو آزماتی تھی۔

یوں بھی اس کے پاپا کو کاروباری مصروفیات کی وجہ

سے اسے وقت دینے کی فرصت نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی تمام خواہشات کو پورا کرتے ہوئے وہ اپنی محبت کا حق ادا کرتے تھے۔ اس کی مما بھی ایک سوشل ورکر تھیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے دانیہ کی بہترین تربیت کی تھی اور وہ اسے اپنے وقت کا مخصوص حصہ ضرور دیتی تھیں۔

بہرحال دانیہ ان تمام معاملات میں بہت خوش نصیب تھی اور اس کی سوچ کا شیشہ محل بہت ہی نفیس تھا اور کسی بھی قسم کے خطروں یا اندیشوں سے محفوظ تھا۔

عادتاً اس کی دوستی کا دائرہ بھی بہت محدود تھا۔ اور کالج لائف کے لحاظ سے اس کی بس ایک ہی بیسٹ فرینڈ تھی۔ جس کا نام نازش تھا۔ اور آج وہ اپنی اسی دوست کے ساتھ آرٹ گیلری کی ایک خصوصی نمائش میں آئی ہوئی تھی۔ خود نازش کو ان سب چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن وہ صرف تفریح طبع کی خاطر اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ ان دونوں کو یہاں دانیہ کی مما نے ہی ڈراپ کیا تھا۔ اور واپسی کے لئے ایک مخصوص ٹائم دے کر وہ خود ایک تقریب میں شرکت کے سلسلے میں روانہ ہوگئی تھیں۔

جس وقت یہ دونوں یہاں پہنچیں تو تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں کئی روز پہلے سے اخبارات میں اشتہار دیا جارہا تھا۔ اور اس میں کئی مشہور مصور بذات خود شریک ہورہے تھے جو کہ اسٹیج پر اس فن سے متعلق اپنی یادداشتیں اور اپنے تجربے خود بیان کرتے اور اس بیان سے ان کے مداحوں کو انہیں دیکھنے کا موقع مل جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت یہاں لوگوں کا کافی ہجوم تھا اور آرٹ گیلری کے سامنے موجود گراؤنڈ میں باقاعدہ کیمپ لگے ہوئے تھے۔

یہ ایک نئی قسم کی جدت تھی۔ یہ مصور کو ایک کیمپ میں مخصوص کردیا گیا تھا۔ جہاں ان کے شاہکار کرٹن پارے بھی موجود تھے۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ ان کیمپوں میں مصور بذات خود بھی موجود ہیں۔ دانیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ نازش کا ہاتھ تھامے ہوئے کسی تتلی کی مانند اس گلستان کے خوب صورت پھولوں پر ڈولتی پھر رہی تھی۔ اس پروگرام کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ خود نازش بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وقت کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح تیزی سے گزر رہا تھا۔ ابھی وہ ہی کیمپ اور رہ گئے تھے کہ جو دانیہ دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس گراؤنڈ کے آخری گوشے میں بھی ایک کیمپ موجود تھا۔ چنانچہ دانیہ نے نازش سے کہا۔

"چلو نازش..... اس کیمپ کو بھی دیکھتے ہیں۔ ذرا یہاں سے ہٹ کر بھی ہے، ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی زبردست سی تصویر کا سامنا ہوجائے..... آؤ....."

"بھئی دانیہ..... پلیز!..... میں تو اب بری طرح تھک چکی ہوں....."

"بس ..... یہ آخری ہے..... میرا وعدہ آؤ....."

"اف..... کتنا دور ہے وہ....." نازش نے مدھم کریکٹر کی طرف دیکھا: "کیا یہ مصور صاحب گھر والوں سے خفا ہیں.....؟"

"ہوسکتا ہے یہی بات ہو، اور ہوسکتا ہے کہ یہ بات نہ ہو....." دانیہ ہنسی اور پھر اس نے نازش کو کھینچا۔ اب اس کا رخ اس دور افتادہ کیمپ کی طرف تھا۔ دونوں قریب پہنچیں تو ایک سائن بورڈ آویزاں دیکھا۔

"تصویریں بولتی ہیں....." وہ دونوں اندر داخل ہوگئیں۔ یہاں بھی چاروں طرف تصویروں کا میلہ لگا تھا اور ایک جانب کاؤنٹر موجود تھا، جس پر ایک ادھیڑ موچھوں سے بے نیاز آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر 40 سال کے لگ بھگ ہوگی، وہ کافی توانا جسم کا مالک تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی شکل دیکھ کر نازش کے ذہن میں طوطے کا تصور ابھرا، کیونکہ اس کے چہرے کے نقوش میں ناک کافی واضح اور اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ان دونوں کو کافی غور سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس وقت کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔

دانیہ چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ان تمام تصویروں میں کچھ عجیب سی بات تھی۔ انہیں دیکھ کر دل میں ایک احساس پیدا ہورہا تھا، لیکن اسے کوئی نام دینا مشکل تھا۔ بہرحال دانیہ کا ذاتی خیال تھا کہ ایسی تصویریں اس نے شاید کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ یہ تصویر ایک نیا چہرہ تھا۔ جو جیتا جاگتا محسوس ہورہا تھا۔ تمام تصویروں کا مرکز صرف عورت کی ذات تک محدود تھا۔ ان میں عورت کی زندگی کے مختلف زاویے بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دانیہ کو ایک تصویر بے انتہا پسند آئی، اس میں ایک خوب صورت لڑکی کو زنجیروں میں قید دکھایا گیا تھا، اس کے چہرے پر دکھ، درد اور ستم کے ملے جلے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکی کے پس منظر میں ایک خوب صورت سا مکان بھی موجود تھا۔ جس کی کھڑکیوں سے روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ دانیہ نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ مکان خالی نہ ہو۔ اس میں کوئی موجود ہو۔

دانیہ نے بے ساختہ وہ تصویر اٹھائی اور اسے کاؤنٹر پر لے آئی۔ وہ شخص سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"جی محترمہ.....!" اس کا لہجہ کافی مہذب تھا۔

"یہ کردوں.....؟"

"بالکل..... اور قیمت بھی بتادیں.....!" اس نے کہا۔ پھر وہ نازش کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تصویر اچھی ہے نا.....؟"

"ہاں....." نازش نے رواداری میں جواب دیا تھا۔ اسے تو کوئی خاص بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن اپنی دوست کا دل بھی تو رکھنا تھا۔

اس آدمی نے تصویر کو پیک کیا اور دانیہ کی طرف بڑھادی۔

"قیمت.....؟" دانیہ نے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"یہ سب اصول شاہکار ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اور جو بے اصول ہو۔ وہ بیچی نہیں جاتی.....!"

"اوہ.....!" دانیہ کے منہ سے نکلا۔ "لیکن آپ کچھ تو پیسے لیں....."

"دور افتادہ جگہ پر یہ کیمپ لگانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ میں قدر دانوں سے کوئی قیمت وصول نہیں کررہا۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ نے اسے پسند کیا، یہی اس کا معاوضہ ہے۔"

"اچھا..... اور کیا میں ان بہترین شاہکاروں کے تخلیق کار سے ملاقات کرسکتی ہوں.....؟"

"جی ہاں..... بالکل.....!" یہ کہہ کر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ دانیہ کی طرف بڑھادیا اور مسکرا کر بولا۔ "اس ایڈریس پر آپ ان سے مل سکتی ہیں اور موبائل پر بھی گفتگو کرسکتی ہیں۔"

دانیہ نے کارڈ پر ایک واجبی سی نظر ڈالی اور نام پڑھ کر کارڈ پرس میں رکھ لیا۔ یہ کارڈ کسی ایم وائی ساحر صاحب کا تھا۔ بہرحال اس نے اس آدمی کا شکریہ ادا کیا اور نازش کے ساتھ کیمپ سے باہر آگئی۔ وہ آدمی انہیں باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اس نے پین اٹھا کر ایک صفحے پر کچھ لکھا اور پھر کچھ سوچ کر سر ہلادیا۔

دانیہ اب نازش کے ساتھ واپس نمائش کے مرکزی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اوہ..... دانیہ اب میں بری طرح تھک چکی ہوں....."

"ہاں..... بس اب مما آنے والی ہوں گی۔ ہم واپس چلیں گے....."

"دانیہ.....! ایک بات پوچھوں.....؟"

"ہاں..... پوچھو.....؟"

"اس تصویر میں کوئی خاص بات تھی۔ تم نے اتنی بڑی نمائش میں صرف اسی کو پسند کیا.....؟"

"بات تو کچھ خاص ہی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن میرا ارادہ کوئی تصویر خریدنے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو بس اس نمائش کو دیکھنے کے لئے آئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کیمپ میں جا کر میں نے یہ تصویر اٹھالی۔"

"مجھے وہ شخص بالکل پسند نہیں آیا۔" نازش نے منہ بنایا۔ "اسے دیکھ کر مجھے بڑا عجیب سا احساس ہوا تھا۔"

"کیا مطلب.....؟" دانیہ نے پوچھا۔

"میں نے اسے....." نازش کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ اچانک ہی ان کی نظر دانیہ کی مما پر پڑی تھی۔ جو ان ہی کی طرف متوجہ ہوکر ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھانے لگیں۔ مما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں تھیں تم دونوں.....؟ میں تو کافی دیر سے یہاں گھوم رہی ہوں۔ واقعی بڑی زبردست نمائش ہے....."

"جی مما..... ہم نمائش ہی دیکھ رہے تھے اور مجھے گفٹ بھی ملا ہے.....!"

"اوہ..... ویری گڈ.....!" وہ پھر مسکرائیں۔

"اچھا..... اب چلیں..... رات کا وقت ہونے والا ہے..... ہمیں اب گھر پہنچنا چاہئے۔ آج تمہارے پاپا نے کہا تھا کہ وہ بھی جلد گھر آ جائیں گے....."

"جی ہاں..... اب بس گھر ہی چلیں....." دانیہ نے سر ہلایا۔

"نازش..... تم بھی ہمارے ساتھ چلوگی.....؟" مما نے پوچھا۔

"نہیں آنٹی..... آپ مجھے میرے گھر پر ڈراپ کر دیجئے گا....."؟

"اوکے....." انہوں نے جواب دیا۔ اور پھر وہ لوگ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ راستے میں انہوں نے نازش کو اس کے گھر پر ڈراپ کر دیا۔ جلد ہی وہ اپنے علاقے میں داخل ہو گئے۔ جیسے ہی دانیہ کی مما ثوبیہ نے کار کو اپنے گھر کی طرف جانے والی گلی میں موڑا، اچانک ہی ایک کالے رنگ کی بلی کار کے سامنے آ گئی۔ انہوں نے فوراً ہی بریک لگائی۔ وہ تو کار کی رفتار موڑ مڑنے کی وجہ سے پہلے ہی دھیمی تھی ورنہ اس وقت بلی کا کچومر نکل جاتا۔ بریک لگتے ہی بلی دوسری طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ثوبیہ نے کھڑکی سے سر نکالا اور بلی سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"کیا مرنے کا ارادہ تھا.....؟"

دانیہ ہنس پڑی اور اپنی مما سے بولی۔

"آپ تو ایسے پوچھ رہی ہیں۔ جیسے وہ آپ کی بات سمجھ رہی ہو....."

"اب اور کیا کروں....." انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

"میں میاؤں میاؤں تو کرنے سے رہی....." دانیہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ جلد ہی وہ دونوں اپنے گھر میں آ گئیں۔

پھر اس کی مما تو کچن میں مصروف ہو گئی تھیں اور دانیہ نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس نے اپنی مما سے کہہ دیا تھا:

"مما.....! میں ذرا اس تصویر کو کمرے میں سیٹ کر رہی ہوں۔ اگر کچن میں میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے بلا لیجئے گا.....!"

"ٹھیک ہے ڈیئر.....! تم حرکت کرو....." وہ مسکرائیں۔ "اگر ضرورت پڑی تو بلا لوں گی۔ میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارے پاپا کے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لوں۔ پھر ہم سب ساتھ ہی مل کر کھائیں گے..... ورنہ اکثر تمہارے پاپا تو لیٹ ہی ہو جاتے ہیں۔"

دانیہ سر ہلا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایک جگہ منتخب کرنے کے بعد تصویر کو ڈبے سے نکال لیا۔ عین اسی وقت ایک عجیب سی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ دانیہ کو کافی حیرت ہوئی، بھلا تصویر میں خوشبو کا کیا کام، پھر اس نے اس بات پر زیادہ غور نہیں کیا۔ ویسے خوشبو بھی بہت شاندار، اس کے دل و دماغ معدود ہو کر رہ گئے تھے۔

تصویر اس نے اپنے بیڈ کے بالکل سامنے ہی دیوار پر ٹانگ دی، اور پھر یہ ٹک کا جائزہ لینے لگی رہی، پھر وہ بڑبڑائی۔ "واقعی شاہکار ہے۔ اس معیار تک پہنچنے کے لئے مجھے نہ جانے کتنا وقت درکار ہوگا۔ کتنی پریکٹس کی ضرورت ہوگی۔ واقعی بنانے والے نے خوب ہی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے.....!"

عین اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے سر میں ہلکا سا درد ہونے لگا تھا، کافی ہلکا درد، جسے وہ برداشت کر سکتی تھی، اس نے خالی ڈبہ ڈسٹ بن میں ڈالا اور اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔

اس دن بہت انجوائے ہوا تھا۔ دن کا وقت تو نمائش میں گزر گیا تھا۔ اور پھر رات میں پاپا کے جلدی آ جانے کی وجہ سے ان سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا، پھر کافی دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے اور فی

ڈی دیکھتے رہے، اس کے بعد وہ لوگ اپنے کمرے میں چلے گئے اور دانیہ نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ چونکہ وہ تھکی ہوئی بھی تھی اس لئے جلد ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

وہ بے خبر سو رہی تھی کہ رات کے نہ جانے کس پہر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے کمرے میں نائٹ بلب جلا کر سونے کی عادی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سمجھ نہ سکی کہ اس طرح آنکھ کھلنے کی وجہ کیا ہے.....؟

بس یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے جھنجوڑ کر اٹھایا ہو اور خود کہیں چھپ گیا ہو۔ دانیہ جلدی سے اٹھی اور اس نے کمرے میں روشنی کر دی۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا.....! تھوڑی دیر بعد وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی خواب کے زیر اثر ہو کر اس کی نیند کھلی تھی..... چنانچہ وہ دوبارہ لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اسے ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی، ایک احساس تھا جو خود بخود ہی اس کے ذہن میں اترا تھا اور آہستہ آہستہ یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں کوئی اور بھی اس کے ساتھ موجود ہے.....! جس سے با قاعدہ سانسوں کی آواز بھی کمرے میں گونجنے لگی تھی۔ دانیہ نے ابھی لائٹ آف نہیں کی تھی۔ چنانچہ وہ دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا، اس کے علاوہ تو اور کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر یہ سانسوں کی آواز.....! جیسے کوئی تیز قدموں سے کافی دیر تک چلنے کے بعد رکا اور اس کی سانسیں بے ربط ہو گئی ہوں۔ دانیہ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔ دفعتاً اس کی نظر نئی لگائی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئی اور پھر ایک بے ساختہ قسم کی چیخ اس کے منہ سے برآمد ہوئی۔

تصویر اپنی جگہ پر موجود تھی۔ لیکن زنجیروں سے جکڑی ہوئی لڑکی اس میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دانیہ بستر سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور فوراً ہی دروازے کی طرف لپکی۔ پھر اس نے بڑی عجلت میں دروازہ کھولا اور اسی شب خوابی کے لباس میں ہی اپنے پاپا اور مما کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ اس پر یک دم ہی دہشت سوار ہو گئی تھی۔ اس نے ان کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا۔

"مما.....! مما.....! پاپا.....!

تھوڑی دیر بعد ہی قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھلا۔ سامنے اس کی مما کی شکل دکھائی دی۔ جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ جلدی سے بولیں۔

"کیا ہوا بیٹا.....! خیریت تو ہے.....!"

"م.....مما..... وہ میرے کمرے میں....." اس کی آواز رندھ گئی۔

"کیا ہوا تمہارے کمرے میں....." وہ باہر نکل آئیں۔ "کیا کوئی بلی وِلی گھس آئی ہے.....! افوہ..... تم کتنا ڈرتی ہو ان بلی اور چوہوں سے..... حد کر دی ہے تم نے.....!" وہ نیند کی غنودگی میں تھیں۔

"نہیں مما.....!" یہ کہہ کر اس نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا، وہ انجھن زدہ انداز میں اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ پھر وہ بولیں۔ "آؤ میرے ساتھ.....! میں دیکھوں.....!"

وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے کمرے میں آ گئیں۔ لیکن یہاں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ خود دانیہ بھی ششدر رہ گئی۔ تصویر میں عورت بھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اور بے ربط سی سانسوں کا شور بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے بیٹی.....!" ثوبیہ نے مڑ کر نرم لہجے میں کہا۔ "کہ تم کسی خواب سے ڈر گئی ہو۔ اور اگر تم نے اپنی لائی ہوئی اس تصویر کو بیٹ زیادہ پسند کیا تھا تو یقیناً یہی تمہارے ذہن میں گردش کرتی رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمہارے خواب میں بھی شامل ہو گئی۔"

"لیکن مما.....! ابھی ابھی تو میں نے وہ سب دیکھا تھا....." دانیہ نے پریشانی کے عالم میں صفائی پیش کرنی

چاہی۔

"ہاں....." انہوں نے سر ہلایا: "لیکن وہ حقیقت ہوتا تو اب بھی ہو رہا ہوتا..... تم زیادہ پریشان مت ہو، اور آرام سے سو جاؤ..... صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی..... او کے.....!"

"جی ممی.....!" اس نے سر ہلا کر آہستہ سے کہا۔

"کوئی مسئلہ.....؟"

"نو ممی.....؟"

"گڈ..... اب گڈ نائٹ.....!" ثوبیہ نے کہا اور اسے خود اعتمادی سے پرسکون انداز میں سو جانے کی ہدایت کرتی ہوئیں باہر نکل گئیں۔ ان کے جانے کے بعد دانیہ کو پھر سے ذرا خوف کا احساس ہوا، لیکن تھوڑی دیر بعد وہ نارمل ہو کر اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ اب وہ خود بھی سوچ رہی تھی کہ واقعی شاید اس نے کوئی خواب ہی دیکھا تھا۔

جلد ہی نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح وہ دن چڑھے تک سوتی رہی تھی۔ اسے مما نے ہی اٹھایا تھا۔ اور پھر بولیں:

"تم نے آج اپنے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے دانیہ.....! گیارہ بجنے والے ہیں اور تم ابھی تک سو رہی ہو....."

"جی.....وہ چونک کر اٹھی۔ "گیارہ بج گئے؟"

"ہاں.....ہم لوگ کافی دیر تک ناشتے کی میز پر تمہارا انتظار کرتے رہے۔ پھر تمہارے پاپا کو دیر ہو رہی تھی۔ وہ چلے گئے۔ میں نے آ کر دیکھا تو تم سوئی پڑی تھیں اور میں جب سے تیسری بار تمہیں اٹھانے آئی ہوں۔"

"مجھے حیرت ہو رہی ہے مما.....!" وہ آہستہ سے بولی۔

"رات کو خواب کے چکر میں تمہاری نیند خراب ہوگئی تھی۔ شاید اسی لئے تم سوتی رہیں۔ چلو اب باتھ روم وغیرہ سے فارغ ہو کر آجاؤ، میں تمہیں ناشتہ دے دوں.....!"

اس نے سر ہلایا۔ ایک نظر تصویر پر ڈالی اور پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ جلد ہی وہ ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ وہ ان دنوں ویسے بھی کالج کی چھٹیوں کی وجہ سے فارغ تھی، لیکن اس کی روٹین تھی کہ وہ صبح سویرے ہی اٹھتی تھی۔

ناشتے کے دوران اس نے اپنی مما سے باتیں کیں اور پھر کچن کا کچھ کام ان کے ساتھ نمٹانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے کمرے کی صفائی وغیرہ ہو چکی تھی۔ کچن کے علاوہ ثوبیہ نے گھر کے دیگر کاموں کے لئے ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمرہ چمکا دیا گیا تھا۔

یہ تو حقیقت تھی کہ یہ تصویر اسے بے پناہ پسند آئی تھی۔ اس کیمپ میں اور بھی شاہکار موجود تھے۔ ولید اسے وہ کار ڈیارڈ یا جو کیمپ سے ملا تھا۔ اس نے وہ کارڈ نکالا اور اپنے موبائل پر سپرڈائل کرنے لگی، جو کارڈ پر درج تھے۔ بیل جا رہی تھی، پھر ایک بھاری سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جی کون.....؟"

"میں ساحر بات کر رہا ہوں۔"

"میرا نام دانیہ ہے! میں نے کل تصویری نمائش میں آپ کی....."

"او..... ہاں....." دوسری طرف سے کہا گیا۔ "مجھے معلوم ہے، جی فرمائیں....."

"میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنی تصویر میں اس قدر قسمتی رنگ بھرے ہیں کہ میں ان میں ڈوب کر رہ گئی، اور پھر رات کو اس تصویر کے خواب نے میری نیند خراب کر دی۔"

"او....." دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں کچھ نہیں آپ کی بات.....؟"

دانیہ نے مختصراً رات والی روداد سنا دی۔ دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آئی اور کہا گیا۔

"گویا میری تصویر نے ثابت کر دیا کہ وہ بولتی بھی ہے.....!"

"یہی سمجھ لیں....." دانیہ بولی۔

"ابھی تو آغاز ہے" دوسری طرف سے کہا گیا: "جلد ہی وہ آپ سے باتیں بھی کرے گی۔"

"کیا مطلب.....!" دانیہ نے کہا۔ لیکن اسی وقت دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دانیہ نے دوبارہ کال ملائی لیکن نمبر بند ہو چکا تھا۔ "شاید موبائل کی بیٹری ختم ہوگئی۔" اس نے سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا رخ اپنے اس کمرے کی طرف تھا، جہاں وہ تنہائی کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ دانیہ اپنے بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ آج اس نے نائٹ بلب نہیں جلایا تھا۔ اس لئے کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ لیکن پھر یہ سکوت قائم نہ رہ سکا۔

سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر میں اچانک ہی حرکت پیدا ہوئی، جیسے تیز ہوا چلی ہو۔ اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا ہو۔ اور پھر اس میں موجود زنجیروں سے جکڑی ہوئی عورت کے وجود کا خاکہ بڑھتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا حجم اتنا بڑھا کہ وہ تصویر میں مقید نہ رہ سکا۔ چند لمحوں بعد ہی ایک جیتی جاگتی ہوئی عورت کمرے میں موجود تھی، جس کے جسم کے گرد زنجیروں کا جال لپٹا ہوا تھا۔ البتہ اس کے ہاتھ اس حد تک آزاد تھے کہ کافی حد تک جنبش کر سکتے تھے۔ اس کا سایہ بھی فرش پر موجود تھا، اس کی تیز سانسیں اب کمرے کی فضا میں گونج رہی تھیں، پھر اس نے اپنا ایک قدم آگے بڑھایا اور زنجیر کی کھنک سی پیدا ہوئی۔ اس نے خود کو وہیں روک لیا۔ ویسے اس کے چہرے پر بے حد تکلیف کے آثار موجود تھے، اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں شدید رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی سزا میں یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ اس کی نظر سوئی ہوئی دانیہ پر جمی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس نے اپنے قدم آگے بڑھائے۔

"جھن..... جھن..... جھن.....!"

دانیہ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اسے دانیہ تک پہنچنے میں کافی دیر لگی تھی۔ پھر وہ کافی دیر نہیں تک اسے یک ٹک دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے کوشش کر کے دانیہ کا کندھا اپنی گرفت میں لے لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دانیہ کو بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

دانیہ کے پاپا کا نام سلمان تھا۔ اسی وقت ثوبیہ نے انہیں جھنجھوڑ کر اٹھایا۔

"سلمان..... سنیں.....!"

"ہاں..... ہاں..... کیا ہوا.....؟" وہ بڑبڑائے۔

"میں نے..... میں نے بہت عجیب سا خواب دیکھا ہے....." ثوبیہ کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"ارے بھئی..... کیا مذاق ہے....." انہوں نے منہ بنا کر کہا۔ "رات میں تو تم دانیہ پر ہنس رہی تھیں اور اب اس نائم تمہیں خود بھی کوئی دورہ پڑ گیا ہے..... سو جاؤ ....."

"ارے بھئی .....!" ثوبیہ نے انہیں پھر ہلایا۔ "دانیہ کے کمرے میں چلیں۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، ورنہ میں آپ کو نہ اٹھاتی.....!"

"اچھا بھئی..... چلو.....!" سلمان نے بھنا کر کہا۔ اور پھر انہوں نے بستر چھوڑ دیا۔ جلد ہی دونوں دانیہ کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ثوبیہ نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھیں..... اس کے کمرے کی لائٹ بھی جل رہی ہے....."

"تو پھر..... کیا یہ کوئی انہونی بات ہے.....؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

ثوبیہ نے کوئی جواب دیئے بغیر آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اور پھر وہ دونوں ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ بیڈ پر دانیہ موجود تھی۔ لیکن وہ سو نہیں رہی تھی۔ بلکہ آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن ایک ہی جگہ مرکوز تھیں۔

دونوں فوراً ہی اس کی طرف جھپٹے:

"دانیہ..... بیٹا دانیہ.....!"

"لیکن دانیہ تو مجسم صم، خاموش تھی..... اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔

"یہ..... یہ کیا چکر ہے.....؟" سلمان کی آواز سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ "کیا ہو گیا اسے..... ہماری بچی کو.....!!"

"یہ سب....." ثوبیہ نے غصے میں آکر تصویر کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "اس منحوس کا کیا دھرا ہے..... یہ تصویر کل سے اس گھر میں آئی ہے اور..... اف..... اس کے لئے کچھ کرو سلمان.....!"

"پانی لاؤ.....!" سلمان نے کہا۔ ثوبیہ نے فوراً ہی پانی کا گلاس اٹھایا اور پھر دانیہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ لیکن وہ اب بھی اسی کنڈیشن میں تھی۔ اب تو ان لوگوں کا حال ہی برا ہو گیا۔

"اب..... کیا کرنا ہے سلمان.....!"

"اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں..... تم تیاری کرو۔ میں گاڑی نکالتا ہوں....."

ثوبیہ نے بدحواسی کے عالم میں دانیہ کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے میں کافی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ذہن میں سوائے دانیہ کے اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے جو خواب دیکھا تھا وہ بھی بہت بھیانک تھا اور اب دانیہ..... اس حال میں ملی تھی.....!

سلمان بھی اپنی گاڑی ریڈی کر کے واپس آ چکے تھے۔ چنانچہ دونوں ایک بار پھر دانیہ کے کمرے میں پہنچے۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ دانیہ..... اب بیڈ پر موجود نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

"کک..... کک..... کہاں گئی دانیہ.....!" ثوبیہ نے بوکھلاتے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے..... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" سلمان کا لہجہ بے حد الجھا ہوا تھا۔

"یہ اس کی منحوسیت ہے سب.....!" یہ سب کہہ کر ثوبیہ نے آگے بڑھ کر تصویر اتاری، اور پھر اسے فرش پر پھینک کر توڑنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دانیہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے مما..... یہ کیا کر رہی ہیں؟"

انہوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ دایاں ہاتھ روم سے نکل رہی تھی اور حیرت سے ان دونوں کی طرف متوجہ تھی۔ خود ان دونوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا ہے مما آپ کو.....؟" دانیہ پھر بولی۔

"آپ یہ تصویر کیوں پھینک رہی ہیں.....؟"

"دانیہ..... یہی سارے فساد کی جڑ ہے..... اسی لئے میں اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہوں۔"

"کونسا فساد مما.....!" سب نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟ میں ٹھیک تو ہوں..... یہ تصویر مجھے دیں اور سو جائیں کمرے میں جا کر۔"

یہ کہہ کر اس نے تصویر ان کے ہاتھ سے لے کر دوبارہ دیوار پر لگا دی۔

"میں تو باتھ روم میں تھی۔! آپ دونوں یہاں اس وقت کیوں آئے ہیں.....؟"

"میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا دانیہ..... میں نے فوراً ہی سلمان کو اٹھایا اور پھر جب ہم دونوں تمہارے کمرے میں آئے تو.....!"

"خواب.....! دانیہ زور سے ہنسی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے کل والے خواب کا آج آپ نے اثر لے لیا، جائیں آپ اطمینان سے سو جائیں..... سب ٹھیک ہے!"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر تذبذب کا شکار ہونے کے بعد وہ کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔ اور دایا دوبارہ اسی حالت میں آ گئی۔ وہ اپنے بیڈ پر ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس طرح کہ اس کی پلکیں بھی ساکت تھیں۔ ایک سایہ عقب سے اس کے اوپر چھایا ہوا تھا۔ ایک بار

پھر تیز سانسوں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن صبح ایک بار پھر ناشتے کی میز پر دانیہ موجود نہیں تھی۔

"آؤ..... آج میں بھی اسے اٹھاتا ہوں....." سلمان نے کہا۔

"چھوڑیں رہنے دیں، آپ آفس جائیں۔" ثوبیہ نے کہا۔ "میں کچھ دیر انتظار کرتی ہوں۔ پھر میں اسے خود ہی جگا دوں گی۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے....." سلمان نے سر ہلایا۔ "ویسے تو سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا، لیکن اگر کوئی پرابلم ہو تو مجھے فوراً ہی کال کرنا، میں آ جاؤں گا....."

"ہاں..... رات کے واقعے نے میرے ذہن کو کافی پریشان کیا ہے۔" ثوبیہ نے کہا۔ "لیکن آپ فکر نہ کریں، میں اپنے آپ کو سنبھال لوں گی، بس دانیہ کی ٹینشن ہے مجھے....."

"اور میرا یہ خیال ہے کہ تم دونوں کو کوئی لاشعوری مسئلہ درپیش ہے۔" سلمان نے کہا۔ "اور اس کا تعلق ہو سکتا ہے کہ اس تصویر سے ہو، لیکن نفسیاتی نکتہ نظر سے....."

"آپ کا کہنے کا مقصد ہے کہ ہمیں اب کسی نفسیاتی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے.....؟" ثوبیہ نے سلمان کو گھورا۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ سلمان ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے آج سے پہلے کبھی زندگی میں اپنی بیوی کو اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں..... مقصد تو یہی ہے میرا....." سلمان نے بول ہی دیا۔

"تو پھر آپ ایسا کریں کہ سب سے پہلے اپنا علاج کروائیں۔" ثوبیہ جیسے پھٹ پڑی۔ پھر اپنی بیٹی کا اور پھر اپنے خاندان کے دوسرے افراد کا..... ہاں....."

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ثوبیہ....." وہ حیران رہ گئے۔

"کیا تم ہوش میں ہو.....؟"

"مما..... ٹھیک کہہ رہی ہیں....." دفعتاً دروازے سے دانیہ کی آواز آئی۔ سلمان فوراً ہی چونک کر گھومے وہ سامنے کھڑی ہوئی تھی اور خون خوار نظروں سے ان ہی کو گھور رہی تھی۔

"تم..... دانیہ تم بھی.....!"

"ہاں پاپا.....! اب آپ کو ہم دونوں پاگل نظر آنے لگے ہیں۔" دانیہ کی آواز روہانسی ہو گئی۔ "ہمیں آپ کسی پاگل خانے میں جمع کروا دیں..... مہربانی ہو گی آپ کی.....!"

"ارے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو....." سلمان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ "کیا تم لوگ اپنے ہوش میں نہیں ہو؟"

"اف..... سلمان.....! آپ نے تو ہمیں سچ مچ پاگل ہی مان لیا ہے۔" ثوبیہ نے کہا۔ "آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔"

"چھوڑیں مما..... آئیں....." دانیہ غصے میں سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے ثوبیہ سے بولی۔ "ہم ٹی وی لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ سلمان اب تنہا یہاں بیٹھ کر کیا کرتے۔ جھلا کر وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھے اور اپنا بیگ اٹھا کر آفس کے لئے روانہ ہو گئے، آفس میں بھی ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب حال تھا۔ انہیں دونوں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور بار بار یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔

آفس میں ہی فیصل نامی ان کا کولیگ تھا، جو کہ ان کا بہترین دوست بھی تھا۔ اس نے ان کی حرکات و سکنات اور چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی پریشانی کا شکار ہیں۔ چنانچہ وہ موقع دیکھ کر فوراً ہی ان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے سلمان..... تم کافی پریشان دکھائی دے رہے ہو....."

"نہیں یار....." انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے..... بس یونہی.....!" انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ارے یار تم اپنی پریشانی مجھ سے بھی چھپاؤ گے....." اس نے ہنس کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بس یار..... کیا بتاؤں.....؟"

"جو بات ہے وہی بتاؤ۔" اس نے کہا۔ "تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوگا اور..... ہوسکتا ہے کہ میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں۔"

"ہوں....." انہوں نے سر ہلایا۔ "چلو پھر..... باہر چل کر چائے پیتے ہیں۔"

وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ دونوں آفس سے نکلے اور روڈ کراس کر کے ریسٹورنٹ میں آبیٹھے۔

"ہاں..... اب بولو..... کیا مسئلہ ہے.....؟"

سلمان کچھ دیر تک سوچتے رہے، وہ مناسب الفاظ منتخب کررہے تھے، پھر انہوں نے کسی نہ کسی طرح فیصل کو اس معاملے سے آگاہ کر ہی دیا۔ وہ سنجیدگی سے سن رہا تھا۔ درمیان میں کئی مرتبہ اس نے انہیں ٹوکا بھی۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

"ہوں..... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سب معاملات کا اس تصویر سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے....."

"ہاں..... یار..... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں.....!"

"سب سے پہلے تو تم اس تصویر کو گھر سے نکالو، اور پھر اس کے بعد صورت حال کا اندازہ کرو۔"

"لیکن اگر..... اس تصویر کے لئے دانیہ نے ہنگامہ کیا تو.....؟"

"تم رات میں یہ کام کرو....." فیصل نے بتایا۔ "اور کوشش کرو کہ دانیہ اس کمرے میں نہ رکے، خود اپنی بیگم کو بھی اس کمرے سے دور ہی رکھو.....!"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔"

"اور رات کے وقت تم جس وقت بھی تصویر نکال لو، مجھے ضرور فون کردینا....."

"کیوں.....؟ تم کیا کرو گے.....؟"

"میں اس تصویر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اور اس کا معائنہ کروں گا۔" فیصل نے بتایا۔

"میں سمجھا نہیں....."

"سمجھا دوں گا، تم تصویر نکالو..... پھر میں تمہیں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر فیصل کسی سوچ میں گم ہوگیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن سلمان سرِشام ہی گھر پر لوٹ آئے تھے اور انہوں نے ایسا فیصل ہی کی ہدایت پر کیا تھا۔ ویسے تو ان کا دل قطعی گھر پر آنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے فیصل کی بات مان کر مجبوراً گھر کا رخ کیا تھا۔ یہاں ان کی سوچ کے مطابق ہی ماحول قائم تھا۔ ثوبیہ کا الگ موڈ خراب تھا اور دانیہ بھی منہ پھلائے ہوئے بیٹھی تھی۔

انہیں کافی خشک انداز میں خوش آمدید کہا گیا۔ اور پھر ثوبیہ نے ان سے کھانے کا پوچھا۔

"نہیں، کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں۔ اگر چائے بنادو تو.....!"

"بنادیں گے جناب....." ثوبیہ کا انداز طنزیہ تھا۔ "آخر کو غلام ٹھہرے آپ کے....."

سلمان ضبط کر گئے، ورنہ ان کے دل میں تو بہت کچھ آیا تھا۔ فیصل نے انہیں یہی ہدایت کی تھی کہ کسی صورت بھی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بھابھی اور ثوبیہ کسی نہ کسی بہانے سے لڑنے پر آمادہ ہوجائیں۔ لیکن کوشش کر کے خود کو باز رکھنا ہے۔ اور ان دونوں کی باتیں نظر انداز کرنی ہیں۔

بہرحال انہوں نے رات کا وقت کافی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گزارا تھا۔ پھر کھانا کھانے کے بعد انہوں نے دانیہ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی اور کمرے میں سو جائے۔ لیکن وہ فوراً بولی:

"جی نہیں..... اون کا سکون تو برباد ہو ہی چکا ہے۔ اب کیا آپ رات کا آرام بھی چھین لینا چاہتے ہیں.....؟ میں اپنے کمرے میں ہی سوؤں گی..... ہاں.....!"

"ٹھیک ہے..... سو جاؤ..... کوئی بات نہیں۔"

انہوں نے جلدی سے جواب دیا اور دانیہ خاموش ہوگئی۔

پھر اپنے کمرے میں ثوبیہ بھی سو چکی تھی لیکن سلمان جاگتے رہے تھے۔ بارہ بجے کے قریب انہوں نے فیصل کو کال کی، اس نے فوراً ہی رابطہ کیا:

"کیا ہوا سلمان..... ! تصویر نکالی.....؟"

"نہیں....." انہوں نے بتایا۔ "اب جارہا ہوں اس کمرے میں....."

"ہوں..... ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں 10 منٹ میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔"

"اوکے....." سلمان نے جواب دیا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اب انہوں نے ایک نظر ثوبیہ پر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اٹھے اور احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ اب وہ دانیہ کے کمرے کی طرف جارہے تھے۔

یہ اخلاقی طور پر اچھی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ اس وقت مجبور تھے۔ انہیں اس گھر کے سکون اور خوشیوں کی خاطر یہ قدم اٹھانا ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئے۔ آج بھی دانیہ نے کمرے میں روشنی کی ہوئی تھی اور وہ بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ دانیہ جاگ تو نہیں رہی۔ عین اس وقت ان کی نظر ایک کارڈ پر پڑی جو سرہانے پر ہی رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر وہ کارڈ اٹھایا۔ اس پر نظر ڈالی، یہ کسی ایم وائی ساحر کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر اسے جیب میں ڈال لیا اور پھر وہ تصویر کی طرف بڑھے تصویر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد انہوں نے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ سے اسے دیوار سے اتار لیا۔ اب وہ اسے ہاتھ میں لے کر دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولا، ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"پاپا.....!"

وہ اچھل پڑے، اور پھر انہوں نے دانیہ کی طرف پلٹ کر دیکھا، لیکن وہ تو بدستور اپنے بیڈ پر بے خبر ہی سو رہی تھی، ان کی آنکھوں میں حیرت کے دیئے جل اٹھے، فوراً ہی ان کی نگاہیں کمرے میں گردش کرنے لگیں، لیکن وہاں تو کوئی اور موجود ہی نہیں تھا۔ انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور باہر کی طرف لپکے۔ عین اس وقت انہیں ہارن کی آواز سنائی دی۔ فیصل آچکا تھا۔ انہوں نے صدر دروازہ کھولا سامنے فیصل اپنی بائیک پر موجود تھا۔

"اندر آجاؤ فیصل.....!"

"نہیں..... بس یہ تصویر مجھے دے دو....." اس نے ہاتھ آگے بڑھایا: "میں ابھی جارہا ہوں۔ کل آفس میں ملاقات ہوگی..... خدا حافظ.....!"

سلمان نے گم صم سے انداز میں سر ہلا دیا اور تصویر اس کے حوالے کردی۔ فیصل نے بائیک اسٹارٹ کی اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن کی صبح کچھ نئی نئی سی تھی۔ ثوبیہ نے بڑے پیار سے سلمان کو اٹھایا تھا۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ثوبیہ کو دیکھا اور بولے۔

"کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں.....؟"

"میں نے آپ کو جگایا ہے۔ سلایا نہیں ہے۔" ثوبیہ اپنے مخصوص انداز میں بولی تو سلمان کے جسم میں توانائی دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس منحوس تصویر کا اثر ختم ہوچکا تھا۔ نہ جانے وہ کیا آفت تھی۔ کون سی مصیبت تھی۔ بہرحال اب یقیناً اس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ انہوں نے ہاتھ روم کا رخ کیا۔ تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر پہنچے تو دانیہ بھی وہاں موجود تھی اور اس کے چہرے پر زندگی کی تازگی نظر آرہی تھی۔ وہی تازگی جو اس کے معمول کا خاصا تھی۔

سلمان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ انہوں نے کسی قسم کا کوئی تذکرہ نہیں چھیڑا۔ بس ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ آفس کے لئے تیار ہوگئے۔

آفس پہنچ کر انہوں نے فیصل کو تلاش کیا، لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا انتظار کیا۔ ابھی اسے کال کرنا مناسب نہیں تھا۔ فیصل جب آفس آیا تو تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ رات کافی دیر تک جاگتا رہا تھا۔

"بس ذرا اپنا کام نمٹالوں۔ لنچ میرے ساتھ ہی کرنا۔" فیصل نے انہیں بتایا اور اپنے روم میں چلا گیا۔ سلمان کے دل میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن بہرحال انتظار تو کرنا تھا۔

خدا خدا کر کے 2 بجے اور پھر دونوں نے ریسٹورنٹ کا رخ کیا، آرام سے بیٹھنے کے بعد فیصل نے پوچھا۔

"اب..... ان دونوں کا کیا حال ہے.....؟"

"یار بہت حیرت انگیز....." سلمان بولے: "بالکل نہیں لگ رہا کہ گزشتہ 2 دن سے ان کا جو حال تھا، آج صبح اس کی جھلک ان میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"ہوں....." فیصل کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"یار یہ چکر کیا ہے..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"ایک تم ہی کیا.....!" فیصل کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ "نہ جانے دنیا میں کتنے لوگ یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کے گھروں میں لڑائی جھگڑے اور دنگے فساد کیوں ہوتے ہیں، گھروں کا سکون، اطمینان اور رونقیں برکتیں کہاں چلی گئی ہیں..... یہ سمجھنا حالانکہ بہت آسان ہے لیکن لوگ چونکہ سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس لئے یہ ایک عقدۂ مبہم ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سلمان کا الجھا الجھا ہوا تھا۔

"تم نے جو تصویر دی تھی۔ اس کے رنگوں میں الو اور سور کے خون کی آمیزش تھی۔" فیصل نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب.....؟" سلمان نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔

"وہ شیطانی چرخہ تھا۔" فیصل نے جواب دیا۔

"میرے خاندان میں بھی ایک دفعہ اس قسم کا کیس ہوا تھا۔ اس لئے اتفاق سے مجھے تم نے بتایا تو فوراً ہی میں نے ذہن دوڑایا اور معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ میں تم سے تصویر لے کر سیدھا خیر دین بابا کے پاس گیا تھا۔"

"یہ کون ہیں.....؟"

"ایک برگزیدہ ہستی ہیں، اور ان کی زندگی خیر و شر کی کشمکش میں ہی گزر گئی ہے۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا ہے کہ اس تصویر کی تخلیق میں حرام جانوروں کا خون شامل ہے۔"

"لیکن یہ سب چکر کیا ہے.....! ایسا کس نے کیا اور اس کا مقصد کیا ہے؟"

"شیطان کا کیا مقصد ہے؟" فیصل نے الٹا سوال کیا۔ "وہ رات دن اسی مصروفیت میں سر بسر پکارہے کہ انسانوں میں شر اور فساد پھیلائے تاکہ ان کا سکون تباہ و برباد ہو اور یوں بھی ہم لوگ اللہ کے ذکر سے اور عبادت سے دور ہیں۔ برا مت ماننا، ایک بات پوچھوں.....؟"

"ہاں..... بولو.....!"

"کیا تم، بھابھی یا دانیہ میں سے کوئی نماز کی پابندی کرتا ہے؟"

"نن..... نہیں.....؟"

"کیا قرآن پاک کھلتا ہے تمہارے گھر میں.....؟"

"نہیں.....!"

"تو پھر خود ہی بتاؤ.....!"

فیصل نے پہلو بدلا۔ "وہ تصویر اپنا رنگ نہیں جمائے گی.....؟ کیا اس کا اثر تمہارے گھر میں نہیں ہوگا؟ اگر تمہارے گھر میں نماز، اور قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام ہوتا تو اس تصویر کی کیا مجال تھی کہ وہ تم کو شیطانی جال میں پھانس لیتی.....!"

"اوہ..... یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سلمان نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ پھر وہ چونک کر بولے۔ "مجھے دانیہ کے کمرے سے ایک کارڈ ملا ہے....."

"کیسا کارڈ.....؟" فیصل نے پوچھا۔

یہ سن کر سلمان نے وہ کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ فیصل نے بلند آواز سے پڑھا۔

"ایم وائی ساحر..... ماہر نفسیات و روحانیات۔"

یہ پڑھ کر وہ عجیب سے انداز میں ہنسا، پھر سلمان سے مخاطب ہوا:

"یہی وہ شیطان کا چیلا ہے جو اس تصویر کا موجد ہے۔"

"کیا.....!!"

"ہاں..... اور یہ شخص اس طرح لوگوں سے رابطے کرتا ہے اور انہیں نفسیاتی کیسوں میں الجھا کر ان سے رقمیں بھی اینٹھتا ہے اور ان کے ذہن بھی تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں میں شیطانی وسوسے پھونکے اور انہیں اس کے جال میں الجھا کر رکھے....."

"اوہ..... تو کیا قانون اسے گرفتار نہیں کرتا.....؟"

"قانون.....!" فیصل ہنسا..... اگر کوئی شخص کالے جادو کے اثر میں آکر موت کی گود میں سو جاتا ہے تو کیا اس پر یہ عمل کرنے والے کو پھانسی کی سزا ملتی ہے؟"

"میرے خیال میں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" سلمان نے سر ہلایا۔

"بس..... تو پھر اس پروفیسر ساحر کا بھی یہی حل ہے کہ اس سے بچا جائے، اور یہ دعا کی جائے کہ اللہ ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے..... میں جانتا ہوں کہ اپنے موکلوں کے ذریعے تمہارے گھر میں شیطان کا سایہ ڈالنے والا یہی شخص ہے، لیکن ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اول تو کسی قسم کا کوئی جرم ہے اور نہ اس جرم کے خلاف کوئی ثبوت..... تو بس اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو فوری طور پر اس مصیبت سے نجات دلوادی۔ ورنہ اگر تم اس جال میں پھنس جاتے تو برباد ہو جاتے اور ہو سکتا ہے کہ دانیہ ہی کے ذریعے تم اس شیطان کے پاس پہنچتے اور وہ تم سے بڑی رقمیں بھی بٹورتا اور شاید تم کو گمراہ بھی کرتا..... اب تم اپنی آنکھیں کھول لو، اور اپنے گھر میں اسلامی ماحول کی بنیاد ڈالو، تاکہ ایسے شیطان اور گمراہ لوگوں سے محفوظ رہ سکو.....!

"میں نے سوچ لیا ہے اور تہیہ کر لیا ہے کہ اب روزانہ صبح قرآن پاک کی تلاوت پابندی سے کروں گا....." سلمان نے کہا

"گڈ..... اور نماز کی بھی پابند کرو.....!"

"بالکل..... اب مجھے ایک بات اور بتاؤ.....؟"

"ہاں..... پوچھو.....!"

"کیا میں اس ساحر سے ملاقات کر سکتا ہوں.....؟"

"کیا فائدہ.....؟" فیصل نے کندھے اچکائے۔ "یہ بہ ظاہر ایک عام سا بندہ ہے اور ماہر روحانیت ہے، تم اس سے مل کر کیا کرو گے..... اس کا یہی کام ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح تم سے لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرو اور جن لوگوں کا ایمان کمزور ہے وہ ان پر غالب ہو جاتا ہے..... تم اپنے آپ کو اپنے ضمیر کو مضبوط کرو..... اور رب العزت کا حکم مانو..... جب ہم اس کائنات کے بنانے والے کو یاد نہیں کرتے اور دل و دماغ میں اس کے ناموں کا ورد نہیں کرتے تو ہمارے دل و دماغ ویران ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ویرانوں میں کس کا بسیرا ہوتا ہے.....؟"

یہ سن کر سلمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ واقعی انسان یہ بھولتا جا رہا ہے کہ اس کی پیدائش کا اصل مقصد کیا ہے اور زندگی کس طرح گزارنی چاہئے.....

اگر انسان نیک مضبوط ایمان والا اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے تو کوئی بھی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا..... اور پھر شیطان بھی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے..... تو پھر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں بھٹک رہے ہیں.....!!

شکاری

عطیہ زاہرہ۔لاہور

کس نے کس کو بیوقوف بنایا، کس نے کس کو لالچ کے شکنجے میں جکڑلیا، کون اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا، کسی کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچا، کون کامیاب ہوا یا ناکام یہ تو کہانی پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

سبک رفتاری سے دل و دماغ کو اچنبھے میں ڈالتی پُرتحیر ان و پریشان کرتی عجیب کہانی

ضرورت مند مسافروں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ انہیں ہوٹل کے کس کمرے میں جگہ ملے گی، لیکن پارک اپنے ہوٹل میں آنے والوں کو عام طور پر کمرہ نمبر 9 دیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی ماریہ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس لئے دونوں میں ہمیشہ جنگ ہوا کرتی تھی۔ پارک رقم بٹورنے کا فن خوب جانتا تھا۔ اسے دولت جمع کرنے سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ خرچ کرنا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ اپنے ہوٹل کا مالک، منیجر، کلرک، بیرا غرضیکہ سبھی کچھ تھا۔

اس کی بیوی ماریہ دن بھر مسافروں کے لئے کھانے پکاتی اور خود پارک کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا گاہکوں کا انتظار کرتا رہتا، اس کا چھوٹا سا ہوٹل شہر کی ایک ایسی سڑک پر تھا، جہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید ہی کوئی خوش قسمت دن ہوتا ہوگا، جب اس کے ہوٹل کے سارے کمرے بھرے رہتے ہوں، لیکن وہ مہینے بھر کی پوری کسر ایک ہی دن میں نکال لیتا، اول تو کمرے کا کرایہ بہت زیادہ طلب کیا کرتا، پھر کھانے کے اخراجات دوسرے ہوٹلوں سے دوگنے ہوتے، اس کے علاوہ آنے والوں کو کمرہ نمبر 9 دیا کرتا۔

کمرہ نمبر نو میں رات گزارنے والا جوڑا دوسری صبح اپنی جیب کی ساری رقم پارک کے حوالے کر جاتا۔

پارک نے کمرہ نمبر 9 میں ایک خفیہ مائیک لگا رکھا تھا۔ جس کا سلسلہ نمبر دس کی ایک میز پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر سے ملا ہوا تھا، کمرہ نمبر 9 میں جو بھی گفتگو کی جاتی وہ اس ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ ہو جاتی۔ بعض اوقات ایسی باتیں بھی ٹیپ ہو جاتی ہیں جو پارک کے لئے بہت مفید ثابت ہو جاتی تھیں۔

وہ دوسری صبح کمرہ نمبر 9 کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس جوڑے کو ٹیپ کی ہوئی گفتگو سنا کر اس سے ساری رقم بٹور لیا کرتا، اس طریقے سے رقم بٹورنے کو وہ "مہذب بلیک میلنگ" کہا کرتا تھا۔ اس مہذب بلیک میلنگ کے ذریعے اس نے پچھلے سال اچھی خاصی رقم پیدا کر لی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے کاؤنٹر پر بیٹھا مسافروں کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے اور ماریہ حسب معمول باورچی خانے میں مصروف تھی، اچانک وائٹ رنگ کی ایک بڑی سی کار دروازے کے سامنے آ کر رکی اور نوجوان مرد اور ایک خوب صورت سی عورت کار سے اتر کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگے۔ ان دونوں کو دیکھ کر پارک کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دولت چلتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی۔

لڑکی کاؤنٹر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی، اس کا ساتھی پارک کے پاس آ گیا۔ "کیا چاہئے جناب؟" پارک نے حد درجہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک کمرے کی ضرورت ہے جس میں، میں اور میری بیوی گلوریا رہ سکیں۔" مرد نے عورت کی طرف اشارہ کیا۔ پارک دل ہی دل میں مسکرایا اور وہ جانتا تھا کہ ایسے موقعوں پر مرد اپنے ساتھ آنے والی لڑکیوں کو اپنی بیوی ہی ظاہر کرتے ہیں۔

"ضرور جناب۔" پارک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ہوٹل میں آپ جیسے شریف آدمیوں کے لئے ایک بہت ہی آرام دہ کمرہ موجود ہے، آپ یقیناً اسے پسند کریں گے۔"

"ٹھیک ہے کرایہ کتنا ہوگا؟"

"کل چالیس ڈالر جناب، جو اس کمرے کے لئے نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"چالیس ڈالر تو بہت زیادہ ہیں۔" مرد نے اعتراض کیا۔

"اس کمرے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے، آپ دونوں کو گھر جیسا آرام ملے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مرد نے اپنی جیب سے بٹوہ نکال کر نوٹوں کو گننا شروع کر دیا، عورت اس دوران بالکل خاموش کھڑی رہی، پارک نے رجسٹر اور ایک قلم..... کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"اس پر اپنا نام اور پتہ لکھ دیں جناب۔"

مرد نے اپنا نام اور پتہ رجسٹر پر لکھ دیا۔ اس کا نام الیگزینڈر رسیڈر تھا۔ اور اس کے ساتھ آنے والی عورت گلوریا تھی اور اس کا پتہ الھارہ لائم اسٹریٹ تھا۔ پارک نے الیگزینڈر کی طرف کمرے کی چابی بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پہلی منزل پر دائیں طرف کمرہ نمبر 9 ہے، جناب آپ اس کمرے کو پسند کریں گے۔"

الیگزینڈر نے پارک کے ہاتھ سے چابی لی۔ اور سیڑھیوں کی طرف چل پڑا، گلوریا بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

پارک نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہوئی گلوریا کو دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ وہ بے حد دلکش تھی۔ اس نے جب اپنی بیوی ماریہ سے اس کا مقابلہ کیا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ماریہ سے شادی کر کے گھاٹے کا سودا کیا ہو۔ وہ ماریہ کو شروع سے ناپسند کرتا تھا۔ لیکن گلے میں پڑے ہوئے ڈھول کی طرح اسے برداشت کرنے پر بھی مجبور تھا۔ ماریہ کو اس بات کا علم تھا کہ اس کا

شوہر کس طرح لوگوں سے رقم حاصل کرتا ہے، وہ کسی دن اس کے لئے خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی، وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر باورچی خانہ میں آ گیا۔ جہاں ماریہ حسب معمول پنیر کے کیک بنانے میں مصروف تھی۔

اب سے پندرہ سال پہلے جب اس کی ملاقات ماریہ سے ہوئی تھی، تو ماریہ نے اسے پنیر کے کیک کھلائے تھے، اور بدقسمتی سے پارک نے اس کیک کی تعریف کردی تھی۔ بس اس دن کے بعد سے پنیر کے کیک بھوت کی طرح اس کی جان سے چمٹ گئے تھے۔ اسے ہر رات یہ بدذائقہ زہر مار کرنے پڑتے تھے۔ ماریہ اس کی آہٹ سن کر اس کی طرف مڑی اور دھیرے سے بولی۔ ”کیا بات ہے؟“ کاؤنٹر سے کیوں چلے آئے؟“

”بھوک لگ رہی ہے۔“ پارک نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”لعنت ہو اس عورت پر، پارک نے دل ہی دل میں ماریہ کو برا بھلا کہا، اور باورچی خانے میں رکھے ایک اسٹول پر بیٹھ گیا، اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ماریہ کو بہت پہلے ہی قتل کر چکا ہوتا، قتل کرنے کے لئے اس کے پاس ان دنوں ایک پستول بھی آ گیا تھا۔ جو اس نے باقاعدہ لائسنس بنوا کر خریدا تھا کیونکہ ہوٹل لوٹنے کے واقعات میں اضافے کے پیش نظر اس نے پستول لے لیا تھا۔ وہ اس پستول کو بروقت اپنے کمرے کی میز کی ایک دراز میں رکھا کرتا، لیکن آج تک اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ماریہ کو قتل نہ کرسکنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک بزدل آدمی تھا، ناجائز ذریعوں سے رقم حاصل کرنے کی ترکیبوں میں اسے سب سے زیادہ بلیک میلنگ ہی نظر آئی تھی، جس میں بلیک میل ہونے والے چیپ چاپ اس کے ہاتھ پر اس کی مطلوبہ رقم رکھ دیا کرتے تھے۔

”کیا بات ہے، کیا سوچ رہے ہو؟“ ماریہ نے چولہے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ پارک نے چونک کر جواب دیا۔

”کوئی آیا ہے کیا؟“

”ہاں ایک نوجوان جوڑا رات گزارنے کے لئے آیا ہے، میں نے انہیں کمرہ نمبر 9 دے دیا ہے۔“ یہ کہہ کر ماریہ خاموش رہی، پارک گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ماریہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے، اور نہ ہی وہ سوچنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے کھانا کھانے کے بعد فوراً ہی اپنے دفتر میں جانا تھا، جو کمرہ نمبر دس میں تھا، جہاں اس ٹیپ ریکارڈر کے علاوہ اس نے اپنی کمائی کے سارے اعداد و شمار بھی جمع کر رکھے تھے، وہ کمرہ اس کو اپنا خفیہ آفس کے نام سے پکارتا تھا۔ بلیک میلنگ کے علاوہ اس کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ ہوٹل میں آنے والوں کی کاروں کے پہیوں کی ہوا نکال دیا کرتے تھے۔ مجبوراً پریشان حال مسافروں کو قریبی پیٹرول پمپ جانا پڑتا، جس سے پارک نے اپنا کمیشن طے کر رکھا تھا۔ اس طرح بھی اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔

بہت ہی دولت مند معلوم ہوتے ہیں۔ پارک نے کچھ دیر بعد ماریہ کو مخاطب کیا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“ ماریہ بولی۔

”ان کی کار بالکل نئی ہے۔“ اور ان کے لباس بھی بہت شاندار ہیں۔“ پارک نے کہا۔

”پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ ماریہ نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

”تم ان چکروں میں مت پڑو۔“ پارک مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنا کیک تیار کرو۔“

”تو تم یوں کہہ رہے ہو، جیسے اب تمہیں کیک پسند نہیں آتے۔“

”کیک سے زیادہ تمہیں جو پسند ہو۔“ پارک نے دھیرے سے سرگوشی کی۔ لیکن پارک کے اس جملے کا بھی ماریہ پر کوئی اثر نہیں ہوا اس نے پھر اپنے سوال کو دہرایا۔

”تمہارا ارادہ کیا ہے؟ تم نے انہیں اس کمرے میں کیوں ٹھہرایا ہے؟ کیا میں پولیس کو تمہاری اس حرکت کی خبر کردوں۔“ ماریہ کی بات سن کر پارک ایک لمحے کے لئے بوکھلا گیا۔

پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔ ”تم کبھی بھی ایسا نہیں کرسکتی۔ میرے جرم میں تم بھی برابر کی شریک ہو، اس کے علاوہ میرے بغیر تم اس ہوٹل کو چلا بھی نہیں سکتی، لیکن میرا خیال ہے تم ایسا کبھی نہیں کرو گی؟ تم میری بیوی ہو، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

ماریہ اس پر توجہ دیئے بغیر چولہے کی طرف متوجہ رہی، اس لمحے باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اور پارک ہال میں واپس آ گیا جہاں کچھ اور مسافر آ گئے تھے۔ گیارہ بجے پارک نے ہوٹل کا بیرونی دروازہ بند کیا۔ اپنی دن بھر کی آمدنی کو سیف میں رکھا اور کمرہ نمبر دس کی طرف چل دیا، جہاں اسے کمرہ نمبر 9 کا جائزہ لینا تھا۔ لیکن اس وقت نہ صرف یہ کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا بلکہ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ وہ دروازے کے باہر ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اندر میز کے پاس رکھی کرسی پر ماریہ بیٹھی تھی۔ اس نے میز کی نچلی دراز کھول کر اپنے دونوں پاؤں اس پر رکھے ہوئے تھے اور میز پر پارک کا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ پارک نے کمرے میں داخل ہو کر غصے سے سرگوشی کی۔

”خاموش۔“ ماریہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”تمہارے دونوں شکار سو چکے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“ پارک بولا۔

”ابھی بتاتی ہوں۔“ ماریہ نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ ٹیپ ریکارڈر سے کسی کے زور زور سے خراٹے لینے کی آواز ابھرنے لگی۔ ”یہ خراٹے ابھی ابھی ٹیپ ہوئے ہیں۔“ ماریہ نے بتایا۔

”لعنت ہو کم بختوں پر۔“ پارک نے جل کر کہا۔

”اتنی جلدی سو گئے، اب مجھے کیسے معلوم ہوگا؟ ان دونوں کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں۔“

”فی الحال تو تم ان دونوں کے خراٹوں سے دل بہلاؤ۔“ ماریہ شرارت سے مسکرائی۔

پارک خشک لہجے میں بولا۔ ”کوئی حسین لڑکی اتنے بھیانک خراٹے نہیں لے سکتی۔“

”ہوسکتا ہے۔“ ماریہ نے بے زاری سے کہا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں، تم اب جا کر سو، میں ان کے جاگنے کا انتظار کرتا رہوں گا۔ آخر کبھی تو یہ لوگ کچھ بولیں گے۔“

ماریہ ہنس دی۔ ”دیکھو پارک، میں نے کبھی تمہاری ان حرکتوں کو پسند نہیں کیا ہے۔ مجھے بہت برا لگتا ہے جب تم کسی نوجوان جوڑے سے رقم طلب کرتے ہو، محبت کرنے والوں کو سکون کی تلاش میں ہمارے ہوٹل میں آ کر ایک رات گزار لیتے ہیں، تو تمہارا کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس قسم کی حرکتیں کی جائیں، لیکن اس مرتبہ اگر تم نے ان دونوں کو بلیک میل کیا تو میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔“

”کیا مطلب؟“ پارک نے چونک کر کہا۔

”مطلب یہ کہ دونوں واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں بلیک میل کیا جائے، لو یہ سنو۔“

ماریہ نے ٹیپ ریکارڈر کو پیچھے کی طرف چلایا۔ پھر بٹن دبائی ہوئی بولی۔ ”غور سے سنو، یہ گفتگو ٹیپ ہوئی تھی۔“

پارک اشتیاق کے عالم میں میز پر جھک گیا۔ پہلی آواز مرد کی تھی، جس نے اپنا نام الیگزینڈر بتایا تھا۔ وہ بولا۔ ”تم نے کیا سوچا ہے انکل آئی کے بارے میں؟“

”میں کیا سوچ سکتی ہوں۔“ گلوریا نے جواب دیا۔

”انکل آئی بیمار تو ہیں۔“ لیکن وہ اچانک مر گئے تو پولیس کو فوراً شبہ ہو جائے گا اور پولیس کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں ہی ان کا لاکھوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہوں۔“ الیگزینڈر نے کہا۔

”ہاں اور اس طرح تم خود پھنس جاؤ گے؟“ عورت نے کہا۔

”خیر میں کوئی نہ کوئی ترکیب سوچ ہی لوں گا۔“

الیگزینڈر بولا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ جیسے وہ دونوں کچھ سوچنے لگے ہوں۔

"بس اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔" ماریہ نے ٹیپ ریکارڈر بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑے کام کی بات معلوم ہوگئی۔" پارک کا چہرہ اندرونی جوش اور ہیجان سے تمتمانے لگا۔

"یہ سب میری جدوجہد سے ہوا ہے۔" ماریہ نے فخر سے بتایا۔ "اب بتاؤ کہ یہ لوگ کون ہیں؟"

"مسٹر اینڈ مسز الیگزینڈر" پارک نے جواب دیا۔ "انہوں نے جو پتہ لکھوایا ہے۔ اس کے مطابق یہ لوگ اٹھارہ لائن اسٹریٹ میں رہتے ہیں، اور اب جو صورتحال سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ الیگزینڈر کا کوئی چاچا ہے جس کا نام آئی ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اس کا پورا نام کیوں نہیں لے رہے تھے۔ خیر اس کا پورا نام بھی معلوم ہو ہی جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ کب تک قتل کرتے ہیں، اس کے بعد میں پولیس کو اطلاع کردوں گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" ماریہ جھلا کر بولی۔ "اگر ان لوگوں نے اس قتل کو حادثے کا رنگ دے دیا تو پولیس کو کیا پتا سکو گے؟"

"چلو تم ہی کوئی ترکیب بتادو۔" پارک مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماریہ بھی زیادہ سے زیادہ اس کے جرم میں شریک ہوتی جائے۔

"تم ایسا کرو، کہ ایک دو دنوں کے بعد ٹیپ لے کر ان دونوں کے پاس پہنچ جاؤ اور ان سے کہو کہ اگر تم نے رقم ادا نہیں کی تو اس ٹیپ کو پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔ تم ان سے پانچ ہزار ڈالر کا مطالبہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" پارک نے سر ہلایا۔ "ان سے رقم لینے کے بعد میں ان کے چچا آئی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ وہ یقیناً اس احسان کے بدلے میں کچھ نہ کچھ دے ہی دے گا۔"

"پہلے تم ایک سے تو رقم حاصل کرلو۔" ماریہ جھلا کر بولی۔

"تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم دیکھ لینا میں کیا کیا چلاتا ہوں۔ میں نے اس قسم کا کام پہلے بھی کیا ہے، اب یہ ٹیپ سن کر میری ہمت اور بڑھ گئی ہے۔"

"میں تمہاری بہادری سے واقف ہوں۔" ماریہ نے کہا۔

"کوئی بچہ بھی تمہیں دھمکی دے، تو تم سر پر ہاتھ رکھ کر بھاگ لیتے ہو۔"

"اچھا، اچھا خاموش رہو۔" پارک جھلا کر بولا۔

ماریہ جب بھی اس قسم کی باتیں شروع کرتی، پارک جھلا کر رہ جاتا اور ماریہ کو قتل کرنے کی خواہش اور شدید ہو جاتی تھی۔

دوسری صبح الگزینڈر اور گلوریا دونوں ہوٹل سے چلے گئے، مگر پارک نے انہیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا تھا۔ پھر ایک ہفتے تک کچھ بھی نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ انگلیس والوں نے آکر ہوٹل کے حسابات کی جانچ بین کی تھی، ایسے موقعوں کے لئے پارک ہمیشہ تیار رہا کرتا تھا۔ اس نے دکھانے کے لئے اپنا حساب ہمیشہ صاف ستھرا رکھا تھا۔ انگلیس والے اس کی کارگزاری سے مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔ پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب پارک کو لائم اسٹریٹ جانا تھا لائم اسٹریٹ اس ہوٹل سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ پارک کا ارادہ تھا کہ وہ لائم اسٹریٹ کے کسی ہوٹل میں رات گزار کر دوسری صبح الیگزینڈر سے رابطہ قائم کرلے گا۔ پچھلے برس اس نے ایک پرانی کار خرید لی تھی۔ جو اپنی ظاہری حالت سے بہت شاندار دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ایک شاندار سوٹ پہنا، کار کے ایک خفیہ خانے میں ٹیپ رکھا اور ماریہ کو الوداع کہتے ہوئے اپنی مہم پر چل پڑا۔

راستے بھر پانچ ہزار ڈالر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے رہے، اسے امید تھی کہ اس کی دھمکی سنتے ہی الیگزینڈر مطلوبہ رقم ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ پھر وہ اس رقم سے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ پانچ ہزار ڈالروں کے تصور نے اسے تھکن کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ چھ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد وہ لائم اسٹریٹ پہنچا۔ تو پہلے سے زیادہ تازہ دم اور پرامید دکھائی دے رہا تھا۔ اسے مکان نمبر 18 ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مکان پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ لیکن اس کی شان و شوکت سے اس بات کا بآسانی اندازہ ہوسکتا تھا کہ اس مکان میں رہنے والے بینک میں اپنا بہت بڑا اکاؤنٹ رکھتے ہوں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ الیگزینڈر کے لئے پانچ ہزار ڈالر اسے ادا کردینا کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔ الیگزینڈر خاموشی سے یہ رقم ادا کردے گا۔ اور ٹیپ لے کر یہ سوچتا ہوا چلا جائے گا کہ اس نے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات حاصل کرلی ہے۔ لیکن اس بے چارے کو کیا معلوم، کہ پارک کے پاس ایک دوسرا ٹیپ بھی ہے، جو الیگزینڈر کے چچا آئی کے حوالے کردیا جائے گا۔ اور چچا سے بھی تقریباً اتنا ہی معاوضہ طلب کیا جائے گا جتنا الیگزینڈر سے وصول کیا گیا ہے۔ پارک اپنی زندگی کے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس ٹیپ کی تین کاپیاں بنالی تھیں۔ اور وہ تینوں ٹیپ اس کی کار میں رکھے ہوئے تھے۔

مکان کا اگلی طرح جائزہ لینے کے بعد اس نے ہوٹل میں ایک کمرہ حاصل کیا، اور ڈائریکٹری میں الیگزینڈر کا نمبر دیکھ کر ٹیلی فون ملادیا۔

دوسری طرف سے گلوریا نے فون اٹھایا تھا، گلوریا کی دلکش آواز سن کر پارک کے کانوں میں جیسے شہد گھل گیا ہو۔ وہ اس خوبصورت آواز کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا تھا لیکن یہ وقت اس کی آواز پر دھیان دینے کا نہیں تھا۔ اسے اپنے کاروبار کی باتیں کرنی تھیں۔ "مجھے مسز الیگزینڈر سے بات کرنی ہے۔" پارک نے اپنی آواز کو گھمبیر بناتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ ٹھہریئے، آپ کا نام کیا ہے؟" گلوریا نے پوچھا۔

"وہ خود ہی سمجھ جائے گا، تم صرف اسے یہ بتادو کہ کوئی آدمی اس سے ملنا چاہتا ہے۔

"جناب آپ بڑے پراسرار لہجے میں باتیں کررہے ہیں۔" گلوریا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"میں ہوں بھی بہت پراسرار آدمی۔" پارک نے دانت نکال دیئے۔ اسے اپنے لہجے میں فخر محسوس ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد الیگزینڈر کی آواز آئی۔

"کیا ہے؟ کون بول رہا ہے؟"

"الیگزینڈر میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم میرا نام جاننے کی کوشش نہ کرنا۔"

"کیا مذاق ہے؟" الیگزینڈر جھلا کر بولا۔

"یہ مذاق نہیں زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ تم مجھ سے مل اور نہ زندگی بھر افسوس کرتے رہو گے۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"کچھ بھی سمجھ لو، لیکن تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم مجھ سے مل، میں ہوٹل ایمبیسی میں ٹھہرا ہوا ہوں، میں ڈائننگ ہال میں تمہارا انتظار کروں گا، جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ۔"

"کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، تم بتاتے کیوں

زندگی

زندگی جس میں دھوپ جیسی تپش بھی ہے اور بارش جیسی ٹھنڈک اور خوب صورتی بھی۔ اس کی شاہراہ پر جلتی دھوپ میں چلتے چلتے کبھی خلوص لٹانے والے مل جاتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چھاؤں میں پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی میں جہاں غموں کی دھوپ ہے تو خوشیوں کی چھاؤں بھی ہے۔

زندگی کا سفر دھوپ چھاؤں، نرم گرم، خوشی، دکھ سکھ کے احساسات کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے اور پھر اسی طرح ایک دن یہ سفر ختم ہو جاتا ہے لیکن کسی کو یہ نہیں پتہ ہوتا کہ زندگی کا یہ سفر، کیسے اور کون سے موڑ پر اپنے اختتام کو پہنچے گا؟

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

نہیں ہو کہ تم کون ہو؟ اور تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟ جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں، میں نہیں آؤں گا۔"

"تو پھر سن لو یہ معاملہ تمہارے چچا آئی کا ہے، تم نے اپنی بیوی سے اپنے چچا کے متعلق جو باتیں کی تھیں، وہ تمہیں اچھی طرح یاد ہوں گی، وہی باتیں جن میں تم نے انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میرے پاس تمہاری گفتگو کا ٹیپ موجود ہے۔ تم سیدھی طرح میرے پاس آجاؤ، ورنہ میں ٹیپ پولیس کے یا تمہارے چچا کے حوالے کردوں گا۔"

دوسری طرف سے الیگزینڈر نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ پارک چند لمحوں تک خوف کے عالم میں ساکت بیٹھا رہا، اسے اپنی جرأت پر حیرت بھی ہو رہی تھی، اور خوف بھی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈائننگ ہال میں آبیٹھا اور کافی کا آرڈر دے کر ہوٹل کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا، اسے الیگزینڈر کا انتظار تھا، تقریباً آدھے گھنٹے بعد الیگزینڈر ہال میں داخل ہوا۔ وہ چاروں طرف کسی کی تلاش کرنے کے انداز میں دیکھنے لگا۔

پارک نے اپنا ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ الیگزینڈر نے چونک کر پارک کی طرف دیکھا اور تیزی سے چلتا ہوا اس کی میز کی طرف آگیا۔ "تو یہ تم ہو؟" الیگزینڈر اسے گھورتا ہوا غرایا۔ اس نے پارک کو پہچان لیا تھا۔

"ہاں!" پارک مسکرایا۔ "مجھے دیکھ کر تمہیں یاد آگیا ہوگا کہ تم نے اور تمہاری بیوی نے میرے ہوٹل کے کمرے میں اپنے چچا آئی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ تمہاری ساری باتیں ٹیپ ہو چکی ہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ٹیپ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"خوف!" الیگزینڈر کرسی پر بیٹھا بولا۔

"تو تم نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں خفیہ مائیک لگا رکھے ہیں۔"

"میری باتیں چھوڑو اس ٹیپ کی باتیں کرو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"پانچ ہزار ڈالر، اس کے بعد یہ ٹیپ تمہارے حوالے کردیا جائے گا۔"

"مذاق مت کرو۔" الیگزینڈر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ "اس معمولی ٹیپ کے پانچ ہزار کون دے گا۔"

"تم دو گے۔" پارک نے جواب دیا۔ "یہ سودا بہت سستا ہے۔"

"اگر میں انکار کردوں تو؟"

"تو پھر یہ ٹیپ تمہارے چچا کو یا پولیس کو پہنچا دیا جائے گا۔" الیگزینڈر چند لمحوں تک پارک کو دیکھتا رہا، اور پھر اس طرح ہنس پڑا جیسے پاگل ہو گیا ہو، ہنستے ہنستے اس کے ہونٹوں سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟" پارک جھلا کر بولا۔

"مائی گاڈ۔" الیگزینڈر ہنستے ہنستے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "تو تم یہ ٹیپ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ مزا آگیا۔ اگر میں یہ لطیفہ گلوریا کو سناؤں تو وہ بھی ہنستے ہنستے پاگل ہو جائے گی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا اچھا لطیفہ نہیں سنا، میں اپنی آئندہ کتاب میں اس واقعہ کا تذکرہ ضرور کروں گا۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" پارک کھسیا کر بولا۔

"میرے دوست تم نہیں جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ میں اور میری بیوی دونوں کہانیاں لکھتے ہیں۔

جب بھی ہمیں کسی کہانی کے پلاٹ پر غور کرنا ہوتا ہے، ہم کسی نہ کسی ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں اور رات بھر اس پلاٹ کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پارک بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

"ہاں میرے دوست پچھلے دنوں بھی ہم کسی ایک کہانی پر گفتگو کرنے کے لئے تمہارے ہوٹل میں ٹھہرے تھے، اس کہانی کا مرکزی کردار انکل آئی ہے، اور اس کہانی کا نام ہے۔" "اہورای موت!"

اتنا کہہ کر الیگزینڈر پھر ہنس پڑا۔ پارک ایک سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا اس کی ساری محنت رائیگاں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے شرمندہ نگاہوں سے الیگزینڈر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کیسے یقین کرلوں۔"

ممکن ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"شہر کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو، کہ ایوی اس کون ہیں؟ یہ ہم دونوں میاں بیوی کا فلمی نام ہے، لوگ تمہیں ہمارے متعلق سب کچھ بتادیں گے۔ اس شہر کے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی مل کر کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہم دونوں پورے ملک میں جانے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم جاسوسی کہانیاں نہیں پڑھتے، اب ہماری اگلی کہانی "ادھوری موت" ضرور پڑھ لینا، مزا آئے گا۔"

"میں ایک ایمان دار شہری کی حیثیت سے اپنا فرض نبھا رہا تھا۔" پارک نے بھی سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "جب مجھے یہ پتہ چلا کہ اس ملک میں کوئی کسی کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ تو میں اس صورت میں اور کیا کرسکتا تھا۔"

"یہ تم نے ٹھیک کہا۔" الیگزینڈر نے اپنا سر ہلایا۔ "دیکھو مسٹر میں نہیں جانتا کہ تم کتنے ایمان دار اور فرض شناس شہری ہو۔ لیکن میرا فرض یہ ہے کہ پولیس اور انتظامیہ کو یہ بتادوں کہ تم نے اپنے ہوٹل کے کمروں میں خفیہ مائیک لگا رکھے ہیں اور اس طرح مسافروں کو ڈرا اور دھمکا کر بلیک میل کرتے ہو۔"

"لیکن میں تو!" پارک نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن الیگزینڈر اتنی دیر میں اپنی کرسی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کرسی پر رکھا ہوا ٹیپ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور مسکراتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

پارک بے وقوفوں کی طرح اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، کچھ دیر بعد وہ دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتے ہوئے ہوٹل سے جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"کیوں جناب؟ آپ ایسے کیوں واپس جا رہے ہیں؟" کلرک نے دریافت کیا۔

"ہاں۔" پارک نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی۔ اس نے کاؤنٹر پر اپنی دونوں کہنیاں رکھ کر کلرک کو مخاطب کیا۔ "مسٹر تم کسی ایوی ایس سے واقف ہو؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" کلرک نے بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔ "یہ دونوں میاں بیوی میں جو جاسوسی کہانیاں لکھتے ہیں۔"

"یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟" اسی شہر میں رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" پارک نے ایک گہری سانس لی اور بیس ڈالر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ اپنے ہوٹل کی طرف واپس آتے ہوئے بری طرح جھلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ماریہ نے ساری باتیں سننے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں کل صبح لائبریری جاکر ایوی ایس کی کتابیں دیکھوں گی۔" دوسرے دن وہ لائبریری سے ایوی کی ایک کتاب لے آئی۔ "میں ایوی ایس کی ایک کتاب لیتی آئی ہوں۔" ماریہ نے اسے بتایا۔

"کیا نام ہے اس کتاب کا؟" پارک نے اٹھا کر پوچھا۔

"نام کو چھوڑو، ایوی اور ایس کی تصویریں دیکھو۔" ماریہ نے کتاب پارک کی، گود میں پھینک دی، پارک نے کتاب اٹھائی اور ایوی ایس کی تصویریں دیکھ کر حیران رہ گیا، کتاب کے پچھلے کور پر ان دونوں کی تصویر چھپی تھی۔ ایوی ایک داڑھی والا بدصورت آدمی تھا، اور اس کی بیوی ادھیڑ عمر کی ایک فربہ عورت تھی۔ "دیکھ لیا تم نے۔" ماریہ غصے سے ہاتھ کھجاتی ہوئی بولی۔

"یہ دونوں تو وہ نہیں ہیں۔" پارک بوکھلا کر بولا۔

"تم پرلے درجے کے بے وقوف آدمی ہو۔" ماریہ نے جھلا کر کہا۔ "اس آدمی نے تمہیں بے وقوف بنادیا۔ اور تم بن کر آگئے، میں پہلے ہی جانتی تھی کہ تم عقل مندی کا کوئی کام نہیں کرسکتے، مسافروں کو بلیک میل کرلینا اور بات ہے اور باقاعدہ منصوبہ بنا کر کسی کی کی جیب سے رقم نکلوانا ایک دوسری بات ہے، سمجھے!"

"بس بس زیادہ بک بک مت کرو۔" پارک جھلا

کر بولا۔

"میں یہ کام تم سے بہتر کر سکتی ہوں۔" ماریہ نے ہاتھ نچایا۔ "لیکن سب سے پہلے میں روزانہ صبح ایک اخبار خریدا کروں گی، اس سے مجھے شہر کے حالات کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"تم اب خاموش رہو، سمجھے!"

پارک خاموش ہو گیا۔ رات کے کھانے میں اس نے بدمزہ پنیر کا ایک کھا کر بھی کوئی شکایت نہیں کی۔ ایک ہفتے تک کچھ بھی نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ پارک کو ہر روز صبح اٹھ کر اخبار میں چھپی ہوئی بیکار خبریں پڑھنی پڑتی تھیں۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد اخبار میں چھپی ہوئی ایک خبر کو پڑھ کر وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس اخبار کے پہلے صفحے پر آتر زنامی ایک آدمی کی موت کی خبر چھپی تھی۔ جو بہت دنوں سے بیمار تھا اور اتفاقاً اپنے مکان کی اوپری منزل سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس آدمی کی عمر ستر سال تھی۔ موت کے وقت اس کا بھتیجا الیگزینڈر اپنی بیوی گلوریا کے ساتھ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس خبر میں آتی کہ مکان کا پتہ بھی لکھا تھا اور یہ پتہ وہی تھا۔ جو الیگزینڈر کے مکان کا تھا۔ یعنی "اٹھارہ لائم اسٹریٹ!" اس کا مطلب یہ تھا کہ الیگزینڈر اور اس کی بیوی گلوریا اپنے منصوبے پر عمل کر چکے تھے۔

پارک کے خیال میں وہ مناسب موقع آ گیا تھا، جب وہ الیگزینڈر سے رقم اینٹھ سکتا تھا۔ اس کے پاس ٹیپ کی وہ بھی کاپیاں رکھی ہوئی تھیں، اس مرتبہ اسے اپنی کامیابی کی پوری امید تھی، اس نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا اور دلی کامیابی کی پوری امید تھی۔ اس نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیا، اور دل ہی دل میں ماریہ کی عقل مندی کو سراہنے لگا۔ جس نے اسے اخبار خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس دن اس کے ہوٹل میں کوئی نہیں آیا، لیکن اب پارک کو مسافروں کی اتنی پرواہ بھی نہیں رہی تھی۔ پانچ ہزار ڈالر کی کثیر رقم اسے ملنے والی تھی۔ دوسری صبح وہ الیگزینڈر کو دیکھ کر چونک پڑا۔ جو اپنی کار سے اتر کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آج اس کے چلنے کے انداز میں پہلے جیسا اعتماد نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پارک کے سامنے آ کر شکستہ ہو گیا ہو۔

"آؤ، آؤ!" پارک مسکراتے ہوئے بولا۔ "آخر تمہیں میرے پاس آنا ہی تھا۔"

"ہاں، میں تم سے کچھ باتیں کرنے کے لئے آیا ہوں۔" الیگزینڈر دھیرے سے بولا۔

"کیسی باتیں؟"

"تم نے کچھ دنوں پہلے مجھے ایک ٹیپ دیا تھا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تم اپنے ہوٹل میں ٹھہرنے والے مسافر کو بلیک میل کرتے ہو۔"

"اوہ!" پارک نے ایک گہری سانس لی۔ میرے دوست غالباً تم یہ بات بھول گئے کہ اس ٹیپ میں تمہاری گفتگو ہے، جس میں تم نے اپنے چچا کو قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں اس ٹیپ کو پولیس کے حوالے کر کے جیل بھجوا سکتا ہوں۔"

"پولیس کو کبھی یقین نہیں آئے گا۔" الیگزینڈر ہنس پڑا۔ "پولیس اس موت کو ایک حادثہ قرار دے چکی ہے۔ اس کے علاوہ پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ چچا آتر کی موت سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے، چچا کی تمام جائیداد ان کے قرض خواہوں کے نام ہو چکی ہے۔ میرے حصے میں صرف وہی شکستہ مکان آیا ہے جہاں میں رہتا ہوں، میں ان دنوں بہت ہی شدید پریشانی میں گھرا ہوا ہوں۔"

"تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ تم یہ کبھی نہیں چاہو گے، کہ میں تمہاری بلیک میلنگ کے متعلق پولیس کو بتا دوں۔ اس لئے میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا سودا؟" پارک نے جھلا کر سوال کیا۔

"دیکھو تمہارے پاس ایک ہوٹل ہے جس کے ذریعے تم اچھی خاصی رقم پیدا کر لیتے ہو، تم مجھے اپنا پارٹنر بنا کر بڑی آسانی سے اپنی زندگی گزار لو گے۔"

"بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" پارک چلاتے ہوئے بولا۔

"دیکھو مسٹر، اگر میں یہاں سے گیا تو سیدھا پولیس کے پاس جاؤں گا، ہمارے ملک کی پولیس بلیک میلروں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے۔ سمجھے!"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا سمجھے!" پارک چیختے ہوئے بولا تو الیگزینڈر پھر ہنس پڑا۔ وہ طنزیہ نگاہوں سے پارک کی طرف دیکھ کر بری طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ پارک کا خون کھول کر رہ گیا۔ وہ اپنے کاؤنٹر کی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی۔ گولی کہیں قریب ہی سے چلائی گئی تھی۔ پارک نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا۔ الیگزینڈر کی پیشانی پر ایک سوراخ بن گیا تھا۔ جس میں سے خون اُبل نکل کر چہرے کو رنگین کر رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا تا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ پارک حیرت سے خوف کے عالم میں دیکھتا رہ گیا۔

سیڑھیوں کے اوپر ماریہ کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔

پارک بوکھلا کر ماریہ کے قریب آ گیا اور اسے سہارا دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، لیکن ماریہ نے اپنا پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ پارک نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پستول اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسی وقت ہوٹل کا دروازہ کھلا، پولیس کے دو آدمی اندر داخل ہوئے اور پارک کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

پولیس والوں نے پارک کی کوئی بات نہیں سنی اور اسے گھسیٹتے ہوئے تھانے لے گئے، کچھ دیر بعد پارک کو چھوڑ دیا گیا، سارجنٹ نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ہم نے اس بات کا پتہ چلا لیا ہے کہ الیگزینڈر کا قتل تمہاری بیوی ماریہ نے کیا تھا۔"

"وہی تو میں بھی کہہ رہا تھا جناب!" پارک اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"ہاں، پہلے ہمیں تمہاری بات کا یقین نہیں آیا تھا، لیکن جب پستول کا معائنہ کیا گیا تو اس کے دستے اور ٹریگر پر پنیر لگا ہوا تھا۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس وقت تمہاری بیوی پنیر کا ایک ٹکڑا تیار کر رہی تھی اور اس کی انگلیوں میں آٹا اور پنیر لگا ہوا تھا۔ وہی نشان پستول کے دستے اور ٹریگر پر بھی ملے، بہرحال اب تم جا سکتے ہو۔"

"شکریہ جناب!" پارک نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ سارجنٹ سے ہاتھ ملایا اور باہر آ گیا۔ حالات نے اسے الیگزینڈر کے ساتھ ساتھ ماریہ سے بھی چمکارا دلوا دیا تھا۔ پنیر کے کیک نے اس کی جان بچالی تھی۔

ہوٹل میں گلوریا بیٹھی ہوئی پارک کا انتظار کر رہی تھی۔ پارک اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ گلوریا پارک کو دیکھ کر کرسی سے کھڑی ہوئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے کہ الیگزینڈر نے تم سے کیا باتیں کی ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

مطلب یہ کہ الیگزینڈر کے بجائے تمہیں اب مجھے ہوٹل کی آمدنی سے آدھا حصہ دینا ہوگا۔" پارک ہنس پڑا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بھی الیگزینڈر کی طرح پاگل ہو گئی ہو۔"

"نہ سو مت!" گلوریا خشک لہجے میں بولی۔ "پولیس کے پاس اس بات کی قوی شہادت موجود ہے کہ چچا آتر زایک حادثے میں ہلاک ہوئے لیکن تمہارا وہ گفتگو ٹیپ میرے پاس موجود ہے۔ جس میں تم نے ہماری گفتگو ٹیپ کی ہے۔ اگر میں ٹیپ پولیس کے حوالے کر دوں تو پولیس بلیک میلنگ کے جرم میں کم از کم پندرہ برس کے لئے تمہیں جیل بھیج دے گی..... سمجھے! اب بتاؤ تم مجھے اپنے ہوٹل کا پارٹنر بنا رہے ہو یا نہیں؟"

☆.....☆.....☆

الیگزینڈر کے قتل کا مقدمہ ماریہ پر درج کر کے اسے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ مقدمہ ابھی چل ہی

رہا تھا کہ ماریہ نے جیل میں خودکشی کرلی، اس کی لاش پارک کے حوالے کرنے کے لئے ہوٹل میں لائی گئی، تو اس نے ماریہ کے مردہ جسم کو ایک لات رسید کی، اور پھر انتہائی نخوت سے بولا۔ ”اس بدصورت عورت سے خدا نے میری جان بچالی، لیکن یہ پھر واپس آگئی اور تو یہ پہلے سے بھی زیادہ بھیانک لگ رہی ہے۔“ پارک کے اشارہ اس کے مسخ شدہ چہرے کی طرف تھا۔ جو کہ بری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ لوبے کی سلاخوں نے اس کے نقوش مٹا دیئے تھے۔ آخر کار سرکاری خرچے پر ماریہ کی لاش کو دفنا دیا گیا، اور پارک اپنے پیسے کو یہاں بھی بچا گیا تھا۔

ماریہ کی تدفین کے بعد پارک گلوریا سے بولا۔ ”ہاں ٹھیک ہے، میں تمہیں ہوٹل میں اپنا پارٹنر بنالیتا ہوں، لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔“

گلوریا جلدی سے بولی۔ ”کیسی شرط؟“

”تمہیں میری زندگی میں بھی پارٹنر بننا ہوگا۔“ پارک اس کے خوب صورت سراپے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

تو گلوریا بولی۔ ”مجھے منظور ہے۔“

”تو پھر صبح ہی چرچ جا کر شادی کرلیں گے۔“ پارک بے صبری سے بولا۔ تو گلوریا نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

کمرہ خوب صورت طریقے سے سجا ہوا تھا۔ آج پارک نے خوب پیسے خرچ کئے تھے۔ گلوریا کا سفید لباس بھی اس نے خریدا تھا۔ وہ پرمسرت سا کمرے میں داخل ہوا تو جھوم کر رہ گیا۔ ماریہ جیسی بدصورت اور بدمزاج عورت کے ساتھ زندگی کتنی بور تھی اور آج گلوریا جیسی خوب صورت عورت خدا نے اسے عطا کردی تھی۔ اس خوشی میں آج اس نے ہوٹل کے باہر بورڈ لگوا دیا تھا۔ ”ہوٹل آج بند ہے۔“ وہ خوب زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا تھا، اس لئے وہ جھومتا ہوا گلوریا کے پاس آیا اور بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ کر اس نے گلوریا کا ہاتھ تھاما۔ گلوریا کا ہاتھ غیر معمولی حد تک ٹھنڈا تھا۔ بالکل برف کی ڈلی کی طرح.....! اس نے اس غیر معمولی ٹھنڈک کو نظر انداز کرتے ہوئے سفید جالی کا نفیس سا نقاب الٹ دیا۔ اور پھر جھٹکا کھا کر دور گرا۔

گلوریا کی خوب صورت گردن پر ماریہ کا بدصورت مسخ شدہ نقوش والا چہرہ جڑا ہوا تھا۔ یوں جیسے کسی نے گوند سے جوڑ دیا ہو۔ ”ماریہ..... مگل..... گلوریا..... کدھر..... ہے؟“ پارک کے سوال پر گلوریا کے خوب صورت بدن نے حرکت کی۔ اور اک طرف اشارہ کردیا۔ پارک نے انگلی کے اشارے پر سامنے دیکھا تو گلوریا کا خوب صورت چہرہ ہوا میں معلق تھا۔ اور اس کے منہ میں زبردستی پنیر کیک ٹھونسا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں خطرناک حد تک باہر ابل آئی تھیں۔ پارک نے دہشت سے کانپتے ہوئے باہر کی طرف دوڑ لگائی، لیکن بیڈ روم کا دروازہ بند ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

بہت دنوں بعد پولیس کی ایک گاڑی گشت کرتی ہوئی ہوٹل کے قریب سے گزری۔ تو کچھ غیر معمولی پن محسوس کرتے ہوئے ہوٹل میں گھس آئی۔ انہیں سارا ہوٹل خالی ملا، ہاں ایک کمرہ میں پارک کی بوسیدہ لاش ملی، لاش سڑ چکی تھی، لیکن ابھی بھی اس کے منہ اور آنکھوں کانوں میں پنیر کے کیک کے ٹکڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔

کمرے کے بستر پر اک خوب صورت جسم پڑا ملا، جسم ایک عورت کا تھا۔ جس نے دلہن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور گردن پر سے اس کا چہرہ غائب تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد پولیس کو چہرہ ہوٹل کے Play room سے ملا۔ جیسے کوئی اس سے کھیلتا رہا ہو۔ عورت کے چہرے پر جگہ جگہ پنیر لگا پڑا تھا۔

پولیس کے لئے یہ سب بڑا ہولناک تھا۔

اگلے دن کے اخبار میں اس کیس کو ایک معمہ قرار دے گیا۔ کچھ دن خوب ہنگامہ رہا اور پھر خاموشی چھا گئی، لیکن ہوٹل میں ابھی بھی کیک کی خوشبو آتی ہے۔ جیسے کوئی پنیر کو بیک کر رہا ہو، اور کیک بس تیار ہونے والا ہو۔

☠

اسیر انتظار

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان کو دل شکستہ آواز سنائی دی۔ میں چلتی ہوں اور تمہارا انتظار کروں گی اور نوجوان کی آنکھوں میں انتظار کا دیپ جلنے لگا جو کہ کربناک اذیت ناک اور جان لیوا تھا اور ہر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں تو.....

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے برسوں یاد رہنے والا دل گرفتہ شاخسانہ

سنھری اور مئی بادلوں نے آسمان اور زمین کے بیچ ایک دیوار سی تان رکھی تھی۔ سورج بھی اسی دیوار کی اوٹ میں تھا۔ سانول نے موسم کے بگڑے بگڑے سے تیور دیکھے تو ہاتھ مزید تیزی سے چلانے لگا۔ وہ موسم برسات کے لئے ایندھن جمع کررہا تھا۔ موسم خراب ہو جاتا تو ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ ایسے میں ”دائم پور“ کے باسی لکڑیاں گھر میں ہی جمع کرلیتے تھے۔ اس نے ایک خشک جھاڑی کو جڑوں سے اکھیڑا۔ ریتلی زمین آسانی سے اکھڑ گئی تھی۔ اس نے جھاڑی کی دیگر لکڑیوں کے ڈھیر میں رکھا تو اسے جھاڑی کی جڑوں پر کوئی عجیب سی شے لپٹی دکھائی دی۔ اس نے جھاڑی اٹھائی اور اسے زمین پر مارنے لگا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب ٹھہری اور وہ گول سی شے جڑوں سے الگ ہوگئی..... سانول نے بغور زمین پر پڑی اس عجیب وغریب چیز کو دیکھا۔ وہ کسی جانور کا گوشت و پوست سے عاری پنجر تھا۔ اس نے سر جھکا اور لکڑیاں سمیٹ کر اٹھا ہی رہا تھا جب غیر متوقع طور پر عقب میں غرابٹ ابھری۔ وہ بے ساختہ چونک کر پلٹا۔ وہ تقریباً خونخوار سے اور پر کٹے شیر کے پنجے تھے۔ ان سے تازہ خون بھل بھل نکل رہا تھا۔ غرابٹ پھر ابھری اور پنجے سرعت سے اس پر جھپٹے۔ وہ اس قدر خیر زدہ تھا کہ وہ دشمن بھی ظاہر نہ کرسکا۔ اس نے اپنی گردن کے پاس خنجر سے اترتے محسوس کئے اور پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اس کی آنکھیں کھلیں تو چند لمحے تک وہ سمجھ نہ پایا کہ اسے کیا ہوا تھا وہ کہاں ہے۔ پھر دھیرے دھیرے اسے گزرے واقعات یاد آگئے..... وہ ایک جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھا۔ بغور جائزہ لینے پر اسے احساس ہوا کہ وہ کسی غار میں ہے۔ وہ اچنبھے رہ گیا، اسے بائیں جانب روشنی کی ہلکی سی کرن دکھائی دی اور وہ اسی جانب چل دیا۔ وہ قدرے لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ سامنے ایک غرابٹ ابھری اور وہ بے ساختہ بیٹھ کی کشش میں لڑکھڑا گیا۔ دونوں پنجے اس پر جھپٹے تھے۔ سانول کے حلق سے چیخ نکلی۔ خوف اس کے گرد پنکھ پھیریاں کھانے لگا۔ یہ پنجے اسے مانوس لگ رہے تھے۔ دفعتاً اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ بجلی کا کوندا سا لپکا اور وہ شاکڈ رہ گیا۔ خوف میں لپٹی ایک سرد لہر نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جنم لیا اور یکبارگی پورے وجود میں سرایت کرگئی۔ ماضی اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت اس کی آنکھوں میں لہرانے لگا۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنی دونوں بہنوں سے بڑا تھا۔ اس کی ماں چند سال قبل فوت ہو چکی تھی اور اس کا باپ دن بھر لکڑیاں جمع کرتا اور شہر دار کے حوالے کردیتا۔ بدلے میں بچا کھچا کھانا انہیں مل جاتا تھا۔ کرم دن کی بوڑھی آنکھوں کا ایک ہی خواب تھا کہ سانول کسی طرح سے اتنا کمالے کہ اپنی بہنوں کی شادیاں کرسکے۔ اس نے سانول کو زمینوں پہ لگا رکھا تھا۔ آمدنی معقول سے بھی کم تھی لیکن انہیں اسے قبول

کرنے کے سوا کوئی متبادل نہ تھا۔ مارچ کی ایک سنہری خوشگوار سی سہ پہر کو جب اس نے باغ میں پانی لگا رکھا تھا۔

نمبردار اکمل خان کی بیٹی فرحین اپنی سہیلیوں کے ہمراہ یونہی گھومنے کی غرض سے چلی آئی۔ سانول نے ابھی ابھی منہ پہ پانی کے چھپکے مارے تھے۔ اس کی سنہری رنگت پہ پانی کے سفید موتی سے چمک رہے تھے۔ چمکدار بھورے بال پیشانی پہ چپکے تھے۔ ساحرانہ آنکھیں فرحین پہ ٹکیں اور اسے مبہوت کر گئیں۔ وہ کسی سحر کے زیر اثر گم سم رہ گئی۔

سانول نے جلدی سے رخ پھیرا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ فرحین کی نیند اور چین و قرار بھی لے جا رہا ہے..... پھر یوں ہونے لگا کہ فرحین کے چکر کھیتوں میں بڑھنے لگے۔ یہ بات سانول نے بھی محسوس کر لی تھی اور وہ فرحین سے کترانے لگا۔ فرحین جونہی اسے نظر آتی، وہ دور چلا جاتا۔ فرحین اس کی اس حرکت کو بس دیکھتی رہ جاتی۔

☆.....☆.....☆

22 جون کا آگ اگلتا سورج طلوع ہوا تو سانول نہیں جانتا تھا کہ اس آگ میں آج اس کا سب کچھ جل کر بھسم ہونے لگا ہے۔ بہنوں نے ناشتہ لا کر اس کے سامنے رکھا تو اسے نہیں پتہ تھا کہ یہ اس گھر میں آخری ناشتہ ہے۔ اسے آج کپاس کی فصل کو پانی لگانا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹیوب ویل چلایا اور پانی کے لئے راستہ ہموار کرنے لگا۔ سورج آگ برسا رہا تھا اور گرمی کی شدت سے اس کے جسم میں موجود توانائی کو پسینے کے ساتھ بہتی جاری تھی۔ کھیتوں میں جس از حد تھا۔ اسے کپاس کی شاخوں میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ لمرا تے سرخ آنچل نے اسے کوفت میں مبتلا کر دیا۔ وہ فرحین ہی تھی۔ اس کی بے داغ شفاف جلد پسینے سے تر تھی۔ لمبے سیاہ بال گردن سے چپک گئے تھے اور اس کی سفید رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر رک گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ ”آپ یہاں کیوں آئی ہیں فرحین بی بی؟“ اس نے ناگواری سے پوچھا تھا۔

”کیا تم نہیں جانتے؟“ فرحین نے اس کی سیاہ ساحر آنکھوں میں جھانکا۔

”فرحین بی بی! آپ اپنی حیثیت بھی جانتی ہیں اور میری بھی۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ ایسا مت کیا کریں۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے رسوائی کے۔ ایک لڑکی کی عزت بہت نازک ہوتی ہے۔ پھر آپ اپنے بھائیوں سے بھی واقف ہیں۔ اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر لیں۔“ اس نے رسانیت سے کہہ کر رخ موڑا تو شاکڈ رہ گیا۔

کافی فاصلے پر چوہدری زریاب اپنی کوٹھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ وہ آگے بڑھا اور فرحین کو گالیوں سے نوازتا گھسیٹ کر گھر لے جانے لگا۔ جاتے جاتے اس نے ایک سرد نگاہ سانول پر ڈالی تھی۔ اس نگاہوں کی کاٹ اس کا دل چیر گئی تھی۔ ”زریاب صاحب میرا کوئی قصور نہیں.....“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی تھی مگر زریاب اس سنی کرتا چلا گیا۔

سانول کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جب گھر پہنچا تو..... فضلو اور بخشو دیگر لوگوں کے ساتھ اس کی جوان بہنوں کو دبوچے لے جا رہے تھے۔ کرم دین کا بے ہوش وجود بھی دو آدمیوں کی باہوں میں جھول رہا تھا۔ ”چھوڑو انہیں۔“ وہ چلاتا ہوا آگے بڑھا اور اسے بھی ان لوگوں نے دبوچ لیا۔

☆.....☆.....☆

ڈیرے پر لوگوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ سانول، اس کی بہنیں اور بوڑھا کرم دین اپنے زخموں سے چور وجود کے ساتھ چوہدری اکمل خان کی جانب ملتجیانہ نگاہوں سے تک رہے تھے۔ ”تو طے ہوا کہ سانول نے نمک حرامی کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے چوہدری اکمل خان کی عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ سانول سرپنچ جمال خان کی بات قطع کرتا چلا اٹھا۔ نتیجتاً بخشو کی ایک بھرپور ٹھوکر اس کے چہرے پر پڑی تھی۔

”اس کے بدلے میں چوہدری صاحب کو حق ہے کہ وہ جو مرضی سزا دیں۔“ جمال خان کی بات پہ دیگر لوگوں نے تائید اً سر ہلایا تھا۔ سانول نے خوفزدہ نظروں سے اپنی

ہراساں بہنوں کو دیکھا۔ اسی وقت چوہدری اکمل کے آدمی ردا اور نادیہ کو گھسیٹتے ہوئے مہمان خانے میں لے جانے لگے۔ ان کا ارادہ بھانپتا وہ برق رفتاری سے انہیں چھڑانے لپکا۔ بری طرح پٹنے کے باوجود وہ انہیں چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ فضلو نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ اس کی سماعتوں میں اپنی بہنوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

اور جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی..... کرم دین مر چکا تھا اور اس کی بہنیں زندہ لاشیں بن چکی تھیں۔ پھر ان تینوں کو پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔ نت نیا تشدد ان پر آزمایا جاتا۔ اور پھر..... ایک دن میدان میں اس کی بہنوں کو چوہدری زریاب کے پالتو شیر کے آگے ڈال دیا گیا۔ صرف چند منٹ کا کھیل تھا۔ ردا اور نادیہ کی دلخراش چیخیں معدوم ہو گئیں۔ وہ حیرت و بے یقینی سے ششدر سا کھڑا تھا۔ زریاب نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور سانول گویا کسی خواب سے جاگ اٹھا۔ اس نے عالم وحشت میں پاس کھڑے بخشو سے رائفل چھینی اور اس درندے پر گولیاں برسانے لگا۔ اسی اثنا میں ایک دبکتا انگارہ اس کے بائیں بازو میں کھسا۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور چاروں جانب گولیاں برسانے لگا..... اس کی آنکھوں کے آگے انتقام کی سرخ چادر تنتی گئی تھی۔ ذہن جکڑن کی زد میں تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا ان لوگوں کی بدقسمتی..... ان کی موت اس کے ہاتھوں لکھی گئی تھی۔ اس نے رائفل پھینکی اور اپنی بدنصیب بہنوں کی بچی کھچی لاشیں اٹھانے لگا۔

شیر کی اگلی دونوں ٹانگیں اس کے مردہ جسم سے الگ پڑی تھیں۔ اس وقت اسے محسوس ہوا تھا کہ ان ٹانگوں نے حرکت کی ہے۔ مگر وہ بنا دھیان دیئے لاشیں اٹھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

اکلوتے بیٹے کی موت نے اکمل خان کے حواس چھین لئے تھے۔ فرحین کو وہ لوگ پہلے ہی مار چکے تھے۔ اس کا نازک سراپا سانول کی آنکھوں میں کبھی بن کر چمکنے لگا۔ اس نے سر جھٹکا اور وہاں سے چلا گیا۔ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ دائم پور کے لوگ سادہ لوح اور سادہ دل تھے۔ سانول نے بھی وہیں سکونت اختیار کر لی تھی.....

☆.....☆.....☆

وہ سر جھٹک کر ماضی سے حال میں آیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ پنجے اسی درندے کے ہیں جس نے ردا اور نادیہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور بعد میں سانول نے اسے بھون ڈالا تھا مگر لوگوں سے..... اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور پہلو میں دل پارے کی مانند مچلنے لگا.....

غراہٹ پھر ابھری اور وہ پنجے پھر جھپٹے..... اسی لمحے ایک سفید روشنی نمودار ہوئی اور پنجے بھڑک اٹھے۔ دھڑا دھڑ جلتے ان پنجوں کی بو نہایت ناگوار تھی۔ ساتھ ہی غراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اذیت ناک، کرب انگیز غراہٹیں.....

خوشبو کا ایک جھونکا اس کی سانسوں سے ٹکرایا تو وہ چونک کر پلٹا۔ ”فرحین!“ وہ ششدر سا اسے دیکھنے لگا..... ”مجھے معاف کر دینا سانول!“ وہ اذحد شرمندہ تھی۔

”خود تم بھی تو..... اسی ظلم کی بھینٹ چڑھی ہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”تم سوچ رہے ہو نا کہ یہ شیر کے پنجے..... یہ شیر اصل میں ایک جادوگر کا تھا..... اس نے اس پر کوئی خاص عمل کر رکھا تھا۔ جب تم اسے مار کر گئے تو اسے آگ لگ گئی تھی۔ یہ پنجے آگ کی زد سے بچ گئے تھے اور تمہاری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔“ فرحین نے تفصیلاً بتایا۔

”میں چلتی ہوں۔ تمہارا انتظار کروں گی۔“ وہ چلی گئی..... وہ واقعی چلی گئی۔ اور سانول کی جلتی آنکھوں میں بھی انتظار آن سمایا..... موت کا انتظار..... اس انتظار کو اب ہمیشہ اس کی آنکھوں میں پوشیدہ رہنا تھا۔

انتظار کی چبھن صرف وہی جان سکتا ہے جو اس کا اسیر ہو..... انتظار کی اذیت بے حد اذیت ناک ہوتی ہے۔ پل پل کرب انگیز ہوتا ہے..... لمحہ لمحہ جان لیوا ہوتا ہے..... اور سانول اسی اذیت ناک، کرب انگیز اور جان لیوا انتظار کے جال میں بری طرح جکڑا گیا تھا۔ اس کے شکنجے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اور اسے آخری سانس تک پل پل مرتے مرتے اسی ”انتظار“ کا اسیر رہنا تھا.....

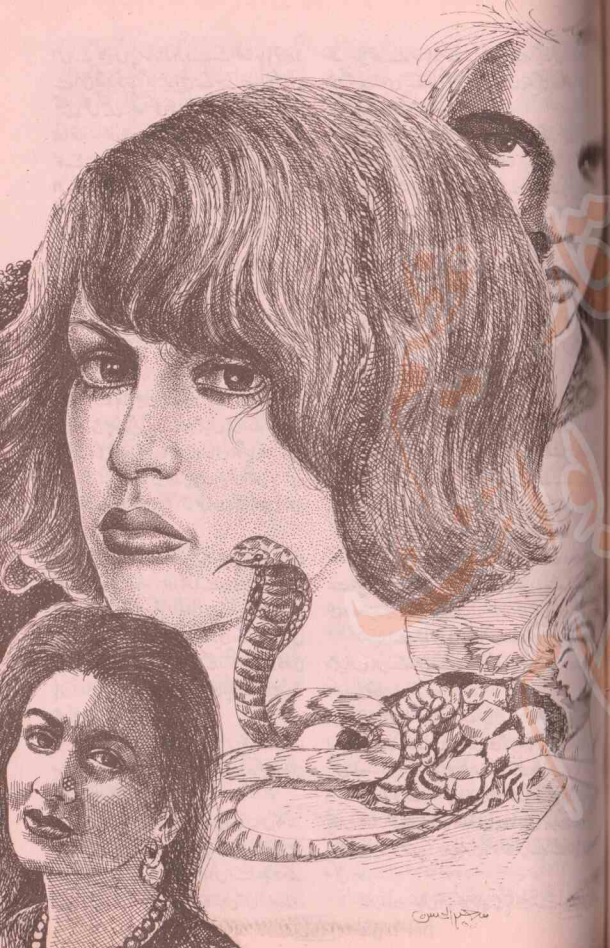

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر:09

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دیار ہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو حاطہ کرتی دلگداز کہانی

"تم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو.....؟" ارونا نے پست آواز میں پوچھا۔

"میں تم دونوں کا سارا مال اثاثہ لے کے جارہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ لے جانے تو آئی ہوں۔"

"کیوں.....؟ کیوں.....؟" ارونا بولی۔ "یہ تمہارا نہیں ہمارا مال ہے۔"

"یہ تم دونوں کے باپ کا مال نہیں ہے..... یہ سارا اثاثہ مسافروں کا ہے جو تم نے برسوں سے لوٹ کے رکھا ہوا ہے..... میں یہ انہیں لوٹانے کے لئے لے جارہی ہوں جن کا ہے..... اور پھر تم نے میرے ساتھی کو لوٹا..... رندھیر نے میرے ساتھی کو کلورو فارم سونگھا کے بے ہوش کر کے ندی کنارے ڈال کے اور یہاں بھاگ کے آگیا تاکہ لوٹا ہوا مال ہضم کرلے..... میں اسے ہڑپ کرنے نہیں دوں گی..... میں سب سے پہلے لٹے ہوئے مسافروں کو ان کا مال واپس کروں گی۔ اب میں جارہی ہوں۔"

"ہماری بات تو سنو....." رندھیر بولا۔

"لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا..... انہیں محسوس ہوا کہ وہ پراسرار اور نادیدہ ہستی جاچکی ہے..... اب وہ لٹے ہوئے مسافروں کی طرح فلاش ہو چکے تھے۔ ان کے پاس ایک وقت کے کھانے کے لئے ایک دمڑی بھی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جسے بیچ کے گزارہ کرسکیں..... ان کی حالت پاگلوں کی سی ہورہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آہ کاش کو اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہا اور اس دوران اس پر کیا گزری؟

جب اس کی آنکھ کھلی تو پو پھٹ رہی تھی۔ اس کے بدن کے جوڑ جوڑ میں جو ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس نے اس کے وجود کو دہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ بے جان سا پڑا تھا۔ اس میں ہلنے تک کی سکت نہیں رہی تھی۔ ایسا درد اور ایسی تکلیف اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

اس نے سوچا وہ کب تک اس حالت میں پڑا رہے گا.....؟ اس کی جان کو شدید خطرہ تھا۔ کیوں کہ زہریلے کیڑے مکوڑے، سانپ اور جنگلی درندے اسی اسے اپنا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اس کا ذہن بالکل کام نہیں کررہا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اسے اس حال کو کس نے پہنچایا تھا؟

اس نے اپنے سارے شریر کی شکتی کو جمع کیا۔ پھر

اس نے کہنیوں پر سارا زور دے کے اٹھنا چاہا تو درد سے اس قدر تڑپ گیا کہ اس کے منہ سے دل خراش چیخیں نکل گئیں۔ وہ ابھی تک کانٹے دار جھاڑی میں پڑا ہوا تھا..... اور اس کے بدن پر حرکت کرنے سے کئی کانٹے چبھ گئے تو ان میں سے خون رسنے لگا۔ جس سے اس کے لئے اس کی تکلیف اور درد میں اضافہ ہونے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ یہ جھاڑیاں خون آشام بن گئی ہیں جن کی گرفت سے نکلنا اسے ایک گھمبیر مسئلہ لگ رہا تھا۔ اس تکلیف میں اسے چیا کا بالکل خیال نہیں آیا۔ اس کی مدد سے وہ پل بھر میں اس عذاب سے چھٹکارا پالیتا..... اس نے آخر نہ تو حوصلہ ہارا اور نہ ہی ہمت..... پھر اس نے دل پر جبر کر کے جاں گسل مشقت سے جھاڑیوں سے باہر آیا تو اس کا لباس اس بری طرح پھٹ گیا تھا کہ وہ دھجیاں بن کے جسم سے جھولنے لگا تھا اور اس کا بدن لہولہان ہو گیا تھا۔ بدن کی کھال ایسی ادھڑ گئی اور چہرے پر خراشیں پڑ گئیں تھیں، وہ بری طرح چیخ اٹھا اور درد کی ٹیسوں میں شدت ہونے لگی۔

اس نے قدرے فاصلے پر ایک تباہ شدہ بیل گاڑی کا ملبہ پڑا ہوا دیکھا..... اور پھر اسے دو بیلوں کی اکڑی ہوئی بے جان لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یہ کوئی اور بیل گاڑی تھی۔ شاید کوئی سانپ اس گاڑی کے تعاقب میں تھا جس کا نشانہ دونوں بیل بن گئے۔ لیکن اسے گاڑی بان دکھائی نہیں دیا۔ وہ شاید اپنی جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پھر معاً اپنے منکہ کا خیال آیا تو اس کا ہاتھ فوراً ہی سرعت کے ساتھ اپنے گریبان کی طرف بڑھ گیا جو بری طرح پھٹا ہوا تھا۔

یہ دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی کہ اس کا منکہ بدستور اس کے گلے میں موجود ہے۔ گاڑی بان رندھیر نے کلورو فارم سونگھا کے اسے بے ہوش کرتے وقت منکہ دیکھا نہیں اور عجلت میں اسے اس کا خیال نہیں آیا اور نہ وہ منکہ ساتھ لے جاتا۔ منکہ نے اسے جیسے ایک نئی زندگی دی تھی۔ اس کے دل کو بڑی ڈھارس بندھی۔ پھر اس نے ایک انجانی سی مسرت محسوس کی۔

اس نے اپنے پچھلے تجربے کی بنا پر منکہ منہ میں رکھنے میں لمحے بھر کی بھی تاخیر نہیں کی۔

یہ منکہ نہیں تھا..... ایک طرح سے امرت ہی تھا جس نے تیر بہدف کا کام کیا تھا..... چند لمحوں میں اس کے زخموں کی ٹیسیں اور زخم مندمل ہوتے گئے۔ اب ان کے درد کا نام و نشان تک نہ رہا اور وہ سابقہ حالت میں صحت مند اور توانا نظر آنے لگا۔ اس نے زخموں کی طرف دیکھا۔ وہ مندمل ہو گئے تھے اور اب ان کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور پھر اس کی نس نس میں ایک عجیب فرحت بخش احساس دوڑنے لگا۔

پھر اس نے ویرانے کا جائزہ لیا۔ چاروں سمتوں میں صبح کا اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ پھر اسے لمحے کے لئے گاڑی بان رندھیر کا خیال آیا جس نے اسے لوٹنے کے لئے بے ہوش کر کے جھاڑیوں میں اس خیال سے پھینک دیا تھا کوئی سانپ یا درندہ اسے موت کی بھینٹ چڑھا دے گا..... لیکن وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ چیا کے علم میں یہ واقعہ آنے ہی وہ رندھیر کی خبر لے گی۔

اب اسے لباس کی اشد ضرورت تھی۔ لباس کو دھجیاں بن کے اس کے جسم پر جھول رہا تھا اسے نیم برہنہ کر دیا تھا.....

اسے چیا کا خیال آتے ہی اس نے طلب کیا.....

اسے تو طلب کرنے کی دیر ہوتی تھی کہ سامنے کھڑی ہوتی تھی..... دو سیکنڈ..... اس طرح کئی لمحے بیت گئے..... دس منٹ گزر گئے..... چیا کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ پجاری شنکر سوامی کے منتھے چڑھ گئی ہو.....

پھر اسے خیال آیا کہ شاید چیا اس سے روٹھ گئی ہو.....؟ ناراض ہو گئی ہو..... پھر اسے وہ رات یاد آئی کہ..... چیا اس کے طلب کئے بغیر ہی بڑے ہوش ربا انداز سے آ گئی تھی..... اور محبت بھری باتیں کرتی رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ چیا اس پر مہربان ہونے اور رات گزارنے آئی ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ چیا اس پر جذباتی اور دماغی طور سے نچاور ہو جائے۔ وہ بڑی بے دلی سے پیش آیا اور اس سے کہا۔

"چیا! محبت بھری باتوں میں جو مسرت و انبساط ہے۔ سکتے میں ایسا کیف و سرور کہاں.....؟ آج کی رات ہم دونوں محبت بھری باتوں میں دور چلے جاتے ہیں..... تمہاری یہ باتیں کیسا سرور پہنچا رہی ہیں..... ایسا لطف و گداز جذبات کے دلدل میں گرنے میں کہاں.....؟"

"گویا تم مجھ سے اکتا چکے ہو.....؟" چیا ایک دم سے اداس ہو کے بولی۔

"نہیں میری جان..... ! کہیں ایسا ہو سکتا ہے..... تم غلط سوچ رہی ہو؟"

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے اب تم تمہارا عشق سرد پڑ گیا ہے۔" وہ دکھی سی ہو گئی۔

"کیا تمہارے نزدیک عشق و محبت اس کا نام ہے کہ ہم آلودہ ہو جائیں۔" آکاش نے کہا تھا۔

تمہارا عشق..... تمہارا دل..... میرے جسم اور قرب سے بھر چکا ہے۔ میں اب جا رہی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ چیا اس کی نظروں سے غائب ہوتی اس کا ہاتھ تھام لیا تھا..... پھر ہاتھوں کے پیالے میں اس کا حسین چہرہ بھر لیا اور اس پر جھک گیا..... لیکن آکاش نے اس جذبہ عشق پر میل آنے نہیں دیا۔ پھر شام رات ان دونوں نے عشق و محبت کی پر کیف باتوں میں کاٹی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ چیا اداس اداس سی ہو رہی تھی۔

آکاش نے اس میں بے زاری محسوس کر کے اس کی بڑی تعریف کی اور باتوں سے ہر طرح خوش کیا۔ لیکن وہ جس ناز سے آئی تھی وہ نہ رہی تھی، آکاش کو اب پچھتاوا سا ہوا تھا کہ اس نے چیا کے ساتھ ایک طرح سے بے رخی کا سلوک کیا۔ چوں کہ وہ صنف نازک کی ذات تھی اس لئے بہتری بھی اور اس کی انا کو ٹھیس پہنچی۔

آکاش کو اپنی کوتاہ اندیشی صدمے کا احساس ہوا۔ اس نے چیا کا دل مجروح کیا تھا۔ اس لئے وہ اس کے طلب کرنے پر بھی نہیں آئی تھی۔ کاش وہ اس کے ساتھ اس قدر بے مروت نہ ہو جاتا..... اس کا دل رکھ لیتا..... اس کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاتا.....

امرتا کی بات تو اور تھی۔ وہ اس کی ہر طرح سے تابع تھی اور وہ اس کا ہر حکم مانتی تھی اور اس کی کسی بات سے انکاری نہ ہوتی تھی۔ لیکن چیا پر ایسی کوئی پابندی نہ تھی اور نہ ہی وہ اس کی پابندی تھی۔ وہ امرتا کے حکم پر اس کی ہر طرح مدد کر رہی تھی..... اور پھر ٹوٹ کے اس سے عشق کرنے لگی تھی..... یہ آتش عشق تھا جو اس کی آگ میں کود پڑی تھی۔ اور ہر طرح خوش کرتی تھی۔ جانے اس رات اس کی خود غرضی سے وہ چیا سے محروم ہو چکا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ اس رات اسے نیلم کی بے پناہ یاد آئی تھی وہ نیلم کے چشم تصور میں کھویا، بیتے دن اور راتیں اور اس کا قرب اور جلوؤں کو یاد کر رہا تھا..... چیا اچانک اور غیر متوقع آ گئی تھی۔ اگر وہ چیا کو یہ کہہ کے ٹال دیتا کہ اس وقت اسے نیلم بہت یاد آ رہی ہے..... لہٰذا اسے تنہا چھوڑ دو..... چیا اسے اپنی توہین اور تذلیل سمجھتی۔

لیکن اس نے ایک اور بات محسوس کی تھی۔ چیا اس کے قریب کہیں موجود ہے۔

یہ احساس اس لئے ہوا تھا کہ جب وہ منکہ کو چوم رہا تھا تو اس نے ایسا محسوس کیا تھا کہ منکہ جیسے چیا کے ہونٹ ہوں۔

اس نے منکہ میں چیا کے شیریں لبوں کو محسوس کیا تھا..... گداز پن..... مٹھاس..... اور فرحت بخش

لمس..... اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ..... چمپا اس کے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ رہی ہے..... درد اور زخموں کو جذب کر رہی ہے..... اسے ایک شانتی سی محسوس ہو رہی ہے اور زخم چشم زدن میں مندمل ہو رہے ہیں۔

چمپا سے ہر طرح نا امید اور مایوس ہونے کے بعد اس نے سوچا کہ اب رات ہونے والی ہے..... اس اندھیرے میں وہ سفر کرنے سے رہا تھا۔ اسے راستہ معلوم نہیں تھا۔ اور پھر راستہ ناہموار بھی تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ٹھوکریں کھا کر گرتا رہے۔ بہتر ہے کہ صبح کے اجالے میں چل پڑے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کے لئے اپنی نرم اور سنہری کرنیں سمیٹ رہا تھا۔

معاً اس کی نظر جھاڑیوں کے پاس پڑی جہاں ایک بڑی سی پوٹلی پڑی تھی۔ اسے یاد آیا کہ رندھیر نے چلتے وقت کھانے کے لئے جو پوٹلی لی تھی اسے اپنے پاس رکھ کے بیل گاڑی ہانک رہا تھا۔ اس وقت آکاش کو بڑے زور کی بھوک محسوس ہوئی تو وہ پوٹلی کی طرف لپکا..... یہ دیکھ کے اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی اس میں جو ترکاری، پوریاں اور حلوہ ہے اس کی تعداد اتنی ہے کہ دو تین لوگ شکم سیر ہو سکتے ہیں۔

وہ پوٹلی لے کے دریا کنارے بیٹھ گیا۔ پھر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ دو دن کا بھوکا تھا اس لئے ندیدوں کی طرح کھانے لگا۔

خوب سیر ہو کے کھانے کے بعد اتنا کچھ بچ گیا تھا کہ دو وقت پیٹ بھر کے کھایا جا سکتا تھا۔ اس وقت اس نے اندازہ کیا کہ ہری پور ابھی آیا نہیں..... ہری پور یہاں سے سات میل کی مسافت پر تھا۔ پھر ہری پور سے سات آٹھ میل پر مہر بٹہ مندر بستی تھی..... جہاں نیلم اور اس کی کزن بملا قید تھی۔ اب پیدل مسافت طے کرنا تھی۔ وہ شام تک ہی ہری پور کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

وہ دریا کنارے جو ایک اونچا ٹیلہ تھا اس پر کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تا کہ رات گزارنے کے لئے اسے کوئی مناسب جگہ مل جائے۔ اس کا کسی درخت کے نیچے سونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ گو کہ اس کے گلے میں منکہ تھا اور کسی موذی جانور سے کوئی خوف [illegible] تھا۔ لیکن وہ پھر بھی احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ یہ علاقہ [illegible] کے لئے نیا اور اجنبی تھا۔ وہ خواب میں بھی نہیں آ [illegible]

اس نے بائیں جانب دیکھا۔ یہ شمال کی [illegible] تھا..... تقریباً پانچ سات میل دور ایک بہت بڑی [illegible] دکھائی دی..... بہت سارے گھروں سے روشنی [illegible] رہی تھی۔ گھر چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔ [illegible] بستی اس کے راستے میں نہیں آتی تھی ورنہ وہ [illegible] پڑتا..... اسے ناک کی سیدھ مغرب میں جانا تھا۔ اگر [illegible] اس بستی کی جانب چل پڑتا تو نصف شب بیت جاتی اور [illegible] کچھ حاصل نہ ہوتا۔ ہری پور کے اختتام پر اسے ایک [illegible] چکر کاٹنا پڑتا۔ یہ وقت کا ضیاع تھا۔

ملگجا اندھیرا گہرے اندھیرے کی آغوش میں [illegible] تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟..... وہ [illegible] ہی رہا تھا کہ اس نے دفعتاً ایک نسوانی چیخ گہرے [illegible] میں سنی اور ساتھ ہی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز.....

"بچاؤ..... بچاؤ..... بھگوان کے لئے اور....."

اس کی مزید چیخ اس لئے سنائی نہیں دی کہ اس عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ کے چیخ گھونٹ دی گئی تھی۔

اس ویرانے اور سناٹے میں کون تھا جو اس عورت کی مدد کرتا اور اسے بچاتا..... اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔

اسے گھوڑے اور ان کے سوار دکھائی دیئے [illegible] اسے اندازہ نہ ہو سکا..... کتنے گھوڑے اور سوار ہیں۔ [illegible] ہری پور کی جانب جا رہے تھے۔ ایک گھوڑے پر اس نے ایک عورت کو زرق برق لباس میں دیکھا جسے ایک سوار نے دبوچ رکھا تھا۔ اس کی کرخت آواز سنائی دی۔

"کمینی..... ! حرام زادی..... ! تو گلا کیوں پھاڑ رہی ہے..... یہاں تجھے بچانے کوئی اوتار بھی نہیں آئے گا....."

پھر اس نے ایک تھپڑ کی آواز سنی..... شاید مرد نے عورت کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے رک گئے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک گھوڑے سوار نے مشعل روشن کی۔ اس کی روشنی میں آکاش کو ایک چھوٹا سا سنہرا سا مندر درختوں کے درمیان دکھائی دیا۔ پھر پانچ عدد گھوڑے نظر آئے..... اتنے ہی گھوڑے سوار بھی..... ایک سوار نے لکیں گٹھری اٹھا رکھی تھی..... پھر اس نے غور سے دیکھا..... وہ گٹھری نہیں شاید عورت تھی۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی..... اس مرد کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی جس نے اسے دبوچ رکھا تھا۔

ان گھوڑوں پر سوار میں سے چار سوار اس لڑکی کو لے کر مندر کے داخلی راستے کی طرف بڑھے..... گھپ اندھیرے میں مشعل کی تیز روشنی نے چند لمحوں میں سب کچھ واضح کر دیا۔ ایک گھوڑ سوار ان گھوڑوں کی باگیں باندھ رہا تھا۔ پھر آکاش نے دیکھا کہ ایک قفس ایک گھوڑے کی پیٹھ پر بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا۔

جب وہ مندر کے اندر گھس گئے تو اندھیرا چھا گیا۔ البتہ مندر کے اندر سے روشنی کی ایک لکیر باہر آ رہی تھی۔ مندر کا مقام واضح کر رہی تھی۔ رہنمائی بھی.....

مندر اس سے فاصلے پر تھا..... چاروں طرف گھنے کیوں کہ سناٹے کا راج تھا۔ مندر کے اندر کونجنے والی نسوانی چیخوں کا سناٹی دینا خاصی دشوار تھا۔ اگر وہ چیخ سے مندر کی طرف دوڑ لگاتا تو اسے مندر تک پہنچنے میں بیس پچیس منٹ سے زیادہ ہی لگ جاتے۔ اسے ایک نہایت مدھم سی نسوانی چیخ سنائی دی جو بڑی مدھم سی تھی۔

آکاش کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے.....؟ اتنا تو سمجھ اور جان لیا تھا کہ بدمعاش ایک میاں بیوی کو کسی گھناؤنے مقصد سے اغوا کر کے مندر میں لے آئے ہیں۔ نہ صرف مرد بلکہ عورت کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔

پھر اسے خیال آیا تو اس نے بلند آواز میں پکارا۔

"چمپا.....! چمپا.....! تم کہاں ہو.....؟"

دوسرے ہی لمحے چمپا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آکاش اسے دیکھ کے حیران اور خوش ہو گیا۔ وہ اسے ناراض دکھائی نہیں دی۔ پھر بھی اسے منانے کی غرض سے اسے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے چہرے پر جھک گیا۔

دونوں دیر تک جذباتی کیفیت میں ڈوبے رہے۔ وہ اپنا سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"میری جان چمپا.....! کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو.....؟"

"میں اور تم سے ناراض.....؟" چمپا نے اس کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں حمائل کر کے کہا۔ "میں جس دن تم سے ناراض ہوئی وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"میں نے تمہیں طلب کیا تو آئیں کیوں نہیں....." آکاش شکایتی لہجے میں بولا۔ "میں سمجھا اس رات میں نے تمہاری ناقدری کی تھی شاید ناراض ہو گئی ہو.....؟ کیوں.....؟"

"میں رندھیر اور کرونا کو بھگت کے لوٹ رہی تھی مہر بٹہ مندر کے ایک پروہت نے مجھے دیکھ لیا تھا۔" وہ بتانے لگی۔ "اس سے جان بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر میں اسے انسانوں کے شہر کلکتہ لے گئی..... پھر میں نے اس کے ارمان پورے ہونے نہیں دیئے..... اسے موت کی بھینٹ چڑھا کے مگرمچھ کی غذا بنا دی..... میں نے تمہاری صدا سنی تھی۔ لیکن میں اس وقت آنے سے قاصر تھی..... مجبور تھی..... تم کچھ خیال مت کرنا..... تمہاری مجرم سامنے کھڑی ہے..... قصوروار ہے جو سزا دینا ہے دے لو۔"

آکاش نے مندر کی طرف اشارہ کر کے اسے سارا قصہ سنایا۔ "تم تو ورا معلوم کر کے تو آؤ۔"

چمپا اس کی نظروں سے غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد آ کے بولی۔

"وہ بستی نظر آ رہی ہے نا..... اس جاگیردار کا لڑکا اس بستی کی لڑکی موہنا سے شادی کرنا چاہتا تھا.....

کیوں کہ ایک نہری بدمعاش اور عیاش ہے..... کسی بھی نوجوان اور حسین لڑکی کی عزت اس سے محفوظ نہیں..... جس کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے اس کی شرط یہ ہوتی ہے کہ پہلی سہاگ رات لڑکی کا شوہر نہیں بلکہ وہ منائے گا..... ورنہ اسے بیوہ کردے گا..... موہنا اس بستی کی نہایت حسین اور نوجوان لڑکی ہے..... وہ دولہا دلہن کو منڈپ سے اٹھا کے مندر میں لے آیا ہے..... اس نے مندر کو عشرت کدہ بنا رکھا ہے..... یہ ہری پور مندر کہلاتا ہے..... دو سو برس سے ویران پڑا ہے..... اس لئے دو سو برس قبل یہاں پر کالا ناگ کا بسیرا تھا..... تب سے کوئی اس مندر میں گھسنے کی ہمت نہیں کرتا ہے..... وہ یہاں دلہنوں کو لا کے جاگیردار اور اس کے دوست، دلہن کو اجتماعی طور پر نشانہ بناتے ہیں۔"

"میں کس طرح ان کی عزت اور زندگی ان خون آشام بھیڑیوں سے بچا سکتا ہوں۔" آکاش بولا۔

"صرف ان کی ہی نہیں..... ہر دولہا دلہن کی..... ان کی جھولیوں میں سدا کے لئے خوشیاں بھر دوں..... ان درندوں کو موت کی نیند سلا دوں..... میں چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی ان معصوموں کی زندگیوں سے کھیلنے کی کوشش نہ کرے۔"

"میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے....." چمپا بولی۔ "انہیں معذور، اپاہج اور ناکارہ بنا کے..... ساری زندگی وہ عبرتناک گزاریں..... انہیں ان کے کئے کی سزا دی جائے۔"

وہ مندر میں پہنچا تو اکیلا تھا..... چمپا موجود تھی لیکن کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ آ سکتی تھی۔

یہ مندر کا سب سے بڑا کمرا تھا جس کے ایک کونے میں بہت بڑی مسہری تھی۔ موہنا کے دولہا کو ایک کرسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ دلہن موہنا مسہری پر رنگین ٹھری بنی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا۔

"ہمیں جانے دو....." وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ "ہماری خوشیاں نہ اجاڑو....."

"ہماری خوشی..... تمہارے ساتھ سہاگ رات منانے میں ہے....." جاگیردار کا بیٹا قہقہہ مار کے بولا۔

"بھگوان کے لئے دیا کرو....." وہ گڑگڑائی۔

"چلو..... نیچے اترو..... جاگیردار لڑکے نے کہا۔

"اپنے کپڑے اتارو....."

"نہیں..... نہیں....." وہ روتی ہوئی بولی۔ "مجھے جان سے مار دو..... میں ایسا نہیں کر سکتی....."

"تمہیں ایسا کرنا ہوگا....." جاگیردار لڑکا دہاڑا۔

"میں کوئی بے شرم یا طوائف نہیں ہوں جو تمہاری شرمناک بات مانوں....." دلہن خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"اگر تم نے میرا حکم نہیں مانا تو میں اور میرے ساتھی مل کر تمہارے کپڑے اتار دیں گے....." "جلدی کرو..... مجھے کام میں دیر نہ کرو..... ہم سب بے تاب ہو رہے ہیں۔ تمہارا خوب صورت بدن دیکھنے کے لئے....."

آکاش اس وقت ایک ہاتھ میں ہنٹر لئے کمرے میں آیا۔ جاگیردار اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھور کے دیکھا۔

"تم کون ہو.....؟" جاگیردار لڑکے نے غصے سے کہا۔ "اندر کیسے آئے.....؟ اور کیوں آئے ہو.....؟"

"میں ایک اجنبی مسافر ہوں۔" آکاش نے جواب دیا۔ "میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سنا کہ تم اپنی بہن سے کہہ رہے ہو کہ کپڑے اتارو..... اس لئے میں تمہاری بہن کو بے لباس دیکھنے آ گیا۔"

"یہ..... میری بہن نہیں بلکہ کسی اور کی..... دلہن ہے۔" جاگیردار کا پارہ چڑھ گیا۔ "کوئی اپنی بہن کو بے لباس کرتا ہے۔"

"بہن..... بہن ہوتی ہے..... چاہے وہ کسی کی کیوں نہ ہو....." آکاش نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی جو دلہن بنی بیٹھی ہے۔ یقیناً تمہاری بہن ہے..... تم کس قدر بے شرم، بے غیرت اور ذلیل آدمی ہو اپنی

بہن کو سب کے سامنے بے لباس کر رہے ہو۔"

"گوپی.....!" جاگیردار لڑکے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "اس ذلیل، کمینے کو مندر کے باہر لے جاؤ اور درخت سے باندھو۔"

گوپی اس کی طرف بڑھا تو آکاش نے فوراً ہی اپنا ہنٹر کھول کے فرش پر بڑے زور سے دے مارا۔

"اگر تم نے ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" آکاش نے غصے سے کہا۔

آکاش کے ہاتھ میں جو ہنٹر تھا وہ بڑا ہی خطرناک اور خوفناک اور کسی سانپ کی طرح پانچ فٹ لمبا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آدمی کے اوسان خطا ہو جائیں..... ان بدمعاشوں کے پاس ایسا کوئی ہتھیار نہیں تھا جس سے وہ مزاحمت کر سکیں۔ مقابلہ کر سکیں۔ وہ نہتے تھے..... آکاش کو دیکھ کے دولہا خوش ہو گیا تھا کہ ان کی مدد کے لئے آکاش جیسے کوئی اوتار آ گیا ہو۔

"تم کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو.....؟" جاگیردار لڑکا چیخا۔ "سب مل کے اس پر ٹوٹ پڑو اور ہنٹر کسی نہ کسی طرح چھین لو۔"

"یہ حماقت مت کرنا....." آکاش نے کہا۔ "میں اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ اس لئے کہ یہ میری بہن ہے..... میں اتنا بے غیرت، بزدل، ڈرپوک اور بے شرم نہیں ہوں کہ تم سب کے سامنے اسے جانور کی حالت میں دیکھوں..... کوئی بھائی اپنی بہن کو ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتا..... لہٰذا مجھے اسے لے جانے دو....."

"تم اپنی بہن کو کسی قیمت پر یہاں سے نہیں لے جا سکتے....." جاگیردار لڑکا تڑختے لہجے میں بولا۔ "ہم تمہیں قید کر دیں گے۔ تمہیں بھی اس دولہا کی طرح باندھ دیں گے..... ہم سب باری باری تمہاری بہن کے ساتھ سہاگ رات منائیں گے..... اس کا لباس اتار کے تمہارے منہ پر دے ماریں گے..... تم اپنی نوجوان اور حسین بہن کو بے لباس دیکھ کے خوش ہو گے! ہم اپنی حسرت اور ارمان پورے کرنے کے بعد تم تینوں کو خوشی خوشی جانے کی اجازت دیں گے..... ہاں اگر تم نے ہماری دھلائی اور مزاحمت دکھائی تو اس ہنٹر سے تمہاری درگت بنا کے صبح کسی کھائی میں پھینک دیں گے..... لاؤ..... یہ ہنٹر مجھے دے دو....."

"نہیں..... میں جان دے دوں گا لیکن میں یہ ہنٹر نہیں دوں گا اور نہ ہی تم لوگوں کی کوئی حسرت اور آرزو پوری ہونے دوں گا..... تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔" آکاش نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے ہیں۔" جاگیردار لڑکا بولا۔ "تماشا کیا دیکھ رہے ہو..... اس سے ہنٹر چھین لو..... ورنہ یہ غیرت مند بھائی ہم سب کو جان سے نہ مار دے گا....."

پھر جاگیردار لڑکا کے کہنے کے آدمی آکاش پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ آکاش نے فضا میں ہنٹر لہرایا تو اس کے ہاتھ سے ہنٹر چھوٹ کر فرش اور ان بدمعاشوں کے قریب جا گرا..... آکاش نے دانستہ یہ حرکت کی تھی۔

ہنٹر جیسے ہی فرش پر گرا ایک بدمعاش نے ہنٹر اٹھایا اور اپنے سردار کی طرف بڑھا۔

ہنٹر کو جاگیردار لڑکے نے چوما..... اس کے چہرے پر سفاکی اور اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کوندی.....

"اس کی مشکیں کس دو....." جاگیردار نے ہنٹر کو فرش پر مارا تو شوآپ کی آواز گونجی۔ "مجھے کام میں دیر ہو رہی ہے۔ انتظار اور صبر نہیں ہو رہا ہے..... یہ حرام زادہ آ گیا۔ ورنہ اب تک دل کے تمام ارمان پورے ہو چکے ہوتے۔

جاگیردار لڑکے کے ساتھی آکاش کو قابو میں کر کے اس کی مشکیں کسنے لگے تھے تو جاگیردار لڑکے نے دلہن کو مخاطب کیا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو.....؟"

دلہن جو گھٹنوں میں ابھی تک سر دیئے رو رہی تھی۔ اس نے اپنا سر نکال کے چہرے کا رخ دیوار کی طرف کر لیا ان میں سے کوئی بھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

"دھونی بھیا..... ! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے..... میں..... میں رنجنا ہوں..... تمہاری چھوٹی بہن....." وہ منت سماجت کرنے لگی۔ تم اپنی بہن کو بستر کی زینت بناؤ گے..... ؟ یہ تمہارے دوست بھی....."

دلہن نے گھونگھٹ میں چہرہ چھپالیا..... وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تو..... تو مجھے بے وقوف بنارہی ہے..... وہ ہنسا....." یہ ڈھونگ چھوڑ..... جلدی سے لباس نکال کے پھینک..... میں جبر زیادتی اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تو دلہن ہے..... ورنہ میرے آدمی تیرا شادی کا جوڑا چتھڑے کردیں گے....."

وہ مسیحی کے دوسری طرف اتر گئی۔ دھونی اور اس کے ساتھی مسہری کے اس طرف کھڑے اسے دیکھے جارہے تھے۔ اس کی پشت ان کی طرف تھی..... چوپا بھی ایک کونے میں نادیدہ ہستی بنی کھڑی آکاش کو دیکھ رہی تھی۔

پھر دلہن نے ایک ایک کرکے تمام کپڑے بدن سے جدا کرکے فرش پر پھینک دیئے اور پھوٹ پھوٹ کر روتی جارہی تھی۔ جب وہ تمام کپڑے اتار چکی اور تب آہستہ آہستہ دھونی کی طرف گھومی تو اس کے بدن پر ایک تار تک نہ تھا.....

"کیا بدن پایا ہے تو..... تو نے موہنا.....! جاگیردار کہنے لگا۔

یک لخت اس کی آواز حلق میں اس طرح اٹک گئی جیسے کوئی گولہ پھنس گیا ہو.....

وہ اور اس کے ساتھی زور سے اچھلے جیسے انہیں بجلی کا سنسنا دینے والا جھٹکا لگا ہو۔

"رنجنا.....؟" دھونی حیرت اور خوف سے اسے دیکھنے لگا۔ "میری بہن..... موہنا تو..... موہنا نہیں.....؟"

رنجنا سولہ برس کی دوشیزہ بے نیام تلوار کی طرح کھڑی تھی۔

"ڈیل..... کمینے..... پاپی.....! تیرے دل میں بڑی حسرت تھی..... مجھے بے لباس دیکھنے کی دیکھ..... خوب اچھی طرح دیکھ..... جی بھر کے دیکھ میں بستر پر لیٹ رہی ہوں....."

رنجنا شدت غم سے کہے جارہی تھی..... اس کی آواز بھرائی جارہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی..... نفرت، غصہ اور حقارت سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔

دھونی کو ایسا لگا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آن گری ہو اور اس پر سکتہ سا چھا گیا۔

دوسرے لمحے اس کا سر چکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ بھونچال سا آگیا ہو..... ہر چیز چکر کھاتی ڈول رہی ہو وہ کسی بھی لمحے چکر کھا کے گر جائے گا۔

اس نے اپنے ساتھی کا بازو نہ تھام لیا ہوتا تو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہوجاتا۔

وہ بے حس و حرکت اور منجمد کھڑا ہوا تھا۔ جب اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھند چھٹی تو دیکھا کہ اس کی بہن رنجنا فطری حالت میں بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ اس سے کہہ رہی ہے۔

"دھونی بھیا.....! کیا سوچ رہے ہو..... شبھ کام میں آخر دیر کس بات کی.....؟ اپنی بہن کی عزت کی دھجیاں نہیں اڑاؤ گے..... آؤ..... بستر پر آجاؤ..... آخر اس میں شرم اور جھجک کی کیا بات ہے..... تم نے تتلی دلہنوں کو پھول اور بلکیوں کی طرح مسل کے پھینکا..... آخر وہ بھی تو کسی کی بہنیں تھیں..... درندے کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے....."

دھونی کو ایک دم سے ہوش آگیا۔ اس کی بہن ساری دنیا کے سامنے بے نیام تلوار کی طرح نظر آرہی تھی..... وہ حیران اور پریشان تھا کہ اس نے موہنا کو منڈپ سے اٹھا کے دبوچ کے گھوڑے پر بٹھالیا تھا۔

گوپی نے دولہا کو اپنے گھوڑے پر..... لیکن موہنا کی جگہ اس کی بہن رنجنا کیسے آگئی.....؟ یہ کیا اسرار ہے.....؟

"گوپی.....!" دھونی پوری قوت سے چیخا۔ "رنجنا کا بدن کسی چادر سے ڈھک دو....."

"وہ کس لئے میرے پیارے بھیا.....! رنجنا نفرت اور حقارت سے بولی۔ "کیا تم اپنا پہنا پورا نہیں کروگے.....؟ ماتا پتا سنیں گے تو وہ کتنے خوش ہوں گے کہ ہمارا بیٹا..... کیسا سپوت نکلا..... اس نے کتنا نام روشن کیا۔"

"رنجنا تم جلدی سے کپڑے پہن لو..... باہر گھوڑے بندھے ہیں..... ایک گھوڑے پر سوار ہو کے گھر چلی جاؤ..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے..... میں پاگل ہوجاؤں گا....." دھونی نے سر پیٹ لیا۔

رنجنا چشم زدن میں بستر سے اتری۔ فرش سے اپنے بکھرے کپڑے سمیٹ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دھونی یا کسی اور نے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"گوپی.....! گوپی.....! دھونی بولا۔ "ہم نے موہنا کو اٹھایا تھا..... میں نے اسے اپنی آغوش میں دبوچ رکھا تھا..... وہ سارا راستہ میری گرفت سے نکلنے کی کوشش اور جدوجہد کرتی رہی تھی..... لیکن یہ موہنا سے رنجنا سے کیسے ہوگئی.....؟ تمہاری عقل کیا کام کررہی ہے.....؟"

"میں بتاتا ہوں کہ یہ سب کیا اسرار ہے.....؟" آکاش بولا۔ "میں نے تمہارے کرتوتوں کی سزا دی ہے..... تم نے کسی عورت اور کسی کی بہن کی عزت نہیں کی....."

"تم نے.....؟" دھونی اور اس کے ساتھیوں نے چونک کے آکاش کی شکل دیکھی۔

"ہاں میں نے....." آکاش نے سر ہلایا۔ "تمہیں سزا دینے کے لئے تمہاری بہن کو بے لباس کردیا..... تم دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کو عریاں کرتے رہے..... لیکن میں نے آج جی تمہاری بہن کو ساری دنیا کے سامنے اس لئے عریاں کردیا تا کہ تم جان سکو کے کہ ظلم کیا ہوتا ہے..... جیسی کرنی ویسی بھرنی....."

"لیکن میری بہن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔" وہ غرایا۔

"دوسروں کی بہنوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو انہیں بے حرمتی اور زندگی کا نشانہ بناتے رہے؟"

دھونی نے کوئی جواب نہیں دیا..... اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تھا۔ وہ لاجواب سا ہوگیا۔ اسے ایسا لگا کہ آکاش نے جیسے اس کے منہ پر تھوکا ہو..... ذلیل کیا ہو..... یہ کیا کم ذلالت تھی کہ اس کی نوجوان بہن کو نہ صرف اس نے بلکہ اس کے ساتھیوں اور اس ذلیل شخص نے بے پردہ حالت میں دیکھا۔

"دھونی.....!" اس کا ساتھی گوپی چیخ کے کہنے لگا۔ "یہ کمینہ..... ذلیل اور سور ہے..... اس نے اپنے جادو سے موہنا کو غائب کردیا اور رنجنا کو یہاں لے آیا تا کہ ہم سب اسے بے پردہ دیکھ لیں....."

"ہاں..... تم ٹھیک کہتے ہو....." دھونی بولا۔ "ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ پھر وہ آکاش کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"موہنا کہاں ہے.....؟ کیا تم نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے.....؟"

"ہاں..... وہ میری تحویل میں ہے۔"

"وہ کس لئے.....؟"

"اس لئے کہ اس پر تمہارا سایہ نہ پڑے..... آنچ نہ آئے....." آکاش نے جواب دیا۔

"دھونی....." گوپی فوراً بولا۔ "میں بتاؤں..... اس نے موہنا کو اس لئے چھپا رکھا ہے کہ تمہارے ہمارے جانے کے بعد اس کے شوہر کو جان سے مار کے اس کے ساتھ وقت گزاری کرے..... اس سے کھیلتا رہے..... جی بھرنے کے بعد پھر رنجنا سے فائدہ اٹھائے..... میرے خیال میں رنجنا بھی مندر میں کہیں چھپی ہوگی..... کیوں کہ ہم سب نے اسے جس عالم میں دیکھا ہے وہ گھر جانے سے رہی..... وہ دنیا کو کیا منہ دکھائے گی..... ؟ یہ بدمعاش ایک تیر سے دو شکار کررہا ہے..... یہ دو منہ کا سانپ ہے۔ اس موذی کو مارو....."

"میں نے موہنا کو بہن کہا ہے۔" آکاش کہنے لگا۔ "میں اسے ایک بھائی کی طرح اس کی ڈولی سسرال پہنچاؤں گا عزت سے..... اب تم اس کا خیال دل سے نکال دو..... وہ اس شریف آدمی کی امانت ہے..... خوشی ہے..... رنجنا کی جو تم بے عزتی کی اب تم اس قابل نہیں رہے کہ اپنے گھر جاؤ..... تمھیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرجانا چاہئے..... اب کیا تم اس قابل ہو کہ اسے اور دنیا والوں کو منہ دکھا سکو....."

"میں کہتا ہوں کہ تم موہنا کو میرے حوالے کردو....." دھونی نے کہا۔ "پھر میں رنجنا کو سمجھادوں گا کہ میں چوں کہ شراب کے نشے میں دھت تھا اس لئے کسی بات کی تمیز نہ رکھ سکا تھا۔ اس سے معافی مانگ لوں گا۔"

"میں کسی قیمت پر موہنا کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔" آکاش نے جواب دیا۔ "تمہاری بہن ایک معصوم لڑکی ہے۔ سولہ برس کی دوشیزہ..... تم گھر جاؤ گے تو وہ خودکشی کرلے گی یا پھر تمہیں قتل کردے گی..... تم عورت کو کیا سمجھو....."

"گوپی.....! ہنٹر دو....." وہ غضب ناک ہو کے بولا۔ "پہلے میں اس موذی کا سر کچل دوں..... پھر اس موہنا کے شوہر کا..... پھر ہم موہنا اور رنجنا کو تلاش کریں گے....."

دھونی یہ سمجھا کہ اس کے ہاتھ میں ہنٹر دیکھ کے اس کے نہ صرف اوسان خطا ہوجائیں گے بلکہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ بس وہ غصہ کھا کے گرنے والا ہے۔

پھر ان چاروں بدمعاشوں نے آکاش کو دونوں طرف سے پکڑ کے اسے کمرے کے وسط میں کھڑا کردیا تاکہ دھونی اسے اتنا مارے کہ سر سے بھوت اتر جائے۔ اس کے ساتھی آکاش کو زخمی نہ کرنے میں لئے ہوئے تھے۔

دھونی ہنٹر لہرانا اور فرش پر زور زور سے مارتا ہوا آکاش کے مقابل کھڑا ہوگیا..... پھر وہ آکاش کی آنکھوں میں قہر آلود نظروں سے جھانکنے لگا۔ وہ کسی جلاد کی طرح لگ رہا تھا۔

دھونی اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ آکاش قدموں میں گر پڑے گا..... اس کا دماغ درست ہوجائے گا..... صرف ہنٹر کی ایک ضرب کھانے کی دیر ہوگی وہ صرف موہنا بلکہ رنجنا کے بارے میں بھی بتادے گا۔

یہ دیکھ کے ان سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور انہیں اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ آکاش خوف زدہ اور ہراساں ہونے کے بجائے بڑے سکون اور بے خوفی سے کھڑا ہوا ہے۔ جیسے اسے کسی کی پروا ہے اور نہ ڈر.....

"تم شرافت سے ان دونوں کا ٹھکانہ بتادو کہ اس وقت کہاں ہیں؟" وہ دانت پیس کے بولا۔ "ورنہ....."

"ورنہ کیا.....؟" آکاش نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ورنہ یہ سمجھو کہ میں تمہیں موت کی بھینٹ چڑھادوں گا۔ تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

"میں ان دونوں میں سے صرف ایک لڑکی تمہارے حوالے کرسکتا ہوں؟ تم کس لڑکی کی بات کررہے ہو.....؟"

"موہنا کی....." دھونی نے جواب دیا۔

"رنجنا کا کیا کروں.....؟"

"اسے اس کے گھر جانے دو....."

"میں موہنا کو تمہارے حوالے کسی صورت میں نہیں کروں گا..... اس لئے کہ وہ دلہن ہے..... اس کی آج ہی شادی ہوئی ہے..... اور تم نے اسے اغوا کرلیا..... جانتے ہو ایک عورت کے لئے اس کی زندگی میں سہاگ رات نا قابل فراموش اور یادگار بن جاتی ہے..... تم اس پر دیا کرو..... اسے اپنے پتی کے ساتھ جانے دو..... اس غریب پر ایسا ظلم نہ کرو کہ....."

"ایسا کیوں نہیں کرتے....." آکاش نے تجویز پیش کی۔ "تم رات موہنا کے ساتھ گزارو..... تمہارے دوست رنجنا کے ساتھ اس طرح حساب برابر..... کیوں..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟ تمہاری بہن تمہارے دوستوں کی

سیوا کرتی رہے گی.....! کیا خیال ہے؟"

"کیا بکتا ہے ذلیل کمینے..... میں اپنی بہن کو ان کے حوالے کردوں..... نہیں ہرگز نہیں..... میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

"اس میں طیش میں آنے کی کیا بات ہے.....؟ جب تم دوسروں کی بہنوں کو اپنے بستر کی زینت بناتے ہو تو تمہاری بہن کو بھی کوئی بھی بنالے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟"

"اب تو ایسا کر کہ رنجنا کو جانے دے اور موہنا کو لے آ..... رنجنا کہاں ہے.....؟" وہ گرجا۔

"رنجنا کو تو نے جس عالم میں دیکھا یاد ہے نا..... وہ کپڑے پہننے کے بجائے فرش سے سمٹ کے باہر نکلی..... رنجنا کا آشنا جو آیا تھا وہ باہر کھڑا ہوا تھا..... وہ رنجنا کو ایک قریبی غار میں لے گیا ہے جہاں وہ ایک کمرے کی طرح ہے..... اس غار کو رنجنا کے آشنا نے خواب گاہ بنا رکھا ہے۔ جس میں تفریح اور ضرورت کی ہر چیز موجود ہے..... اب وہ اس کے ساتھ سہاگ رات منا رہی ہے..... یہ غار ان کا عشرت کدہ اور رنگ رلیاں منانے کی جگہ ہے..... وہ دونوں ہر پونم کی رات یہاں آتے ہیں..... تجھے میری بات کا یقین نہیں تو چل کے دیکھ لے....."

دھونی آپے سے باہر ہوگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے آکاش نے اس کے وجود پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے ہوں۔

"اچھا تو بتا کہ موہنا کہاں ہے.....؟" دھونی غرایا۔ "پہلے میں موہنا سے ارمان پورے کروں گا..... پھر رنجنا کی خبر لوں گا..... تو نے موہنا کو حاضر کردیا تو میں تجھے معاف کردوں گا....."

"اگر یہ بات ہے تو میں موہنا کا پتا بتاتا ہوں۔" آکاش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "وہ مندر کے تہہ خانے میں موجود ہے۔ کسی کو بھیج کے اسے بلالو..... لیکن تم اپنا وعدہ ضرور پورا کرنا....."

دھونی نے گوپی اور ایک اور ساتھی کو بھیج دیا۔ گوپی ایک اور مشعل لے کر موہنا کو لانے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں موہنا کو ساتھ لیتے آئے۔ موہنا عروسی لباس میں تھی۔

وہ آئی تو کمرے میں ایسا لگا کہ چودھویں کا چاند زمین پر اتر آیا ہو۔

وہ دلہن کے روپ میں اتنی حسین اور پیاری لگ رہی تھی کہ کبھی اسے سحور ہو کے دیکھنے لگے۔

وہ آکاش سے اتری ہوئی کسی دیوی کی طرح لگ رہی تھی..... دھونی کی زندگی میں کبھی اتنی حسین دلہن لڑکی نہیں آئی تھی۔

اس کا دولہا کرسی پر بے بسی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اور اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں وہ موہنا کو دیکھتے ہی تڑپ اٹھا اور بولا۔

"میری جان موہنا.....! ادھر آؤ.....! میرے پاس۔"

موہنا نے ان دونوں بدمعاشوں کی گرفت سے اپنے بازو چھڑانے اور انہیں اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور دیوار سے اس بری طرح ٹکرائے ان کی کھوپڑیاں بج اٹھیں۔

موہنا کا شوہر جو کرسی پر کسمسا رہا تھا موہنا اسے دیکھ کے اس کی طرف دیوانہ وار لپکی۔ "میرے دیوتا.....! میری جان..... او بھگوان..... ان ظالموں نے تمہیں کس حال میں رکھا ہے..... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے.....؟"

دھونی فوراً ہی اس کی راہ میں حائل ہوگیا اور اس کی بانہہ پکڑلی۔

"سنو..... آج کی رات تم میری اور میرے دوستوں کی دلہن ہو..... صبح تک..... تمہاری ہم سب سیوا کرتے رہیں گے..... یقین کرو اتنی خوش ہوجاؤ گی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو؟ تصور بھی نہیں کرسکتی.....؟"

دھونی نے اتنا کہہ کے اسے اپنی آغوش میں لے کے چومنا چاہا تو موہنا نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا مسہری سے ٹکرا کے فرش پر گر گیا۔

"تو نے کیا مجھے اپنی بہن سمجھ رکھا ہے..... تیری ماں تو ایسی نہیں ہے....."

اتنا کہہ کے وہ اپنے چچی کے پاس پہنچی تاکہ اس کی مشکیں کھول دے..... دھونی نے بجلی کی سی سرعت سے کھڑے ہو کے اس کی چوٹی پکڑلی اور اپنی طرف کھینچا..... اس کے چہرے پر جھک گیا اور وحشیانہ طور پر چومنے لگا۔

موہنا اسے چند لمحوں تک خود سپردگی سے من مانی کرنے کا موقع دیتی رہی۔ پھر دوسرے لمحے وہ فرش پر گرے کے مانگی بے آب کی طرح درد سے تڑپنے اور موہنا کو غلیظ گالیاں بکنے لگا۔

موہنا نے اس کے جسم کے سب سے نازک حصے پر گھٹنہ دے مارا تھا۔ درد اور تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ پھر وہ چیخ کے گوپی سے بولا۔

"اس کمینی کو پکڑلو..... میں اسے ابھی مزا چکھاتا ہوں....."

گوپی اور ساتھیوں نے فوراً ہی لپک کے موہنا کی بانہیں پکڑ کے اسے قابو میں کرلیا۔ لیکن وہ پھر مسلسل جدوجہد اور مزاحمت کرنے لگی تاکہ وہ اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہوسکے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکی۔

اس دوران دھونی سنبھل کے کھڑا ہوگیا۔ جب وہ موہنا کے سامنے آیا تو اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا..... چہرے پر سفاکی تھی اور آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی..... آنکھوں میں خون اتر آیا تھا.....

"کمینی..... تیری یہ مجال کے تو نے میری جان لینے کی کوشش کی..... کتیا کہیں کی..... دیکھ..... تیرے پتی کے سامنے تیری کیسی فلم چلاتا ہوں....."

اتنا کہہ کے اس نے موہنا کے گریبان میں ہاتھ ڈال کے اسے پھاڑ دیا..... پھر اسے لباس سے بے نیاز کردیا..... پھر ہنٹر فضا میں لہراتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔

"سیدھی طرح تو بستر پر لیٹ جا..... ورنہ میں ہنٹر سے تیری کھال ادھیڑ دوں گا....."

موہنا کے ہاتھ میں ہنٹر دیکھ کے کانپ گئی..... سہم گئی..... پھر وہ خاموشی سے بستر پر دراز ہوگئی۔ وہ سب کے سامنے فطری حالت میں ایسی تھی جیسے ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

پھر وہ بستر پر آ گیا۔ پھر اس کے چہرے پر جھک گیا..... چند لمحوں کے بعد اس نے دہشت زدہ ہو کے ایک چیخ ماری اور اس نے اپنا جو بوجھ موہنا پر ڈال رکھا تھا اس طرح ہٹالیا تڑپ کے..... جیسے موہنا کا بدن انگاروں کی سیج ہو۔

اب بستر پر موہنا نہیں تھی..... اس کی جگہ ایک بھیانک، خوفناک اور کروہ شکل کی چڑیل دراز تھی..... جب دھونی بستر سے اترنے لگا تو اس عفریت نے اس کے سر کے بال پکڑ لئے۔

"کہاں جارہے ہو..... میرے دیوتا..... ! پتی سمان..... ! کیا مجھ سے محبت بھری باتیں نہیں کرو گے..... مجھے پیار نہیں کرو گے..... دیکھو..... میرے ہونٹ کتنے خوب صورت ہیں.....؟ یہ کتنے رسیلے ہیں.....؟ اس کی ساری مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کرلو..... یہ میرا گداز اور رسیلا بدن....."

دھونی نے چاہا کہ اپنے بال چھڑا کے بھاگ جائے..... لیکن اس عفریت نے دھونی کو اپنی آغوش میں لے لیا..... پھر وہ اسے بے تحاشا چومنے اور من مانیاں کرنے لگی..... دھونی نے اپنا پورا زور..... اپنی پوری طاقت جمع کر کے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہر کوشش اور جدوجہد ناکام رہی۔

وہ بری طرح تڑپ رہا تھا..... کیوں اس عفریت کے لمبے لمبے نوکیلے دانت اس کی گردن میں پیوست ہو کے خون پی رہے تھے..... اس کے ناخنوں نے دھونی کا سارا جسم لہولہان کردیا تھا..... اس کے تمام ساتھی بے حرکت مورتیوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں تھی کہ ہل سکیں بھاگ جائیں..... ان کی رگوں میں لہو منجمد ہو چکا تھا۔ عفریت نے کہا۔

"تم اور تمہارے ساتھیوں نے نجانے کتنی دلہنوں کو اغوا کر کے سہاگ راتیں منائیں..... ان کی خوشیاں اور عزتیں تباہ کردیں..... ان پر ذرہ برابر بھی رحم نہیں کھایا..... ان میں سے کتنی دلہنوں نے خودکشی کرلیں..... تم سب ان کے قاتل ہو..... دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر بچتے رہے..... جب کہ تمہاری سزا موت تھی..... دس برسوں سے بچتے رہے..... لیکن آج سچ کے دکھاؤ..... میں دیکھتی ہوں..... آج تمہیں کون بچاتا ہے.....؟ تمہارا پیسہ یا اثر و رسوخ....."

پھر اس عفریت نے دونوں ہاتھوں سے دھونی کو اس طرح سے اٹھایا جیسے وہ پلاسٹک کا گڈا ہو۔ پھر اسے سامنے والی دیوار پر دے مارا..... پھر بجلی کی سی سرعت سے ہنٹر اٹھالیا..... آکاش اور دولہا کے سوا ان چاروں کی درگت بنانے لگی۔ اور انہیں لہولہان کردیا..... وہ چیختے چلاتے مندر سے نکلے..... جس سمت منہ اٹھا ادھر بھاگے.....

تھوڑی دیر بعد وہ پانچوں اپنے انجام اور کیفر کردار کو پہنچ گئے۔

دھونی پہاڑی سے پھسل کے گہری کھائی میں گرا تو اس کی سوا گت کے لئے موت منہ کھولے کھڑی تھی۔

گوپی خاردار جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اسے گھپ اندھیرے کے باعث جھاڑیاں نظر نہ آسکیں..... کانٹے اس کی آنکھوں میں گھس گئے۔ وہ اندھا ہوگیا۔ آنکھیں پھوٹ گئی تھیں خون بہنے لگا۔ چہرہ اور جسم لہولہان ہوگیا۔ وہ تینوں دلدل میں گر گئے..... مدد کے لئے چلاتے رہے تھے..... پھر ان تمام کو ان سہاگ راتوں کے منظر یاد آئے تھے جب دلہنیں ان سے منت سماجت کرتی اور مدد کے لئے پکارتی تھیں تو وہ ان پر ہنستے تھے..... لیکن آج ان پر موت ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جب عفریت ان کے تعاقب میں نکل گئی تو آکاش نے موہنا کے شوہر کی مشکیں کھولیں جو عفریت کو دیکھ کے بے ہوش ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چمپا ہنستی مسکراتی ہوئی موہنا دوڑ کے اپنے پتی سے لپٹ گئی۔

آکاش نے انہیں بڑی سنجیدگی سے سمجھایا۔

"تم دونوں نے جو کچھ دیکھا اسے ایک ڈراؤنا سپنا سمجھ کے بھول جانا..... اس کا کسی سے ذکر نہ کرنا..... ورنہ دھونی کا باپ جو بڑا ظالم اور سنگ دل ہے وہ تم دونوں کو ان کے قتل کے الزام میں پھانسی پر چڑھادے گا..... اور اس راز اور واقعہ کو اپنے اپنے سینے میں دفن رکھنا....."

"لیکن رہنجا تو اپنے گھر والوں کو بتادے گی؟" موہنا بولی۔

"وہ رہنجا نہیں تھی..... چمپا تھی..... یہ سب ناٹک تھا..... رہنجا بدکردار بھائی کی اچھی اور پاک باز بہن ہے..... وہ اس وقت اچھے گھر میں میٹھی نیند سو رہی ہوگی۔"

"اسے بھائی کی موت کا جب پتا چلے گا تو کیا صدمہ اسے اس کا برا حال نہیں ہوگا؟"

"نہیں....." چمپا نے سر ہلایا۔ "اس لئے اسے اپنے بدکردار بھائی سے سخت نفرت تھی۔ کیوں کہ عورت ذات ہونے کے ناتے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی اس کا بھائی معصوم اور نوجوان لڑکیوں کی زندگیاں اور خوشیاں تباہ کررہا ہے۔"

"چلو..... ہم تم دونوں کو تمہارے گھر پہنچادیں تاکہ ایک نئے جیون سفر کا آغاز کرو۔" آکاش نے کہا۔

آکاش اور چمپا، موہنا اور اس کے شوہر کو ان کے گھر پہنچا کے مندر آئے تو گہرا خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

چمپا نے آکاش کو تحکمی نظروں سے دیکھا۔ "اب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کون سا خیال.....؟" آکاش نے انجان بن کے پوچھا۔

آکاش نے دیکھا کہ چمپا نے چشم زدن میں دلہن کا بہروپ بھرا اور وہ اس قدر حسین لگی کہ اسے اپنے اور جذبات پر اختیار نہ رہا۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا تو چمپا اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ چمپا دلہن کے

بہروپ میں اس قدر حسین لگی کہ وہ تصور نہیں کرسکتا تھا۔ وہ دونوں پو پھٹنے تک جاگتے اور عشق و محبت کی باتیں کرتے رہے۔

ناشتے سے فراغت پانے کے بعد چمپا نے کہا۔

"میں نیلم کے کھوج اور ٹھکانے کی تلاش میں جارہی ہوں..... تم میرا مندر میں انتظار کرنا..... مجھے واپسی میں ایک گھنٹہ، ایک دن اور ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے..... تم یہاں سے ہلنا نہیں..... میرا انتظار کرنا..... کیوں کہ میں جس مہم پر جارہی ہوں وہ بڑی کٹھن، خطرناک اور دشوار ترین ہے..... اس لئے کہ شنکر سوامی کی نظروں سے بچنا ہے..... اس لئے مجھے بہت محتاط رہنا اور پھونک پھونک کے قدم رکھنا ہوگا..... وہ خون آشام بھیڑیا ہے..... میں اس کی نظروں اور قابو میں آگئی تو جانے کتنے دنوں تک وہ گدھ بنا رہے گا..... صبر اور تحمل سے رہنا۔"

"میں اتنے دنوں تک بھوکا پیاسا رہوں گا.....؟" آکاش نے کہا۔"ایک قیدی کی طرح.....؟"

"سنو....." چمپا کہنے لگی۔"تم کھانے پینے کی چنتا نہ کرو۔ تہہ خانے کے پاس رسوئی ہے۔ اس میں چولہا بھی ہے..... میں تمہارے لئے نہ صرف خشک دودھ..... چائے پتی کے علاوہ کھانے کی خشک چیزیں..... بسکٹ وغیرہ رکھ جاؤں گی۔ وہ اتنی وافر مقدار میں پندرہ بیس آدمیوں کے لئے ہفتہ بھر نہیں بلکہ دو تین ماہ تک ختم نہ ہوں گی۔"

"لیکن میں اپنی بوریت کس طرح دور کروں گا.....؟" اس نے چمپا کو بازوؤں میں قید کرلیا۔"دن اور رات میں دو ایک گھڑی کے لئے آجایا کرجب تک کھوج نہ لگ جاتا۔"

آکاش لمحے کے لئے دل میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ یہ عشق بھی کیا شے ہے.....؟ بے ربط خیالات کا ہجوم بڑھنے لگا۔ یہ آگ کیسی ہوتی ہے.....؟ اسے دنیا میں صرف اور صرف نیلم سے محبت تھی..... اس کی زندگی میں جو ناگن عورتیں لڑکیاں اس نے ان سے صرف اور صرف اپنے مفاد اور غرض سے عشق کیا تھا..... اس کا بھی یہ خیال تھا کہ انہوں نے بھی اس سے اپنی ہونا کی پوری کرنے کی غرض سے عشق کیا اور عشق کررہی تھی..... اور کررہی ہیں..... پدما، سجاتا اور جانے کون کون اور گلابی ناگن امرتا..... اور پھر چمپا..... اب اسے اندازہ ہورہا تھا کہ ان کا جذبہ عشق سچا ہے..... اس میں کوئی کھوٹ اور تصنع نہیں..... غرض اور ہوس نہیں.....

کیا حیوان مادہ بھی انسان سے سچی محبت کرسکتی ہے؟ ان کے جذبات اور احساسات بھی..... انسانوں کی طرح ہوتے ہیں؟ ہیناگن اس سے اس لئے محبت کرنے لگی تھیں کہ وہ ایک تصوراتی محبوب کی طرح ہے.....

صرف ان جانوروں میں جو خصوصیت ہے وہ اور کسی حیوان میں نہیں ہے.....

ان کے ناگ دیوتا..... ان ناگوں اور ناگنوں کو ان کی صدیوں کی سیوا کے کارن انہیں نہ صرف انسان، زبان، جادو، شکتی اور سوجھ بوجھ اور پیار و محبت اور انتقام کے جذبات بھی دیئے تھے..... حسد و جلن بھی اور صدیوں کی لمبی عمر بھی..... اور پھر ان کی اپنی دیا تھی..... جس میں نسل در نسل ان کا جنم ہوتا آرہا تھا..... ناگ دیوتا جتنے تھے اتنے ہی ناگنیں بھی تھیں..... انسان ان کے آگے بے بس تھا تو ان سے کہیں طاقت ور..... صلاحیت جادو اور ذہانت سے انہیں زیر کرتا آرہا تھا..... اس کے باوجود وہ انسان سے جیت نہیں پاتے تھے..... انسان سے اتنا ہی ڈرتے تھے اور خائف بھی تھے..... صرف وہ اور ہر خطرناک سے خطرناک اور خوفناک کہ درندہ اور حیوان انسانوں سے خطرناک کہ اس کرہ ارض پر نہیں.....

ان کی بستی پر بڑے سے بڑے اور خطرناک جانور بستے تھے..... انہوں نے ان موذی جانوروں کو طاعۃ کیا ہوا تھا..... ان میں ناگنیں انسانی روپ میں بھی نظر آتی تھیں..... وہ لڑکیوں اور عورتوں کو انسانی آبادیوں سے لاتے تھے تاکہ انہیں اپنی ملکیت بنالیں..... پھر کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی تھی کہ وہ حسن و شباب کے آگے بے بس

ہو کے تسخیر نہیں کرپاتے تھے.....

اس نے چمپا کے چہرے پر جھک کے اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتے ہوئے آنسو کے اس قطرے کو اپنے ہونٹوں میں جذب کرلیا جو اس کی آنکھ سے ڈھلک کے رخسار پر کسی نگینے کی طرح دمک اور قمر ہا تھا۔

"چمپا.....! نیلم کو پالینے کے بعد بھی تمہارا عشق سرد نہیں پڑے گا..... تم گلابی امرتا اور پدما سے بھی عشق کروں گا..... عشق جو ہوتا ہے وہ صرف جسمانی ملاپ کا نام نہیں بلکہ آتماؤں کا ملن ہوتا ہے..... عشق تو وہم میلا نہیں کریں گے..... آلودہ نہیں کریں گے..... جذبوں کا نام عشق ہوگا....."

"ہمارے ہاں ناگوں، سانپوں اور ناگنوں کو اس بات کی اجازت اور آزادی ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف دیوتاؤں، ناگوں اور سانپوں سے آزادانہ میل جول رکھیں..... انسانوں میں نہیں..... لیکن اس کے باوجود تمہاری دنیا میں بڑی برائیاں، بدکاریاں اور ہر جائی پن ہے..... دیکھا جائے تو تمہاری دنیا کالی دنیا ہے....."

"ہاں..... مجھے اس کا اعتراف ہے۔" آکاش نے اعتراف کیا۔"آدمی جتنا اچھا ہے اتنا ہی برا بھی....."

بتاؤ کس عمر کی سندرتا چاہئے۔"

"نہیں چمپا.....!" آکاش اس کی محبت اور جذبہ سے متاثر ہو کے اس کے چہرے پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز رہا اور اس کی آنکھوں میں ڈوبتا رہا..... پھر بولا۔

"اب تم جاؤ جس مشن پر جارہی ہو اور اپنی چنتا کرو....."

"ایک لڑکی جو کہ بہت حسین..... سندر، موہنی اور نوخیز ہے کہ تم خود کو قابو میں نہ رکھ سکو گے..... آج تک کسی ناگ سانپ اور انسان نے اسے ہاتھ نہیں لگایا..... وہ تمہاری پوجا کرتی ہے..... وہ تمہاری پرستار ہے..... وہ تم سے ٹوٹ کے عشق کرتی ہے..... تمہارے عشق نے اسے پاگل کیا ہوا ہے..... اگر امرتا نامی گلابی ناگن نے اسے روکا ہوا نہ ہوتا تو نہ جانے وہ کب کی تمہاری آغوش میں سما چکی ہوتی....."

"کیا میری پرستار اور عاشق.....؟" آکاش نے چونک کے حیرت سے پوچھا۔

"کالی دنیا کی صرف ایک کسم نہیں بلکہ کتنی اور ناگنیں تم سے عشق کرتی ہیں..... تمہیں چشم تصور میں دیکھ کے آہیں بھرتی ہیں..... تمہارے حصول کے لئے تڑپتی ہیں..... آج سے نہیں ایک صدی سے..... جب انہیں تمہارے بارے میں پدما سے معلوم ہوا تو انہوں نے تمہیں دیکھا تھا..... پدما نے حسد و جلن کی وجہ سے تمہیں اور نیلم کو زہر کھانے پر مجبور کیا۔ جب ایک صدی کے بعد تم اور نیلم نے جنم لیا تو پدما نے تم دونوں کو جدا کردیا اور کالی دنیا میں قیدی بنادیا....."

چمپا نے کسم کے حسن و شباب کی بڑی تعریف کی تھی۔ لیکن آکاش، کسم سے دل بہلانے کے موڈ میں تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کررہا تھا..... اس لئے نیلم اب اس سے زیادہ دور نہ تھی..... وہ کالی دنیا اور مرہٹہ مندر کے قریب پہنچ چکا تھا..... ادھر چمپا گلابی ناگن رانی کی خبر لینے گئی ہوئی تھی۔ اب اسے چمپا کا انتظار کرنا تھا۔

وہ چمپا کے جانے کے بعد بستر پر دراز ہوگیا..... اس لئے اسے بڑے زور کی نیند آرہی تھی۔

اس گہری نیند میں اس نے نیلم کا پسند دیکھا..... وہ کہہ رہی تھی..... "آکاش.....! تم میرے اتنے قریب پہنچ کے بھی مجھ سے سینکڑوں میل دور ہوگئے ہو..... آؤ میرے میت..... میں تمہارے لئے تڑپ رہی ہوں..... بھگوان کے لئے مجھے یہاں سے نکال کے لے جاؤ..... میں اب تمہاری جدائی کا لمحہ برداشت نہیں کرسکتی....."

اس نے نیلم کو سپنے میں بہت ہی اداس، پریشان اور غم زدہ دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کے آکاش کے دل پر چوٹ لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کا سینہ اندر ہی اندر کٹ رہا ہو..... جیسے کسی نے چاقو کاٹ دیا ہو..... وہ تڑپ سا گیا اور ایک دم سے

ہڑبڑا کے بیدار ہوگیا۔

چمپا نے اور امرتا نے گلابی ناگن رانی نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس منکہ کی اپنی جان سے کہیں زیادہ حفاظت کرے..... یہ ایک ایسا اور غیر معمولی منکہ ہے جو ہر کسی سانپ، ناگ دیوتا اور ناگن رانیوں کے پاس بھی نہیں ہوتا ہے..... اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس کے پاس یہ منکہ ہوگا اس پر کوئی جادو اثر نہیں کرسکتا..... مہلک سے مہلک زخم اور گھاؤ بھی بھر جاتے ہیں تو پھر اسے امرتا یا چمپا کا انتظار کیوں اور کس لئے.....؟

پھر آکاش اس مہم پر چمپا کا انتظار کئے بغیر ہی روانہ ہونے والا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ کوئی نادیدہ، بے حد پراسرار اور ڈراؤنی حقیقت اسے قدم بڑھانے سے روک رہی ہے..... اس کے پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال رہی ہے..... لیکن وہ رکا نہیں اس کے عزم و حوصلے کے آگے وہ پاش پاش ہوکر رہ گیا۔

ایک طویل مسافت تھی۔ اس وقت سورج تپش دکھا رہا تھا۔ لیکن اسے موسم کی قطعی پروا نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کی راہ میں حائل ہوسکتی تھی..... قدم قدم پر جیسا کہ اس نے سنا تھا کہ سانپ، ناگ اور اژدھوں سے بھی واسطہ پڑے گا..... ندی کنارے بہت سی کٹائیں ویران پڑی تھیں اور ان میں کوئی نہ کوئی عورت، مرد اور خوں خوار جانور اور عفریت بھی ہوگی..... اس نے تین میل کی مسافت طے کی تھی کہ اسے سخت پیاس لگی۔ ندی کنارے اسے ایک کٹیا دکھائی دی..... لیکن وہ اپنی پیاس بجھانے کی طرف بڑھا تو اس کی نگاہ کٹیا کے اندر گئی۔ اسے دروازے پر ایک گٹھڑا نظر آیا جس کے ڈھکن پر مٹی کا ایک پیالہ رکھا تھا۔

وہ کٹیا کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک عورت کی درد ناک التجائیں سنیں وہ کہہ رہی تھی۔

"مجھ پر رحم کرو..... میری زندگی اور عزت سے نہ کھیلو..... میں تمہاری کوئی بات نہیں مان سکتی..... اپنی جان دے دوں گی..... ذلیل، کمینے..... کتے کی اولاد..... مکار..... فریبی..... تو میری دولت اور عزت لوٹنے کے لئے میری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے.....؟"

عورت کے الفاظ بے ربط..... نفرت اور غصے اور حقارت سے بھرے ہوئے تھے۔

چند لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا..... پھر نسوانی آواز بڑبڑاہٹ کے انداز سے چیخنے لگی۔

"بچاؤ..... یہ میرا خزانہ لوٹ کے لے جانا چاہتا ہے..... میں یہ خزانہ مرہٹہ مندر سے لائی تھی۔"

دوسرے لمحے آکاش اس کٹیا میں گھس گیا جو ایک مکان کی طرح اندر سے کشادہ اور مضبوط دیوتی تھی..... وہ دہلیز پر ٹھٹک کے رک گیا۔ وہ مرد اور عورت اس کی نظروں کے سامنے تھے۔

ایک چوڑے چکلے مرد نے ایک عورت کو ایک عقاب کی طرح عورت کو بے بس کر کے قابو میں کیا ہوا تھا..... عورت اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی اور اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد اور مزاحمت کر رہی تھی..... وہ ایک نازک سی سہمی ہوئی پرندہ سی دکھائی دیتی تھی۔

اس عورت کا چہرہ دکھائی نہ دیا کیوں کہ مرد اس پر جھکا ہوا تھا اور من مانیاں کر رہا تھا۔ صرف اس کے ہاتھ پیر دکھائی دیتے وہ اپنا زور لگا رہی تھی..... نہ صرف وہ لاتیں چلا رہی تھی بلکہ مرد کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑے کھینچ رہی تھی۔ جس کا مرد پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ قہقہے مار کے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میری کبوتری..... آج تو میرے ہاتھ سے کسی قیمت پر بچ نہ سکے گی..... تو کتنے دنوں کے بعد میرے ہاتھ لگی..... تو اور تیری دولت ہاتھ کی ہے..... کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میں یہ شکار ہاتھ سے جانے دے دوں گا..... سن احمق عورت..... ! تو ایک کم زور عورت ہے..... اس ویرانے میں تیری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے..... تیری مدد کو آکاش سے اشور آنے والا

ہے..... دیکھ سمجھ داری کا تقاضا تو یہی ہے کہ تو اپنے آپ کو میرے حوالے کردے..... پھر یہ جو خزانہ تو مندر سے لائی ہے..... مجھے دے دے ورنہ میں نہ صرف تیری جان لے لوں گا بلکہ خزانہ بھی لیتا جاؤں گا....."

معاً آکاش کی نگاہ ایک کونے میں پڑی تو اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں..... وہاں موتیوں، ہیرے جواہرات کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ ایک من وزن سے کم نہیں ہوگا..... ہیرے چمک رہے تھے..... اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے..... آکاش نے خواب میں بھی ایسا انمول، بیش قیمت اور نایاب خزانہ کب دیکھا تھا۔ چند لمحوں تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز محو سا ہوکے دیکھتا رہا۔ اس خزانے کے ڈھیر کے پاس دو بڑے مضبوط کپڑوں کے تھیلے پڑے ہوئے تھے جن میں یہ خزانہ بھر کے لایا گیا تھا..... یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ عورت اتنا سارا خزانہ اکیلی کیسے لائی ہوگی.....؟ پھر اس کی کھوپڑی میں آیا ہوگا کہ شاید کوئی گھوڑا یا خچر ہوگا جس پر وہ لاد کے لائی ہوگی.....؟ لیکن یہ دونوں میں سے ایک جانور بھی دکھائی نہیں دیا۔

وہ اس معمہ کو حل کر رہا تھا کہ پھر اس کی نظر ان کے کپڑوں پر پڑی جو فرش پر بکھرے ہوئے تھے..... پھر ایک ڈٹا نظر آیا تو آکاش نے لپک کے اسے اٹھالیا اور مرد کے سر پر پہنچ کے چیخا۔

"ذلیل..... کتے..... عورت کو چھوڑ دے..... ورنہ تیرا سر پھاڑ دوں گا.....؟"

آکاش کی گرجت آواز سنتے ہی مرد اس طرح سے اچھلا جیسے اس پر کوئی بجلی سی آن گری ہو۔

وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پلٹ کے حیرت اور خوف سے آکاش کو دیکھا اور اس کے چہرے پر نفرت اور غصے کے آثار ابھر آئے اس کی خون میں اتر آیا۔ وہ گرجا۔

"تو کون ہے.....؟ تو یہاں کیسے.....؟ تو اس علاقے کا معلوم نہیں ہوتا....."

"میں کہتا ہوں کہ تو نظروں کے سامنے سے دفع ہوجا....." آکاش نے اسے دھمکی دی۔ "کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں.....؟ شرم نہیں آتی جو ایک عورت کو اکیلی دیکھ کے اس کی عزت اور مال لوٹنا چاہ رہا ہے....."

وہ مردار خر کھاتا اور اسے خون خوار نظروں سے گھورتا آکاش کی طرف بڑھا..... آکاش کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کے سہم کے کھڑا ہوگیا۔ "تو ہم میاں بیوی کے معاملے میں مت بول..... یہ مکار عورت میری بیوی ہے..... ہم دونوں مندر سے یہ دفن خزانہ نکال کے لائے..... اس کا ایک آشنا ہے..... وہ دونوں مل کے مجھے قتل کر کے خزانہ ہڑپ کرلینا چاہتے ہیں..... اس کا آشنا بیل گاڑی لانے ہری پور گیا ہوا ہے..... سہ پہر تک آئے گا..... تاکہ یہ خزانہ بیل گاڑی پر رکھ کے لے جایا جاسکے....."

"یہ جھوٹ بول رہا ہے..... میں اس کی پتنی نہیں ہوں..... میری شادی بھی نہیں ہوئی..... میرا کوئی آشنا بھی نہیں ہے..... یہ ڈاکو ہے..... مسافروں کو لوٹتا ہے....."

آکاش کو عورت کی بات پر یقین آگیا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ وہ مرد کو مارنے بڑھا۔

وہ بدمعاش خائف ہوکر باہر کی طرف بھاگا۔ آکاش اس کے تعاقب میں لپکا تو عورت بولی۔

"اسے جانے دو۔ ابھی وہ لوٹ کے نہیں آئے گا۔ کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ تمہارے کارن وہ میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔"

پھر وہ عورت اس سے بولی۔

"میرے لئے تم دیوتا ہو..... ! تم نے آکر جانے جانے مجھ پر بڑی دیا کی۔ میری عزت اور جان بچالی..... ورنہ وہ میری عزت تباہ کرنے کے بعد مجھے گلا گھونٹ کے مار دیتا..... کیا میں تمہیں ہیرے انعام میں دوں.....؟"

"میں نے انسانیت کے ناتے تمہاری عزت اور جان بچائی ہے..... لالچ سے..... مجھے کسی انعام کی ضرورت نہیں۔"

"کیا ان قیمتی ہیروں کو تم انعام میں لینے سے انکار کررہے ہو.....؟" اس نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کردیں۔ تم جتنے چاہو لے جاؤ..... اپنی جیبیں بھرلو میں روکوں گی نہیں....."

"کہاں تم اپنی عزت بچانے کے لئے جدوجہد کررہی تھی۔ لیکن اب تم مجھ پر مہربانی ہونا چاہ رہی ہو....."

"اس لئے کہ تم میرے محسن ہو..... محسن کے لئے میں اس سے زیادہ کیا بھینٹ دے سکتی ہوں....."

"تم جلدی سے اپنے آپ کو لباس میں قید کرلو....."

"وہ آکاش کے گلے میں منکہ دیکھ کر بڑے زور سے چونکی۔ "یہ کہاں سے آیا..... یہ لاقانی اور غیر معمولی منکہ ہے.....؟

پہلے تم عورت بن جاؤ پھر بتاتا ہوں۔" آکاش بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ لباس پہننے کے بعد بولی۔ "میرا نام مالا ہے۔"

"میں مرہٹہ مندر اپنی بہن بملا اور اپنی بیوی کی تلاش میں جارہا ہوں جسے پجاری نے قید کیا ہوا ہے۔" آکاش نے جواب دیا۔ میرے لئے بہن اور بیوی ان ہیروں سے کہیں زیادہ نایاب اور انمول ہیں..... اب مجھے جانے دو....."

"تم ایسا کرو یہ منکہ مجھے دے دو..... یہ تمام ہیرے جواہرات لے جاؤ۔" وہ بولی۔

"یہ منکہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے..... کوئی اپنی جان دینے سے رہا۔" آکاش بولا۔

"مجھے ہر قیمت پر تمہیں یہ منکہ دینا ہوگا....." یکا یک مالا کا لہجہ بدل گیا۔

"ورنہ کیا.....؟"

"ورنہ یہ کہاں سے تم نہیں تمہاری لاش جائے گی....."

"کیا کسی کی جان لینا بہت آسان ہے.....؟"

"بس اب رام دیال آنے والا ہے۔ ہم دونوں مل کے منکہ تم سے چھین لیں گے۔"

"یہ رام دیال کون ہے.....؟"

جسے تم نے ڈھنڈے کے زور پر بھگا دیا..... یہ بھی پتی ہے....."

"لیکن میں نے جو دیکھا اور سنا.....؟ تم نے تو.....؟"

"تمہیں پھانسنے کے لئے ڈھونگ کیا تھا تاکہ منکہ حاصل کیا جاسکے.....؟" وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"یہ ہیرے جواہرات.....؟" آکاش نے اس ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم دونوں میاں بیوی دو برس سے اس خزانے پر نظریں جمائے غیر محسوس انداز سے اس کے حصول کی تدبیر کررہے تھے۔ کیوں کہ مندر کے تین تہہ خانے ایسے ہیں جن میں خزانے صدیوں سے موجود ہیں..... ان پر خطرناک ناگنیں اور ناگ پہرہ دے رہے ہیں..... ان خزانوں تک رسائی صرف پجاری اور سوامی ہی کی ہوسکتی تھی۔ جس سے پہلے تہہ خانے میں وہ خزانہ تھا صرف اس میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ ایک ایک ہیرا میں بیس لاکھ کی مالیت سے کم نہیں..... یہ ہیرے جواہرات کا ڈھیر ہے ساٹھ سے ستر ہزار سے کہیں زیادہ قیمتی، انمول اور نایاب ہیرے موجود ہیں۔ آخر دو برس کے بعد ذہن میں ایک ایسی تدبیر آئی جس سے اس خزانے کے حصول میں کامیابی نصیب ہوئی۔"

"کیا جادو سے کام لیا تھا.....؟"

"نہیں....." مالا نے سر ہلایا۔ "جادو سے بھی کہیں خطرناک اور فوری اثر تدبیر ہے..... کہیں کہیں جان کام نہیں کرتا ہے، رام دیال کلکتہ بازار سے ایک کیس اسپرے خرید کے لایا تھا۔ اس تہہ خانے میں اسپرے کرنے سے ناگ اور ناگن کا جوڑا بے ہوش ہوگیا۔ وہ

کوئی دس گھنٹے بے ہوش رہے..... ہم نے صرف تین گھنٹے میں کامیابی حاصل کرلی۔"

"کیوں..... دونوں تہہ خانے کے خزانوں پر ہاتھ صاف کیوں نہیں کیا.....؟"

"اس لئے کہ ایک تو یہ خزانہ کسی ایسی محفوظ جگہ رکھنا تھا کہ جہاں محفوظ اور دنیا والوں کی نظر سے محفوظ رہے..... اور پجاری شنکر اس کا پتا نہ چلا سکے۔ اور پھر کیس بھی ختم ہوگئی۔ ہمیں اب کوئی فکر ہے۔"

رام دیال اس قدر ذہین اور باصلاحیت شخص ہے؟" آکاش داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔" لیکن پجاری شنکر سوامی بہت بڑا جادوگر بھی تو ہے اس کے لئے یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ یہ حرکت کس کی ہے۔"

"رام دیال جادوگر بھی ہے اور ذہین جادوگر بھی..... چوں کہ پجاری شنکر سوامی کو ادھر کی فکر نہیں..... اور نہ ہی اسے اس چوری کی ہوا لگ سکتی ہے..... اس نے بس برس سے بھولے سے بھی ان خزانوں کی خبر نہیں لی۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ کسی میں اتنی ہمت اور اس کے پاس ایسا علم ہے کہ ان خزانوں کے جادو کا توڑ کرسکے..... اور پھر وہ ایک عیاش شخص ہے..... اسے صرف لڑکیوں، عورتوں سے دلچسپی ہے۔ اس لئے اسے ان سے فرصت نہیں کہ جو خزانوں کی فکر اور خیال کرے....."

"کیا تم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ میرے پاس منکہ ہے؟"

"رام دیال نے تمہیں ریل گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا کہ تمہارے پاس منکہ ہے وہ اسے دیکھ کر پاگل ہوگیا کہ کس طرح حاصل کیا جائے.....؟ نیلم مجھے اپنی محبت اور عشق کے بارے میں بتاتی تھی..... رام دیال نے تمہارے اور نیلم کے بارے میں معلوم کرلیا تھا کہ کالی دنیا کی ناگن رانیاں تمہارے عشق میں پاگل ہیں اور نیلم کے حصول کے لئے ہر قیمت پر کالی دنیا آؤ گے..... تمہارا منکہ حاصل کرنے کے لئے ہم نے ڈھونگ رچایا لیکن تم ہمارے جال میں نہیں آئے، اب بھی وقت ہے تو منکہ کے عوض یہ خزانہ لے لو..... بہن اور پتنی کا خیال دل سے نکال دو۔ یوں رام دیال نے تمہیں کیا ہوا ہے کہ منکہ حاصل کرکے رہے گا۔"

"مجھے خزانوں سے نہیں بلکہ بہن اور نیلم کے حصول سے دلچسپی ہے۔" آکاش کہنے لگا۔ "میں اس خزانے پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اس لئے میری بہن اور پتنی دونوں ایسے خزانے میں جو دنیا کے تمام خزانوں سے کہیں قیمتی انمول اور نایاب ہیں..... میں ان خزانوں کی تلاش میں جارہا ہوں..... ایک کیا دس رام دیال میں اپنی ذہانت اور جادو اور طاقت سے بھی میرا منکہ چھین نہیں سکتے ہیں..... اس میں بہت دم اور شکتی ہے تو مجھ سے چھین کر دکھادے....."

"اس کی کوئی ضرورت نہیں..... جوگڑے مرتا ہو اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"وہ کیسے.....؟" آکاش نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔

"رام دیال کے پاس ایک ایسی تدبیر ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"وہ نیلم کو جب پہلے دن لایا گیا تھا۔ مجھے اس کی سیوا کے لئے مامور کیا گیا تھا..... جب کہ تمہاری بہن بملا ہی میں لائی گئی تھی..... مجھے اس بات کا علم ہے کہ تم دونوں کو اپنی جان سے زیادہ چاہتے ہو..... ہم ان دونوں میں سے صرف ایک کو رہا کرواسکتے ہیں..... صرف منکہ کے عوض..... تم بتاؤ..... کسے رہا کروانا چاہتے ہو؟"

"بہن یا پتنی کو.....؟ صرف ایک گھنٹہ میں جسے تم چاہو.....؟"

آکاش جیسے ایک دوراہے پر کھڑا ہوگیا تھا۔

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

بہار گل میں گلستان رقص کرتا ہے
میرے چمن کا ہر گلاب رقص کرتا ہے
چند جھوم کے گاتے ہیں شادمانی میں
ہمارے دل کا ہر اک داغ رقص کرتا ہے
(شگفتہ ارم درانی.....پشاور)

شام ڈھلتی ہے، تو آنگن میں اتر آتی ہے
یہ اداسی بھی، میرے گھر کا فرد ہو جیسے.....
جب سے چھوڑ گئے ہو، تب سے لگتا ہے دعا
سینے میں میرے دل نہیں، درد ہو جیسے.....
(ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

یہ شب بھی رنجور گئی بن گزاری نہیں جاتی
دل سے یہ ردا دکھ کی اتاری نہیں جاتی
ہے شہر چراغاں میں گرداب بہت سے
یہ خیالوں کی کشتی اب تو اتاری نہیں جاتی
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

میری آنکھوں میں رہنا تم تمہیں وفا سکھاؤں گا
میرے دل میں اترنا تم تمہیں دنیا دکھاؤں گا
نظر سے تم ملاؤ نظر قدم سے تم ملاؤ قدم
میرے ہی ساتھ چلنا تم، تمہیں اپنا بناؤں گا
(عثمان غنی.....پشاور)

نئے نئے تھے جدائی کے دن تو بات بھی تھی
وہ دور بہت چلا نیند کیوں نہیں آتی
بچھڑ ہی جاتے ہیں دنیا میں چاہنے والے
چلو ہوا سو ہوا نیند کیوں نہیں آتی
(آصفہ سراج.....لاہور)

یادوں پہ وہ اعتبار نہیں کرتے
ہم ذکر محبت سر بازار نہیں کرتے
ڈرتے ہیں ہم دل کی رسوائی سے
اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں پیار نہیں کرتے
(صبا محمد اسلم.....گوجرانوالہ)

ذبح کے وقت تڑپنے پر صنم روٹھ گیا
لہو دوڑا جاتا ہے قدموں میں منانے کے لئے
(ایم ابوہریرہ بلوچ.....بہاولنگر)

شب فراق یہ احساس کس بلا کا تھا.....
کہ دل چراغ اور سامنا ہوا کا تھا.....!
اسے تو غیر سے بے حد شوق ہے "بخیہ گری" کا
مگر سوال میرے "زخم کی انا" کا تھا.....!
(انتخاب: ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

سب ہر اک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیسے راز داں کرلوں
(محمد اسحاق انجم.....کنگن پور)

صورت دکھا کے پھر مجھے بے تاب کردیا
اک لطف آپکا تھا غم انتظار میں!
(محمد عمران.....کنگن پور)

میرے لئے تو صرف دعا ہوگیا وہ شخص
سارے دکھوں کی جیسے دوا ہوگیا وہ شخص
(نسیم انجم.....کنگن پور)

جھونپڑی میں نہ کوئی طاق نہ مسند کوئی
یہ گدا تجھ کو کہاں دل کے علاوہ رکھے
(محمد سلیم.....کوٹھ کلاں)

بہت آسان ہے مرنا جب بھی چاہو
مگر جینے میں دشواری بہت ہے
محبت کرنے والوں یہ ہمیشہ یاد رکھنا
یہ جیتی کم ہے اور ہاری بہت ہے
(سنی عارف.....گوجرانوالہ)

ہمیں ان سے وفا کی امید تھی بے حد
مگر بیوفائی سے نا آشنا تھے ہم
(سیف الرحمن.....گوجرانوالہ)

نہ ستاؤ ہمیں ہم پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں
جدائی کا تیری ہم غم اٹھائے ہوئے ہیں
بے نام امنگوں کا سہارا نہ لیا کر
ہم ہر روز ہر سانس تیرا نام سجائے ہوئے ہیں
(انتخاب: ابوہریرہ بلوچ.....بہاولنگر)

☆☆

میری آنکھیں منجمد ہیں میرے ہونٹ سل چکے ہیں
تم جان ہی نہ پائے میرے احساسات مرچکے ہیں
بے گور کفن لاشے ہیں میری شکستہ حسرتوں کے
میں کیسے یہ بتاؤں سب خواب بکھر چکے ہیں
فقط ابھی کی آرزو ہے ان کی سمت زندہ ہستی کو
کچھ لوگ تیری چاہ میں ایسے اجڑ چکے ہیں
ہر صبح سوگوار ہے ہر شام درد بھری ہے
تیرے بعد میرے لمحات سب اشکوں سے بھر چکے ہیں
اب مت تلاش کرو تم ہم تباہ حال لوگوں کو
ہم سیاہ نصیب تیرے پیار میں جان سے گزر چکے ہیں
(شائستہ سحر.....راولپنڈی)

تری تلاش میں نکلے تو گھر جلا بیٹھے
تیری تلاش میں دنیا کو ہم بھلا بیٹھے
تری تلاش میں رہبر کیسے بناتا میں!
تری تلاش میں اپنا دیا بجھا بیٹھے!
تری تلاش میں چھانا ہے عمر بھر صحرا
تری تلاش میں زاد سفر گنوا بیٹھے!
تری تلاش نے بے جان کردیا مجھ کو
تری تلاش میں دست ہنر لٹا بیٹھے!
تری تلاش میں کھائی ہیں ٹھوکریں ہم نے
تری تلاش میں تجھ سے فریب کھا بیٹھے
(حکیم خان حکیم.....اٹک)

خود شناسی، خود داری سے گویا غافل ہوگئے
ہوکے سرکاری ملازم لوگ کاہل ہوگئے
قدر دانی ہوگئی جب ختم اہل علم کی
جہل پروردہ فضا میں، وہ بھی جاہل ہوگئے
چاپلوسی کا، خوشامد کا، عجب دستور ہے
جو قدم اٹھے طلب کی راہ میں اعزاز منزل ہوگئے
اجتماعی واسطے سے لوگ کاٹ کر
بس شہیدوں میں اسی عنوان سے شامل ہوگئے
فائدے ہی فائدے کیا بات ہے تری دروغ
جو صداقت سے نہ ملتے تھے وہ حاصل ہوگئے
دیکھے جب تخریب سے تعمیر کے کچھ سلسلے
دہریئے اللہ کی قدرت کے قائل ہوگئے
کیسی اب تعمیر واجد اہل حل بقد کی
جب مفادات کے سب طے مراحل ہوگئے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانوی.....کراچی)

میں روپ نگر کی شہزادی تو اک آوارہ بنجارا
میں چاند کی کشتی میں رہتی تو پھرتا پھرے مارا مارا
تو میری خواہش رکھتا ہے، کیا سوچ کے تو نے ایسا کیا
میں نیل گگن کی وسعت ہوں، تو کچی زمیں کا نظارا
جب پاتی نہیں سکتے مجھ کو تو میری طرف کیوں بڑھتے ہو
اک بدلی ہوں آکاش کی میں، تو ساحل دریا بے چارہ
میں تو خوشبو ہوں پھولوں کی اور مستی مست بہاروں کی
تڑا دامن ہے کانٹوں سے لدا، تو تو ہے خزاں کا گہوارہ
ترے پاس سوائے دل کے کیا کچھ اور بھی ہے پاگل عاشق!
مرے طالب تو ہیں لاکھ یہاں، کیا جانوں تو کرشن ہمارا
نہ جان کو اپنی روگ لگا، جالوٹ کے اپنی بستی کو
میں تیری پیاری ہوں لیکن تو میرا نہیں ہے دلدارا
(فریدہ خانم.....لاہور)

الم نصیب جہاں راہ وفا میں ہم
عجیب درد کی لذت سے آشنا ہیں ہم
ہم اہل دل ہیں محبت ہمارا شیوہ ہے
ہیں سب کے ساتھ بھی سب سے مگر جدا ہیں ہم
ہم ان سے برسر پیکار ہیں جہاں بھی ہیں
جو لوگ کہتے ہیں سجدے کرو خدا ہیں ہم
ہمارے ذہن سے ابھرے ہیں آفتاب کئی
جہاں بھی ظلمت شب ہے سحر نما ہیں ہم
شکستہ حال و تہی دست بے نوا ہی سہی
ضمیر دہر کی یارو مگر صدا ہیں ہم

ڈوبو کے سارے سفینے قریب ساحل کے
ہے ان کو پھر بھی یہ دُھن کہ ناخدا ہیں ہم
اداس جی ہے طبیعت بجھی ہوئی امتیاز
کسے بتائیں کہ کس شوخ سے جدا ہیں ہم
(ایس امتیاز احمد.....کراچی)

اب وہ منظر نہ وہ چہرے نظر آتے ہیں
ہم کو معلوم نہ تھا کہ خواب بھی بکھر جاتے ہیں
جانے کس حال میں ہے کہ ہمیں دیکھ کے سب
اک پل کیلئے رکتے ہیں اور چلے جاتے ہیں
یہ ناز حسن تو دیکھو کہ دل کو نٹ پاکر
نظریں ملاتے ہیں اور چھوڑ کر چلے جاتے ہیں
کوئی تو ہو جسے اپنا سمجھ کر کہہ سکوں
دُکھ سنے والے تو سب ہی یار نظر آتے ہیں
یونہی تنہائی اب دل کو سزا دیتی ہے
نام لکھ کر ابھر مٹادیتے ہیں
اس میں قسمت کی خطا نہ زمانے کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں
(شرف الدین جیلانی.....خٹنڈو الہ یار)

بہت سے لوگ ساحل پر
نجانے کب سے بیٹھے تھے
میں ان کے پاس جا بیٹھی
نجانے کیوں.....؟
نہ کوئی بات کہنی تھی
نہ کوئی بات سننی تھی
فقط یہ جاننا تھا کہ
کوئی ان میں بھی ہے تنہا.....؟
کوئی ان میں بھی ہے بے کل.....؟
کہ جس کے دل میں بس وحشت ہو اور گہری اداسی ہو
جو میری ہی طرح دکھ درد کی دنیا کا باسی ہو
مگر
کیا.....؟
کسی کی سوچ بے کل تھی کسی کی روح تھی ترسی
کسی کا جگر چھلنی تھا کسی کی آنکھ تھی بری

بتادوں کون تھے وہ.....؟
وہ سب آکاش الفت کے بڑے رنگین طائر تھے
وہ اپنی ذات میں بھٹکے ہوئے غمگین شاعر تھے
(گلفشہ ارم درانی.....پشاور)

ہر آہٹ پہ ہوتا ہے اس کا گماں
اس کے آنے سے ہوتا ہے روشن مکاں
برسوں کے بعد وہ آئے گا لوٹ کر
پھر نہ جائے گا یہ ہے یقین اور گماں
چاند ستاروں سے سج جائے گا آسماں
ہوگا دھرتی پہ بھی جگنوؤں کا گماں
منتظر تھیں نگاہیں یہ جن پر لگیں
جم کے برسیں گی پھر ساری وہ بدلیاں
اجڑے گلشن میں پھر پھول کھل جائیں گے
پھر سے منڈلائیں گے بھنورے اور تتلیاں
میری چاہت ہے بچی تو اس کو ملی
روک سکتا نہیں مل کے سارا جہاں
(تحریر: علی صبا.....حیدرآباد)

سب میں موجود اور سبھی سے الگ
اب میں بیٹھی ہوں زندگی سے الگ
عشق آباد لے کے جاتا ہے
یہ جو رستہ ہے آگہی سے الگ
ایسا منظر بھی آنکھ نے دیکھا
تھا دیا اپنی روشنی سے الگ
مسئلہ ہے یہی اپنی محبت کا
اس کے دل میں ہو اور اسی سے الگ
اپنی دنیا میں وہ مگن ہے بہت
میرے دل کی شگفتگی سے الگ
زندگی ایسے موڑ پر آئی
غم سے محروم ہے خوشی سے الگ
(بلقیس خان.....پشاور)

تو بنا کے پھر سے بگاڑ دے، مجھے چاک سے نہ اتارنا
رہوں کوزہ گر! تیرے سامنے، مجھے چاک سے نہ اتارنا

تیری انگلیاں میرے جسم میں یونہی لمس بن کے گڑی رہیں
کف کوزہ گر! میری مان لے، مجھے چاک سے نہ اتارنا!
تیرے چاک کی سبھی گردشیں میری آب و گل میں اتر گئیں
میرے پاؤں ڈوری سے کاٹ کے مجھے چاک سے نہ اتارنا
مجھے رکنا دیکھ کے کرب میں کہیں وہ بھی رقص نہ چھوڑ دے
کسی گرد باد کے سامنے، مجھے چاک سے نہ اتارنا.....
تیرا غم فن بھی عزیز ہے بڑے شوق سے تو سنوار لے
میرے پیچ و خم، میرے زاویئے، مجھے چاک سے نہ اتارنا
تیرا گیلا ہاتھ جو ہٹ گیا، میرے بھیگے بھیگے وجود سے
مجھے ڈھانپ لینا ہے آگ نے، مجھے چاک سے نہ اتارنا
(انتخاب: ساحل دعا بخاری.....بصیر پور)

خبر کسی کو نہیں غم چھپائے ہوئے ہیں
تیری وفا کو دل میں بسائے ہوئے ہیں
ہم لوگ یوں بھی شرمندہ تھے وفا شعار سے
چہرے پہ اپنے ہم غم سجائے ہوئے ہیں
جو جانتے نہ تھے کل تم ہمیں اے مہرباں
وہ آج یوں بھی ہم سے نگاہیں چرائے ہوئے ہیں
ہو نہیں سکتے کسی سے وہ یوں بھی مخلص
جو آستینوں میں آج خنجر چھپائے ہوئے ہیں
زمانے میں تم بھی تنہا پریشان نہیں جاوید
کہ بوجھ زندگی کا سب ہی اٹھائے ہوئے ہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

کوئی اپنا بنائے کیسے کوئی سپنا سجائے کیسے
قرار آئے کیسے، ہمیں پیار آئے کیسے
وہ بھی تو ہے دور مگر اتنا بھی مجبور نہیں
ہم کو تو وہ بھول گئے، ہم اسے بھلائیں کیسے
اس نے تو مٹادیں، ساری باتیں بھلادیئے
ہم اس کی تصویریں، اور وہ خط جلائے کیسے
دل میں نقش ہے آنکھوں میں اس کا عکس ہے
وہ ملتا ہی نہیں، ہم یہ اسے دکھائیں کیسے
جہاں بھی دیکھو، اس کا طلسم، اس کا ہی رقص ہے
آنکھوں میں وہ میرے قید ہے ہم اس کے دل تک جائیں کیسے

نہ وہ ملتا ہے نہ پیار کی باتیں کرتا ہے
مجھے ہے یک طرفہ محبت، اب اسے نبھائیں کیسے
(عثمان غنی.....پشاور)

دنیا کو تو حالات سے امید بڑی تھی
یہ چاہنے والوں کو جدائی کی پڑی تھی
کس جان گلستاں سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہوئی شام کھڑی تھی
میں اس سے ملی تھی کہ اپنے آپ سے ملی تھی
وہ جیسے میری ذات کی گم گشتہ کڑی تھی
یوں دیکھنا اس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی
کم مایہ تو ہم تھے مگر احساس نہیں تھا
آمد تیری اس گھر کے مقدر سے بڑی تھی
میں ڈھال لئے سمت وعدہ کھڑی تھی
پلٹی تو میری پشت پہ تلوار کھڑی تھی
(راحل بخاری.....محبوب شاہ)

حسن کی جھیل ہو تو اور کنارے ہیں یہ ہونٹ
سچ تو یہ ہے کہ مجھے جان سے پیارے ہیں یہ ہونٹ
میں نے ہر بار محبت سے انہیں چوما ہے
اس نے ہر بار محبت سے ابھارے ہیں ہونٹ
ہاتھ ہونٹوں پہ میرے رکھ کر مجھے کہنے لگے
روکتے ان کو بہت شوق کے مارے ہیں یہ ہونٹ
بند ہوتے ہیں یہ انکار کی صورت میں مگر
ادھ کھلے ہوں تو محبت کے اشارے ہیں یہ ہونٹ
آج خود اپنے مقدر پہ مجھے رشک آیا
آج ہونٹوں پہ میرے اس نے اتارے ہیں یہ ہونٹ
چوم کر ہونٹ میرے اس نے کہا تھا احسان
بس تمہارے ہیں تمہارے ہیں یہ ہونٹ
(احسان سحر.....میانوالی)

ویران ہوگئی ہیں اب زندگی کی راہیں
شیشے کی کرچیوں کو بکھرا گیا ہے کوئی

ٹوٹا ہے دل کا شیشہ چاہت کی منزلوں پر
الفت بھرے دلوں کو ٹھکرا گیا ہے کوئی
کھویا ہے جب سے تم کو پھر اور کچھ نہ مانگا
جتنا ملا ہے مجھ کو سمٹا گیا ہے کوئی
کیا ہے قصور میرا اب کیا میری خطا ہے
پھر آج میرے دل کو تڑپا گیا ہے کوئی
(آصفہ سراج.....لاہور)

ہم مرجائیں گے اک دن دیکھ لینا
روؤ گے بہت تم اس دن دیکھ لینا
دنیا میں ہیں تو پروا نہیں ہماری
چھوڑ جائیں گے تمہیں اک دن دیکھ لینا
آنسو چھپاتے پھرو گے سب سے تم
اتنا ہی یاد ہم آئیں گے دیکھ لینا
کچھ یادیں مٹی مٹی سی تم کو بہت ستائیں گی
تم مجھ کو نہ روک پاؤ گے دیکھ لینا
میں کچھ نہیں ہوں آج تمہارے لئے ندیم
کل تمہارے لئے اک یاد بن جائیں گے دیکھ لینا
(مصباح کریم میوانی.....چوکی)

جب رات کی ناگن ڈستی ہے نس نس میں زہر اترتا ہے
جب چاند کی کرنیں تیزی سے اس دل کو چیر کر آتی ہیں
جب آنکھوں کے اندھیری آنسو زنجیروں میں بندھ جاتے ہیں
سب جذبوں پر چھا جاتے ہو تب یاد بہت تم آتے ہو
جب درد کی جھانجر بجتی ہے جب رقص غموں کا ہوتا ہے
خوابوں کی پرتال پر ستارے دکھ وحشت کے ساز بجاتے ہیں
گاتے ہیں خواہشوں کی لے میں مستی میں جھومتے جاتے ہیں
سب جذبوں پر چھا جاتے ہو تب یاد بہت تم آتے ہو
(فیضان فلک.....رحیم یار خان)

تمہارے نام سے میں اک دیا جلاتا ہوں
تمام رات ہواؤں سے پھر بچاتا ہوں
میں اس کی یاد سے غافل کبھی نہیں رہتا
یہ اور بات کہ رشتے سبھی نبھاتا ہوں
میں ایک کمرے کا قیدی ہوں اور دنیا کے
سبھی حسین مناظر غزل میں لاتا ہوں
مرا وژن مجھے دنیا گھماکے لاتا ہے
میں برف پوش پہاڑوں سے ہو کے آتا ہوں
میں اپنے آپ کو رکھتا ہوں سب سے پوشیدہ
ہر ایک درد مگر شعر میں جگاتا ہوں
(انتخاب: کاشف عبید کاوش.....بٹ موڑی کرام)

کبھی یوں بھی دعاؤں میں آیری حسرتیں میرے نام کر
میرے درد تو مجھ سے چھین لے میری چاہتیں میرے نام کر
میرے خواب کتنے ہیں بے کراں مجھے بادلوں سے ہیں الجھنیں
میرے سارے درد و الم مٹا سبھی قربتیں میرے نام کر
شب غم میں جینا کٹھن بہت میرے ساتھ مجھے جام دے
یوں سمندروں کو پیام دے سبھی سنا دو تیں میرے نام کر
میں سلگ رہا ہوں بہار میں تری جستجو کے مقام پر
مجھے آرزو سے نواز دے یوں عنایتیں میرے نام کر
میری زرد آنکھوں کو خواب دے میری ساری سوچوں کو تاب دے
مجھے نعرتوں کا جواز دے سبھی الفتیں میرے نام کر
(محمد وارث آصف.....واں بھچراں)

آج روٹھے ہوئے ساجن کو بہت یاد کیا
آج اجڑے ہوئے گلشن کو بہت یاد کیا
جب بھی گردش تقدیر نے گھیرا ہے مجھے
گیسوئے یار کی الجھن کو بہت یاد کیا
جس کے ماتھے پر نئی صبح کا جھومر ہوگا
ہم نے اس وقت کی دلہن کو بہت یاد کیا
آج ٹوٹے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی
آج بیتے ہوئے لمحوں کو بہت یاد کیا
مطمئن ہو ہی گئے دام و قفس میں ہم
ہم اسیروں نے نشیمن کو بہت یاد کیا
(ایم ابوہریرہ بلوچ.....بہاولنگر)

☆☆

کوئی اپنا سہارا ہوگیا ہے
تم الفت گوارہ ہوگیا ہے
اسے دیکھا تو دل کو یوں لگا ہے
کوئی روشن ستارہ ہوگیا ہے
بھلا ہوگا اب تو ساتھ ہر دم
کوئی سنگدل ہمارا ہوگیا ہے
نہیں اک پل نہیں تسکین جاناں
جب سے دل تمہارا ہوگیا ہے
بہت کے سفر میں دیکھ رانا
میرا یہ دل آوارہ ہوگیا ہے
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

جب بھی بارش ہوتی ہے
پتے سب دھل جاتے ہیں
رشتوں پر چھڑکاؤ ہے
گھونسلے چند پرندوں کے
خوابوں میں نہ آیا کرو
بھیگ چکے ہیں بارش سے
یوں نہ تڑپایا کرو
فصلیں بہتر ہوتی ہیں
نیند میں نہ اڑایا کرو
لیکن ایک اندیشہ ہے
اگر آنا ہی ہے
کچے گھر جانے سے
میری جان
جسم کی مٹی گرتی ہے
آنکھ کھلنے پر
کھونہ جایا کرو
(بلقیس خان.....پشاور)

سنو! مجھے ہر پل تمہاری یاد آتی ہے
کبھی سانسوں کے چلنے پر
کبھی دل کے مچلنے پر
کبھی بارش برسنے پر
کبھی آنکھیں جھپکنے پر
کبھی چاند نکلنے پر
کبھی سورج ڈھلنے پر
کبھی شب کے اندھیروں میں
کبھی دن کے سویروں میں
کبھی لوگوں کے میلے میں
کبھی تنہا اکیلے میں
تمہاری.....
بس.....تمہاری
یاد آتی ہے.....سنو.....
مجھے ہر پل تمہاری یاد آتی ہے!
(عطیہ زاہرہ.....لاہور)

میری جان
بہت تڑپاتے ہو
خوابوں میں آتے ہو
کبھی ہنساتے ہو
کبھی رلاتے ہو
آنکھ کھلتی ہے جب
تم کھو جاتے ہو
ڈھونڈتی ہوں بہت
مل نہیں پاتے ہو
تم سے اک التجا ہے
میری جان
خوابوں میں نہ آیا کرو
ملنے چلے ہیں پرندوں سے
یوں نہ تڑپایا کرو
نیند میں نہ اڑایا کرو
اگر آنا ہی ہے
کچے گھر جانے سے
میری جان
جسم کی مٹی گرتی ہے
آنکھ کھلنے پر
کھونہ جایا کرو
(بلقیس خان.....پشاور)

میں بھی تمہیں بھلادوں گا
بس یہی کھڑی سزا دوں گا
کنارے پر کھڑی ہو کر
میں دور سے ہاتھ تجھے ہلادوں گا
جو بیوفائیاں مجھے ملی ہے تم سے
اب میں وہی تجھے لوٹادوں گا
نہیں چاہئے مجھے تیرا پیار اب
میں خود اپنا نصیب بنادوں گا
محبت آمیرے پیچھے میں جاچکا ہوں
میں اپنی یادوں سے بھی تجھے مٹادوں گا
(عثمان غنی.....پشاور)

تم اعتبار کرو
میں نے تمہارا ہاتھ تھام کر
تمہیں تمام عمر چاہنے کی
قسم کھائی ہے
تم میرے ہونٹوں کا اعتبار کرو
جس پر ہر پل تمہارا ہی
نام رہتا ہے
تم میری ان آنکھوں کا اعتبار کرو
جو ہر پل تمہیں دیکھنے کیلئے
بے چین رہتی ہیں
تم میری سانسوں کا اعتبار کرو
جس میں صرف
تمہاری خوشبو مہکتی ہے
تم میرے اس دل کا اعتبار کرو
جو تمہارے بغیر کہیں بھی نہیں لگتا
تم میری اس دھڑکن کا اعتبار کرو
جو صرف تمہارے
نام پر ہی دھڑکتی ہے
تم میرا اعتبار کرو
جو تم کو صرف اپنی زندگی
جانتی اور مانتی ہے
(صباحہ اسلم.....گوجرانوالہ)

ماں کے آنچل کی جو ہوائیں ہیں
یہ تو میرے لئے دعائیں ہیں
میں کبھی لڑکھڑا نہیں سکتا
ساتھ میرے تری وفائیں ہیں
تجھ کو دیکھوں تو قتل ہوجاؤں
بڑی قاتل تری ادائیں ہیں
میں تو سمجھا تھا رات کا منظر
تیری زلفوں کی یہ گھٹائیں ہیں
کچھ سنائی مجھے نہیں دیتا
ہر طرف ظلم کی صدائیں ہیں
(ریحان آفاق.....حیدرآباد)

☆☆

مالکن

رضوان بھٹی۔محراب پور

کمرے کا بہت ھی دھشت ناک اور وحشت ناک منظر تھا، نوجوان بیڈ پر نیم بے ھوشی میں لیٹا تھا کہ قریب بیٹھی عورت کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر اور تمھارا بوند بوند لھو میری رگوں میں دوڑے گا اور پھر.....

لہولہان.....لرزیدہ لرزیدہ.....جسم وجاں پر کپکپی طاری کرتی عجیب وانوکھی کہانی

خصوصی طور پر مجھے تنبیہ کیا گیا تھا کہ میں اس کمرے میں نہیں جاسکتا..... مالکن نے کہا تھا.....

"تم بے شک ہمارے سب سے پیارے اور پرانے نوکر ہو.....لیکن ہو تو غیر ناں.....؟" اس بات کو کم وبیش تیس برس بیت گئے تھے۔ ان تیس برسوں میں بہت سی تبدیلیاں آئیں، مثلاً میرے بال سفید ہوگئے، میرے بچے شادیاں کروا کر بیویوں کو پیارے ہوگئے.....میری زوجہ رخصت ہوگئی اور اس حویلی کا رنگ بھی مدہم پڑ گیا.....اگر نہ بدلا تو مالکن کا مزاج عشقیہ.....

نجانے کہاں سے شہر کے منٹھلے، لوفر اور راہ راست سے ہٹے ہوئے لڑکے، بندے اور بوڑھے اسے مل جاتے.....مالکن اپنی کار میں انہیں حویلی میں لے آتی، گیسٹ روم میں بیٹھاتی.....اور آدھے گھنٹے بعد حویلی کی سب لائٹیں بند ہوجاتیں.....اس کے بعد میرے اور مالکن کے ڈرائیور کے درمیان خفیہ سی باتیں ہوتیں۔ "یار رفیق.....آج اس شکار کو کہاں سے اٹھا لایا.....؟" میں اکثر معنی خیز نگاہوں سے گیسٹ روم کی سمت اشارہ کرکے پوچھتا.....وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا، اور کہتا۔

"کہاں سے لاتا..... بے چارے.....غربت کے مارے.....چمکتی گاڑیوں میں بیٹھی میڈموں کو دیکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ یہ اس دنیا کے باسی نہیں ہیں بلکہ وہاں رہتی ہیں جہاں ہر سو خوشیاں کھلتی ہیں، ہر طرف ہنسی بھنبھناتی ہے..... نہ روزی کی فکر..... نہ روٹی کا عذاب.....بس کھایا..... پیا اور عیش ماری.....حقیقت میں وہ ٹھیک سوچتے ہیں.....غریب لوگ.....ان کے خیالات بھی انہی کی طرح غریب ہوتے ہیں....."

"بات کہاں کی ہے اور تم کہاں پہنچ گئے.....یار رفیق.....تم بھی دماغی مریض لگتے ہو.....وہ بیماری بھی تمہیں لگتی محسوس ہوتی ہے وہ جو امیروں کو لگتی ہے....."

"کیا نام ہے اس کا.....؟" میں جان بوجھ کر اس بیماری کا نام بھول جانے کی ایکٹنگ کرتا۔

"نفسیاتی.....نفسیاتی مریض کہتے ہیں.....چلو خدا کا شکر ہے کہ ان امیروں اور غریبوں میں ایک بات تو مشترک ہوتی ہے....."

"میرا سوال اتنا تھا کہ آج کا شکار کہاں سے آیا.....؟"

"گدو بندر سے لے کر آیا ہوں.....تم جاؤ اپنا کام کرو.....!"

"رفیق زچ ہوکر کہتا اور اپنی راہ چل پڑتا۔

ان تیس سالوں میں ایک بات میں نے نوٹ کی تھی

کہ جو لگا ایک مرتبہ آتا تھا وہ دوسری بار نظر نہیں آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

"اب اتنی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا.....تم یہ کام چھوڑ دو.....یا پھر.....!" شگفتہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یا پھر.....کیا یا پھر.....؟" اظہر نے جارحانہ رویہ رکھ لیا۔ "ہمیں چھوڑ دو.....!" شگفتہ نے کہا اور منہ پھیر لیا۔ اظہر کا دماغ ایک دم پلٹ سا گیا۔ شگفتہ نے آج سے پہلے یہ بات کبھی نہیں کی تھی، تین سالہ بیٹی ارسلہ اور آنے والا نیا مہمان.....ایسی حالت میں خود شگفتہ خرچ تو تھا ناں.....

"دیکھو.....ایسے بات کا بتنگڑ نہیں بناتے.....شادی ہوئی تو چھ ماہ بعد ہی تم نے میرے والد سے میرا ہاتھ چھڑوا لیا، اس وقت ہاتھ میں نہ پیسہ پائی تھی اور نہ ہی گھر بار.....آج اگر ہم ساتھ ہوتے تو کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹتا ضرور....."

"بس کرو یہ رونے..... بہت سن لئے ہیں نے..... یا تو اب ہمارے اخراجات پورے کرو اگر نہیں.....تو طلاق دے دو.....؟" شگفتہ نے آج دل کی بات لب پر لا ہی دی۔

"ٹھیک ہے.....جاؤ جہنم میں تم.....!" اظہر نے کہا اور برتن کھٹکوں کر باہر گھر سے باہر نکل گیا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے.....

اظہر پریشانی کے عالم میں چلتا پھرتا گھر سے نجانے کتنی دور نکل آیا تھا.....اسے احساس تک نہ ہوا کہ وہ کتنا سفر کر چکا ہے.....کتنے سگریٹ پھونک چکا ہے.....اور اپنی زندگی سمیت شگفتہ کو نجانے کتنی گالیاں دے چکا ہے.....وہ اپنی ہی دھن میں چلے جارہا تھا کہ اچانک ایک نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی.....!

"ہیلو.....سنو.....!" اس نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ چمچماتی گاڑی کی پچھلی سیٹ والے دروازے سے ایک عورت نے سر باہر نکالا ہوا تھا.....اور ہاتھ کے اشارے سے اسے ہی بلا رہی تھی.....وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچا۔

"جی.....فرمائیں.....!"

"بے روزگار ہو.....!" عورت نے کہا.....

مسکراہٹ بدستور اس کے لبوں پر تھی۔

اظہر نے بے خیالی میں کہا۔ "بس یونہی سمجھ لیں.....!" اظہر سنبھل کر پھر بولا۔

"کیا مطلب.....کافی پریشان دکھائی دیتے ہو.....!"

"ہاں..... بس ویسے ہی....!" اظہر نے کہا۔

"چلو آؤ..... میرے پاس ..... گاڑی میں آؤ....!" اس کی آواز میں ایسا جادو تھا کہ اظہر نہ چاہتے ہوئے بھی کار میں بیٹھ ہی گیا۔

"رفیق..... گاڑی چلاؤ.....!" عورت نے کہا، ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔

اظہر ڈرائیور کے نام پر چونکا..... کیوں کہ اس کے والد نے دو چار مرتبہ دبے لفظوں میں اپنی مالکن کا ذکر کیا تھا کہ "اس کا کردار ٹھیک نہیں ہے..... ہفتے دو ہفتے میں کوئی نیا چھوکرا حویلی میں لاتی ہے..... اس کا ایک خاص ڈرائیور بھی ہے..... نام ہے رفیق.....!"

"کہیں..... یہ وہ میرے والد کی مالکن تو نہیں....." اظہر کی پریشانیوں میں ایک اور اضافہ ہوگیا..... اس نے چور نگاہوں سے اپنے ساتھ بیٹھی ڈھلتی عمر کی عورت کو دیکھا۔ وہ بھی اسی کی سمت تکے جارہی تھی..... نظریں چار ہوئیں تو دونوں کے لبوں پر اخلاقی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کچھ پیو گے.....!" عورت نے پوچھا۔

"نہیں..... کچھ نہیں.....!"

"تم باتیں بہت ٹوٹی پھوٹی کرتے ہو..... بہت گہرے معلوم ہوتے ہو..... یہ لو..... جام پیو.....!"

اس عورت کی مسکراہٹ بہت گہری تھی..... بہت معنی خیز..... اظہر کو اس وقت..... وہ ہوس کی پجارن نہیں..... بلکہ کوئی پراسرار..... نیلی آنکھوں والی..... خوبصورت چڑیل لگ رہی تھی..... جو اندھیری راتوں میں ویران راستوں پر بھٹکتی تھی، جو چاندنی راتوں میں..... روحوں جیسی..... کفن میں ملبوس..... کسی مسافر کی تلاش میں بے تاب ہو..... وہ عورت اس دنیا کی محسوس ہی نہیں ہورہی تھی..... اظہر اس سے نظریں نہ ملا پایا..... اور نظریں جھکالیں۔

"یہ لو..... جام پیو.....!" عورت نے اپنے پاؤں کے پاس سے ایک بوتل نکال کر اظہر کی جھولی میں ڈال دی۔

"یہ..... شراب..... میں شراب نہیں پیتا..... اسلام میں حرام ہے.....!" اظہر نے بوتل کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

"ارے پگلے..... یہ شراب نہیں..... جام ہے جام..... ایسا جام تو تم جیسے مڈل کلاس لوگ خوابوں میں بھی نہیں سوچتے..... یہ شراب کی طرح حرام نہیں..... ادھر تم جس اسلام کی باتیں کرتے ہو..... اس کے احکام پر پورا اترتے ہو.....!" عورت نے طرّا کہا۔

اظہر کو اس کی بات بری تو لگی..... لیکن وہ اس کی سحر زدہ آنکھوں کا محور بنا ہوا تھا..... اس نے جھولی میں سے بوتل اٹھائی..... وہ بلکے سیاہ رنگ کے محلول سے بھری ہوئی تھی..... بوتل پر کوئی نام، لیبل وغیرہ نہیں تھا..... یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی حکیم کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیوں والی دوا ہے.....

"اسے پی لو..... تمہارے اندر کی راحت..... اجاگر ہوگی.....!" اس عورت کی آواز اظہر کو کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی..... حتیٰ کہ وہ اس کے پاس تھی، ایک فٹ کا فاصلہ بھی نہ تھا..... اس کا ذہن مکمل طور پر مفلوج سا ہوگیا تھا۔ وہ گاڑی کے طلسماتی پراسرار ماحول میں رچ بس گیا تھا۔

اظہر نے بوتل کا ڈھکن کھولا..... اور نہ چاہتے ہوئے بھی بوتل منہ سے لگالی..... وہ کوئی میٹھا جام تھا..... اور نہ ہی شراب نمکین سا ذائقہ تھا..... اظہر کی چھٹی حس نے اس ذائقے کی پہچان کر بھی لی..... مگر اب بہت دیر ہوگئی تھی..... اس نے آدھے سے زیادہ بوتل خالی کردی تھی۔

اسے یاد آیا کہ بچپن میں کھیلتے وقت ایک مرتبہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا تھا..... اور خون بہنے لگا تھا۔ خون بہتے بہتے..... اس کے لبوں پر بھی آیا تھا..... اور لبوں سے ہوتے ہوئے زبان پر بھی آیا تھا..... اور وہی ذائقہ..... اس جام میں موجود محلول میں تھا.....!

"اوہ..... تو یہ خون ہے..... یہ خون ہے..... یہ مجھے پلادیا..... بدکار عورت..... یہ خون ہے.....!"

اظہر چلایا..... ہاتھ میں پکڑی بوتل اس نے پھینکنا چاہی..... مگر وہ بوتل گویا اس کے ہاتھوں سے چپٹ سی گئی..... جیسے اس نے بوتل کو نہیں بلکہ بوتل نے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا ہو..... وہ چیخا۔

"خبیثہ عورت..... تمہارے کیا مقاصد ہیں..... مجھے بتادو ابھی..... ورنہ..... ورنہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا.....!"

"چھوڑو تو تم اس بوتل کو بھی نہیں سکتے..... اور باتیں مجھے نہ چھوڑنے کی کرتے ہو..... تم..... بچ لوگ..... اسی طرح کی باتیں کرتے ہو..... بس آج تم میرا آخری شکار ہو..... آج کے بعد.....!" اس عورت نے کہا۔ اور فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

اظہر کو اب اس عورت کی سانسوں سے، پورے لباس سے..... حتیٰ کہ اس عورت کے مکمل وجود سے خون کی بو آنے لگی تھی..... اظہر خود ہی خود کھول اٹھا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہاتھ میں پکڑی بوتل اس عورت کے سر پر دے مارے..... اسے توڑ ڈالے۔

اس کی بوٹیاں کر کے چلتی کار میں سے باہر پھینک دے..... وہ پوری طرح اس عورت کے رحم و کرم پر تھا..... "سکون..... سکون..... سکون..... اختیار کرو بچے..... تمہارے اندر کا یہی کھولتا ہوا خون تو مجھے چاہئے..... یہی تو میری زندگی کا حاصل ہوگا....." اس عورت نے نہایت شفقت سے اظہر کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا..... اظہر کو یوں محسوس ہوا جیسے..... کوئی نیند کا انجکشن اپنا اثر دکھا رہا ہو..... دھیرے دھیرے وہ آنکھیں بند کرتا رہا..... اور بالآخر سو گیا۔

"رفیق..... گاڑی تیز چلاؤ.....!" اس عورت نے کہا..... لیکن اب اس کی آواز پہلے کی مانند پراسرار نہیں تھی۔

رفیق نے بیک مرر سے سوئے ہوئے اظہر کو دیکھا..... اور مالکن سے پوچھا.....

"مالکن..... یہ کب سویا.....!" اور وہ عورت دھیمے سے مسکرادی..... اسے یقین تھا کہ کچھ دیر پہلے جو ہوا اس کے متعلق اسے کچھ علم نہیں..... وہ ظاہری گاڑی میں موجود تھا..... لیکن تھا نہیں۔

☆.....☆.....☆

رات گیارہ کا وقت تھا جب میرے موبائل پر بیل بجی۔

"ہاں بیٹا..... آج کیسے یاد کرلیا.....!" فون میری بہو کا تھا۔

"ابو جان..... وہ..... وہ.....!" وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیا وہ..... وہ..... شگفتہ..... آخر مسئلہ کیا ہے..... سب خیریت تو ہے ناں.....؟" میں بھی پریشانی سے بولا۔

"ابو جان..... وہ اظہر..... شام گئے میرے ساتھ جھگڑا کر کے گھر سے نکلا ہے..... اب تک اس کا کوئی اتا پتہ نہیں..... میں اس کا فون بھی ملا رہی ہوں..... لیکن وہ بھی بند....."

"اوہ..... جھگڑا کس نوعیت کا تھا.....؟"

"گھر کے اخراجات کے متعلق تھا..... بس جو ہونا تھا سو ہوگیا..... اب آپ کچھ کریں پلیز..... میری جان نکل جارہی ہے.....!"

شگفتہ واقعی میں پریشان تھی، رو رہی تھی اس کی آواز بھی ٹھیک نہیں نظر آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا..... میں دیکھتا ہوں.....!" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا..... میں حیران تھا کہ آخر وہ گیا تو گیا کہاں.....

ہاں یاد آیا..... اس کا ایک دوست ہے ابرار..... شاید وہاں نہ گیا ہو..... میرے ذہن میں خیال آیا..... فوراً ابرار کا نمبر ملایا..... لیکن وہ بند..... پھر اظہر کا ملایا وہ بھی بند..... یوں بیٹھنے سے کچھ نہیں بننے والا تھا۔ میں اٹھا اور اپنی ذمہ داری حویلی کے ایک اور ملازم کو سونپ کر نکل کھڑا ہوا..... اب مجھے ایک رکشے کی ضرورت تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا ایک بج رہا تھا جب میں حویلی لوٹا..... ابرار کے پاس بھی اظہر کا سراغ نہ ملا۔ شہر کے تقریباً تمام ہوٹل، ریسٹورنٹ وغیرہ بھی چھان مارے..... اس کا کہیں اتا پتہ نہیں تھا۔ تھکا ہارا جیسے ہی حویلی میں داخل ہوا تو لائیس بند دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ مالکن کوئی نیا شکار لائی ہے.....

"عبدالمجید..... کہاں غائب ہو یار.....!" رفیق کی آواز سنائی دی..... وہ ایک طرف بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

"یار میرا بیٹا ہے..... اظہر..... وہ لاپتہ ہے....."

"گھر فون کر کے پتہ کر لو شاید وہ واپس آ گیا ہو....."

"ابھی دس منٹ پہلے تو معلوم کیا ہے..... خیر تم سناؤ..... آج پھر نیا شکار آیا ہے.....؟" میں نے بات بدلی۔

"ہاں دوست..... آج پھر نیا شکار..... ویسے تمہارا بیٹا دکھنے میں کیسا تھا.....؟" رفیق نے کہا۔

"تم تصویر ہی دیکھ لو.....!" میں نے کہا اور جیب میں موجود بٹوے میں سے اس کی تصویر نکال کر رفیق کے سامنے کر دی.....

وہ کافی دیر تک تصویر کے تصور میں کھویا رہا..... میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھتا رہا۔ "یہ..... یہ تمہارا بیٹا ہے.....؟" بمشکل رفیق کے حلق سے آواز نکلی۔ "ہاں..... یہ ہی میرا بیٹا ہے..... کیوں.....!"

"آج..... اپنی مالکن کا جو شکار ہے..... وہ یہی ہے.....!"

رفیق نے کہا..... تو میرے پاؤں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔

"کہاں سے ملا.....!"

"ہمیشہ کی طرح..... جیسے کئی اور..... فٹ پاتھوں سے اٹھائے جاتے ہیں..... اسی طرح یہ بھی.....!"

"اوہ..... اس کا مطلب ہمیں..... اب کچھ کرنا ہی پڑے گا.....!" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اب کیا کریں..... رات گزار کر وہ صبح واپس چلا جائے گا.....!"

"مگر..... رفیق..... آج تک میں نے کسی بھی بندے کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا..... پھر یہ.....!" میری بات پر رفیق بھی پریشان ہوا۔

"کہیں..... اپنی مالکن..... نہیں..... نہیں.....!" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں..... ٹھیک سمجھے..... مجھے بھی لگتا ہے..... جیسے وہ آدم خور ہے.....!" میرے دل کی بات لبوں پر آ ہی گئی۔

"اوہ خدایا..... پھر تو کچھ کرنا پڑے گا.....!" رفیق اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

اب ہم دونوں کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں ہمیں جانے کی اجازت نہیں تھی..... بلکہ باہر کا ہر لفنگا..... جا سکتا تھا.....

دروازہ اندر سے بند تھا..... میں نے دو تین بار زور زور سے دستک دی..... لیکن جواب نہیں آیا..... مجبوراً ہمیں زور آزمائی کرنی پڑی..... اور تھوڑی سی محنت کے بعد حویلی کا یہ حصہ بھی ہمارے لئے کھل گیا۔

باہر کی مانند اندر بھی روشنی نہیں تھی، موبائل کی لائٹ سے ہم آگے بڑھتے رہے..... ہم دونوں حیران تھے..... یہ کوئی کمرہ نہیں تھا..... ہم اسے گیسٹ روم سمجھتے تھے۔ لیکن یہ تو راہداری نکلی۔

"رفیق..... یہ ماجرہ کیا ہے.....!"

"ماجرے کو چھوڑ عبدالمجید..... مجھے تو یہ بہت گھناؤنا چکر لگتا ہے..... یہ راہداری ظاہر کر رہی ہے کہ بات اتنی سیدھی نہیں جتنی ہم مانتی میں سمجھتے رہے ہیں..... ہم تو سمجھتے تھے کہ اپنی مالکن ہوس کی پجارن ہے..... وہ باہر سے بندے لاتی ہے..... اور اپنی ہوس کی پیاس بجھاتی ہے..... لیکن ہم غلط تھے..... یہ معاملہ کچھ اور ہے..... کوئی خوفناک..... پراسرار چکر ہے.....!" رفیق نے کہا..... دونوں کی آنکھیں

اندھیرے سے کافی حد تک مانوس ہو چکی تھیں..... ہمارے چلنے میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

"خدا میرے بیٹے پر رحم کرے.....!" میں نے کہا.....

جانی پہچانی سی ایک خوشبو..... ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی۔

"رفیق..... کچھ محسوس ہوا.....!"

"راہداری بہت طویل ہے....."

"اس کے علاوہ.....!"

"مالکن کے جسم سے اٹھنے والی بو..... آ رہی ہے.....!" رفیق نے کہا۔

"ہاں..... یہی تو میں محسوس کروانا چاہتا تھا....." میں نے کہا اور ہماری چال مزید تیز ہو گئی۔

"بالآخر ہمارا سفر اختتام کو پہنچا..... راہداری کا اختتام ایک اور دروازے پر ہوا..... یہ دروازہ بند تھا..... لیکن اندر سے مالکن کی آواز آ رہی تھی۔ "بس تھوڑی دیر اور..... دس منٹ اور..... پھر..... میں پھر سے جوان ہو جاؤں گی..... تمہارے خون..... میرے سابقہ تمام شکاروں کے خون سے ایک محلول میں ڈالنے کی دیر ہے..... سمجھو آبِ حیات، بن جائے گا..... جام تازگی بن جائے گا..... جامِ زندگی ثابت ہوگا.....!"

"اظہر....." میں نے چیخ کر کہا..... اور دروازے کو لات ماردی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا..... وہ کھلتا چلا گیا..... اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا منظر نہایت دلخراش تھا..... کمرا بہت سے بھرپور تھا۔ ایک بڑا سا مصنوعی روشنی سے روشن کمرہ جس میں ہر طرف..... انسانی ڈھانچے کھڑے تھے..... کمرے کے بیچ میں ایک پلنگ تھا..... جس پر اظہر بے سدھ سا لیٹا ہوا تھا اور پلنگ کے سرہانے مالکن بیٹھی..... اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی..... اظہر کے ہاتھ کی نس سے ایک پلاسٹک کی نلکی ایک عجیب سی بوتل میں جا رہی تھی..... اور نلکی کے ذریعے اظہر کے جسم میں موجود خون اس بوتل میں جمع ہو رہا تھا..... ہر گزرتے لمحے..... اظہر کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا.....

مالکن کی حیرانگی کو نظر انداز کر کے میں فوراً پلنگ کے پاس پہنچا..... اور خون والی نلکی کھینچ لی..... مالکن کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔

"حرام خورو..... تم اندر کیوں آئے؟..... کس کی اجازت سے....."

"اجازت کی بچی.....!" رفیق دھاڑا..... وہ شاید سارے موقع کی نزاکت کو اب سمجھا تھا اور ابھی اسے ہوش آیا ہو جیسے..... وہ دھاڑا۔

"تو..... اب میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گی..... تو آدم خور ہے..... قاتل ہے..... قاتل.....!" رفیق نے دیکھا دیکھی مالکن پر چھلانگ لگا دی..... اس موقع پر مجھے بھی کچھ کرنا چاہئے تھا..... میں نے بھی پاس پڑی ایک کھوپڑی اٹھائی..... اور مالکن کی کھوپڑی پر دے ماری..... لیکن مجھ سے زیادہ رفیق نے کام دکھایا..... اس کا گلا یوں پکڑا..... کہ لمحے بہ لمحہ گرفت مضبوط کر دی..... حتیٰ کہ مالکن کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں.....

رفیق جانتا تھا کہ اگر اس نے مزید دیر کی تو مالکن اس پر کوئی پراسرار چکر چلا کر دماغی طور پر غائب کر دے گی..... اس لئے..... مالکن کی سانس ہی ضبط کر لی.....

مالکن مر چکی تھی..... اظہر کو کاندھے پر ڈال کر رفیق کمرے سے نکل چکا تھا۔

رفیق ان معاملات میں بہت زیادہ تیز ثابت ہوا تھا۔ اصل معاملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا..... مالکن کو جنون تھا..... خون جمع کرنے کا..... اس لئے وہ ہر ہفتے، دو ہفتے بعد کسی نہ کسی کو پکڑ لاتی..... اور کوئی جادو ٹونہ کر کے اس کے جسم کا سارا خون نکال کر لاش وہیں پھینک دیتی..... وہ اس تمام خون سے کوئی نسخہ حیات بنا رہی تھی۔ مگر رفیق کے ہتھے چڑھ کر..... نسخہ حیات کے بجائے لقمہ اجل بن گئی۔

ہائے ری قسمت..... مالکن.....!

خوفناک عفریت

شہزادہ چاند زیب عباسی۔کراچی

رات کا گھٹا ٹوپ اور مہیب اندھیرا پورے گائوں پر مسلط تھا کہ اچانک ایک دیوہیکل ناقابل یقین اور ناقابل فراموش خوف و دہشت کے لبادے میں لپٹا ہوا ایک شخص نمودار ہوا اور پھر جو منظر رونما ہوا وہ.....

خوف وہراس کی دنیا میں ہلچل مچاتی، مہیب کربناک، دردناک اور خون منجمد کرتی کہانی

یہ ایک دیہی علاقہ ہے یہاں بلند وبالا پہاڑی سلسلہ چڑھائی اور دیار کے درختوں کی بہتات ہے۔ پیر آباد نامی اس دیہی علاقہ میں ایک طرف بہتا ہوا اور یا اور دوسری طرف گھنا جنگل۔ اس وقت جنگل کے قریب تین بے فکر بے دوست کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کی عمریں یا بیس تیئس کے آس پاس تھیں، تینوں کا تعلق اپر کلاس فیملی سے تھا۔ ان میں سے ایک وزیر کا بیٹا خالد تھا۔ دوسرا DIGI حیدر علی کا بیٹا شرجیل اور تیسرا نعمان جس کے والد بہت بڑے بزنس مین تھے۔ انٹرنیشنل سرکل میں بھی ان کا ایک نام تھا۔ شرجیل کرکٹ کے کھیل سے جنون کی حد تک عشق کرتا تھا وہ انڈر نائنٹین کے کھلاڑی تھے اپنے اسی شوق کے سبب اس نے جنگل کے قریب کرکٹ کا میدان سجالیا تھا۔ نعمان نے دوڑتے ہوئے گیند پھینکی۔ گیند فضا میں بلند ہوئی اور کافی دور جا گری اور لڑھکتی ہوئی گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ میں جا گری۔ خالد گیند کی طرف بھاگا۔ اس وقت ان کے پاس ایک یہی بال تھی اگر یہ بھی گم ہوجاتی تو ان کا کھیل یہیں ختم ہوجاتا اور اس کے نتیجے میں شرجیل کا موڈ خراب ہوجاتا۔ خالد بلا تکلف جھاڑیوں کی طرف لپکا اور بال ڈھونڈنے لگا۔

جھاڑیوں میں اندر کیڑے مکوڑے، سانپ بچھو اور دیگر چھوٹے جانوروں کی موجودگی کا پورا امکان تھا۔ مگر اس وقت بھی اسے صرف گیند کا خیال تھا جس کی حوالی ضروری تھی۔ جھاڑیاں گھنی تھیں اندر جانا کافی مشکل تھا وہ ہاتھ جھاڑیوں میں ڈالے گیند ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں ہلچل مچی تو وہ ڈر کر چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر جھاڑیوں کی سرسراہٹ اور خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اضطراب آمیز نگاہوں جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں کوئی جانور تھا جو جھاڑیوں میں چل رہا تھا۔ لیکن جب وہ سامنے آیا تو خالد کا دل جیسے اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ وہ ایک دیو قامت انسان نما حیوان تھا جو اس وقت اس کے سامنے برہنہ کھڑا تھا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس کے چار بازو تھے۔ چہرہ اس قدر خوف ناک کہ اسے دیکھ کر خوف کے مارے خالد کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ڈر کے مارے اس کی گھگھی بندھ گئی اس حیوان نما آدمی نے جلدی سے اپنے ہاتھ بڑھا کر خالد کے لمبے بال اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ کر اسے جھاڑیوں میں اندر گھسیٹ کر لے گیا۔

فضا خالد کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ اور کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔

نعمان اور شرجیل دور ہونے کے سبب اس عفریت کو دیکھ نہ سکے تھے بس اتنا نظر آیا تھا کہ ایک جسم ہیولہ خالد کو جھاڑیوں میں گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ وہ چاہتے تو بھاگ کر اپنی جگہ بچا سکتے تھے لیکن انہیں اس مصیبت کے وقت اپنے جگری دوست کو اس مصیبت میں تنہا چھوڑ کر جانا مناسب نہ لگا۔ وہ بیٹ کو ہتھیار کے طور پر ہاتھوں میں تھام کر جھاڑیوں کے قریب پہنچے اور ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو کسی کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے جو اوندھے منہ جھاڑیوں میں پڑا تھا۔ وہ لباس اور جوتوں سے پہچان گئے وہ ان کا دوست خالد تھا۔ انہوں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا پاؤں پکڑ کر جھاڑیوں سے باہر کھینچا۔ تو ان کی چیخ نکل گئی۔ وہ مر چکا تھا، سر بری طرح پچکا ہوا تھا۔ جیسے اس پر بھاری بھرکم ہتھوڑے سے وار کیا گیا ہو۔ ان پر دہشت طاری ہوگئی گویا جھاڑیوں میں کوئی بہت بڑا خطرہ تھا۔ اس خطرے کو بھانپ کر وہ مڑے اور ایک طرف دوڑ پڑے۔

اسی وقت جھاڑیوں میں ہلچل مچی۔ اور وہ حیوان نما درندہ باہر نکل کر چنگھاڑتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگا۔ دوڑتے ہوئے شرجیل ٹھوکر لگنے کے باعث گرا اور اس حیوان نما انسان نے دھاڑتے ہوئے اسے دبوچ لیا۔ نعمان نے دوڑتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو آٹھ فٹ لمبے اور دیو ہیکل چار ہاتھ والے اس خوف ناک انسان نما حیوان پر نظر پڑتے ہی خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اب مزید وہاں رکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، وہ خوف سے چیختا ہوا بھاگتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

فرحان جیل کی کال کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ اسے قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ حالات اور واقعات نے اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ فرحان کوئی معصوم یا شریف انسان نہیں تھا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو خوابوں اور خیالات کی دنیا میں رہتے تھے۔ اس نے بچپن میں ماورائی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ وہ سوچتا اگر کہیں سے الہ دین کی طرح اسے بھی ایک جادو کی چراغ مل جائے تو وہ راتوں رات امیر ہوجائے گا۔ جوان ہونے پر اسے اپنی پکّا نہ سوچ پر ہنسی آنے لگی۔ وہ غلموں کا رسیا تھا۔ اب وہ کسی شارٹ کٹ کے چکر میں تھا اس کی انہی حرکتوں کی وجہ سے اس کے بہن بھائی اور والدین اس سے نالاں تھے۔

کالج میں اسے اپنی کلاس فیلو مناہل سے پیار ہوگیا، وہ ڈی آئی جی حیدر علی کی بیٹی تھی۔ اسے صرف اپنی پڑھائی سے دلچسپی تھی اس نے فرحان کی طرف کوئی توجہ نہ دی، ایک روز فرحان نے ہمت کر کے اسے ایک گلابی رنگ کے کاغذ پر غزل لکھ کر دی۔ مناہل نے اسے تھپڑ مار دیا پھر فرحان کی ہمت ہی نہ ہوسکی کہ اس سے اظہار محبت کرتا۔

وہ اکثر اپنے کلاس فیلو وقاص سے اپنے خیالات شیئر کرتا رہتا تھا۔ جس کے روابط جرائم پیشہ عناصر سے تھے۔ اس کے کہنے پر فرحان نے اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے جرائم کی دنیا کا انتخاب کیا، وہ وقاص اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اسٹریٹ کرائم میں ملوث ہوگیا، پہلے پہل وہ ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں شریک رہا خواتین سے پرس چھیننا، راہ گیروں سے اسلحہ کے زور پر موبائل فون، نقدی اور گاڑیاں چھیننا گویا اس کی ٹریننگ کا آغاز تھا۔

کچھ عرصے بعد اسے ایک بینک ڈکیتی کی وارادات میں شریک کیا گیا، فرحان اور وقاص سمیت وہ چار افراد تھے کامیابی سے بینک کے اندر گھس کر منیجر سمیت بینک کے تمام عملے کو یرغمال بنا چکے تھے بینک کے ایک گارڈ نے مزاحمت کی کوشش کی جو وقاص کی گولی سے مارا گیا۔ بدقسمتی سے اس وقت بینک میں ڈی آئی جی حیدر علی بھی سادہ لباس میں موجود تھے وہ ایک چیک کیش کروانے بینک آئے تھے ان کے بغلی ہولسٹر میں پسٹل بھی موجود تھا۔ فرحان کیشئر سے رقم سمیٹ کر تھیلے میں ڈال چکا تھا کہ انہوں نے برق رفتاری سے پسٹل نکالا، وقاص اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کردی۔ وقاص کے دو ساتھی ان کی چلائی ہوئی گولیوں سے ہلاک ہوگئے جبکہ وقاص فائرنگ

کرتا ہوا فرار ہوگیا اس فائرنگ کی زد میں بینک منیجر بھی آگیا تھا۔

فرحان کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اسے زخمی حالت میں گرفتار کرلیا گیا۔ گارڈ اور بینک منیجر وقاص کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے لیکن ان کے قتل کا الزام فرحان پر عائد کیا گیا۔ اور عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنادی۔

فرحان کی سوچوں کا تسلسل کسی کی قدموں کی چاپ سے ٹوٹا، یہ اس کا ساتھی قیدی ہاشم تھا۔ ہاشم کا تعلق بھی ایک بہت بڑے جرائم پیشہ گروہ سے تھا۔ اس کا گروہ منشیات فروشی میں ملوث تھا مخالف گروہ سے تصادم کے دوران ہاشم کے ہاتھوں تین افراد قتل ہوگئے تھے اسے بھی پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ وہ فرحان کا دوست بن چکا تھا۔ جیل میں سب قیدی اس سے ڈرتے تھے۔

فرحان نے جیل میں رہ کر چند ہی دن میں سمجھ لیا کہ جس کے پاس پیسہ ہے اس کے لئے جیل بھی گھر ہی کی طرح ہے۔ ہاشم کو جیل میں ہر قسم کا عیش و آرام میسر تھا۔

"کیسے ہو فرحان؟" ہاشم اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں اور تمہارے سامنے ہوں ویسے بھی زندگی کی شام ہونے والی ہے، دنیا میں بھی تنہا تھا اور جاؤں گا بھی تنہا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

"اگر تم ہمت کر دو تو پھانسی کی سزا سے بچ سکتے ہو۔" ہاشم نے سرگوشی کی۔

"وہ کیسے۔؟" فرحان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آج ہمارے گروہ کے کارندے جیل پر بھرپور حملہ کریں گے دسی بموں اور گولیوں کا آزادانہ استعمال ہوگا۔ جیل کے اہم افسران کو بھاری رشوت کے عوض خرید لیا گیا ہے اس موقع پر وہ دکھاوے کے لئے مزاحمت کریں گے جنہیں بس اتنا کرنا ہے کہ حملے کا آغاز ہوتے ہی میرے ساتھ راہ فرار اختیار کرنی ہے۔" ہاشم نے کہا تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"لیکن اس موقع پر جیل کے ایماندار محافظ ہم پر فائرنگ بھی کرسکتے ہیں ظاہر ہے، قانون کا ہر محافظ باکڈ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہم کسی اندھی گولی کا شکار بھی ہوسکتے ہیں۔" فرحان نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ارے بھائی بھاگنے میں رسک تو ضرور ہے لیکن کامیاب ہونے کی صورت میں زندگی کی ضمانت بھی ہے جبکہ یہاں خاموش پڑے رہو گے تیقینی موت سے دوچار ہوجاؤ گے سوچ لو آگے تمہاری مرضی۔" ہاشم نے کہا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد فرحان نے حامی بھر لی۔ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

رات ایک بجے کے قریب دسی بموں اور خود کار ہتھیاروں کی فائرنگ سے فضا گونج اٹھی۔ ہاشم نے فرحان کا ہاتھ تھاما اور ایک طرف بھاگا بہت سے دوسرے قیدی بھی فرار کی کوشش کر رہے تھے۔ محافظ دستے کی طرف سے فرار ہونے والے قیدیوں پر فائرنگ بھی گئی۔ بہت سے مارے گئے اور کئی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ فرار ہونے والے قیدیوں میں وہ دونوں بھی شامل تھے، فائرنگ اور دسی بموں کے دھماکے اب بھی جاری تھے وہ دونوں جان بچنے کے لئے جیل سے نکل کر ایک طرف بھاگے۔ وہ سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دوڑ رہے تھے۔ رات کی تاریکی ان کی معاون تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو قیدیوں کی مخصوص وردی انہیں کسی نہ کسی مشکل میں ڈال سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مضافاتی علاقے میں داخل ہوچکے تھے یہاں خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

بھاگتے بھاگتے ایک جگہ ٹھوکر لگنے کے باعث ہاشم چھوٹی سی کھائی میں جا گرا۔ جس کی خبر فرحان کو نہ ہوسکی وہ بدستور بھاگتا رہا جھاڑیوں کے جھنڈ سے باہر نکلا۔ مگر مزید بھاگنا اسے نصیب نہ ہوا۔ ایک رائفل کی نال اس کی طرف تنی ہوئی تھی یہ ایک تنومند پولیس اہلکار تھا جو اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو۔ تو یہاں جھاڑیوں میں رفع حاجت کے لئے آیا تھا کہ بھاگنے کی آواز سن کر جھاڑیوں سے نکل آیا میرا خیال تھا کہ کوئی چور اچکا ہوگا مگر تمہارے جسم پر موجود قیدیوں کی مخصوص وردی یہ ظاہر کر رہی ہے کہ تم جیل سے

مفرور قیدیوں میں سے ایک ہو جن کی تلاش میں ہم پولیس والوں کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں اور تمہاری گرفتاری کی صورت میں ادیب خان یعنی میری ترقی یقینی ہے۔" پولیس اہلکار ادیب باتونی معلوم ہوتا تھا خوشی سے اس کا باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

فرحان کا دل ڈوبنے لگا اس پولیس اہلکار کے ہاتھوں اس کی گرفتاری کا مطلب جیل کی سلاخیں اور تختہ دار تھا۔ مزاحمت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ادیب خان چوکنا کھڑا تھا رائفل کی نال کا رخ فرحان کی طرف اور انگلیاں ٹریگر پر تھیں اس کی انگلی کی ہلکی سی جنبش اسے موت سے ہمکنار کرسکتی تھی ہاشم کا بھی کہیں اتا پتا نہیں تھا، نہ جانے وہ راستے میں کہاں رہ گیا تھا۔

"اپنے ہاتھ سر سے بلند کرکے اس طرف چلتے ہوئے سڑک تک پہنچو۔" سپاہی ادیب خان نے نیا حکم صادر کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق فرحان نے ہاتھ سر سے بلند کئے۔ اور اس کے آگے آگے مرے ہوئے قدموں سے چلنے لگا یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ وہ پنچھی کی طرح صیاد کی قید میں آچکا ہے۔

اچانک اسے اپنے پیچھے سپاہی کے کراہنے اور پھر کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بے اختیار مڑا اس کے پیچھے ہاشم موجود تھا جس کے ہاتھ میں بڑا سا پتھر تھا۔ غالباً اسی پتھر سے اس نے ادیب کے سر پر وار کیا تھا اور ادیب سر پر چوٹ لگنے سے آنا فانا غنیل ہو چکا تھا۔ "اس سے پہلے کہ اس کے دوسرے ساتھی بھی یہاں پہنچ جائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے ویسے بھی جنگل پر حملے اور ہمارے فرار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہوگی اور شہر بھر کی پولیس ہماری تلاش میں ہوگی۔" ہاشم نے کہا۔

"لیکن قیدیوں کی اس مخصوص وردی کا کیا کریں یہ تو ہمیں ہر جگہ مشکل میں پھنسادے گی۔" فرحان نے تشویش زدہ لہجے میں بولا۔

"ہم میں سے ایک کی مشکل تو حل ہوسکتی ہے۔" ہاشم نے معنی خیز لہجے میں کہا اور سپاہی کے جسم سے پولیس کی وردی اتارنے لگا کچھ دیر بعد وہ پولیس یونیفارم میں کھڑا تھا۔ جبکہ اس نے اپنی قیدیوں والی وردی بے ہوش ادیب کو پہنادی تھی سپاہی کی بھاری بھرکم رائفل اٹھانا انہوں نے غیر ضروری سمجھا۔ اور ایک طرف بھاگنے لگے کچھ دیر بعد ان کے سامنے ریل کی پٹری آگئی اب وہ دونوں ریل کی پٹری پر دوڑ رہے تھے قریب ہی کہیں سے ٹرین کے وسل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "میرے خیال میں نزدیک ہی ریلوے اسٹیشن ہے اور ٹرین اسی طرف روانہ ہوچکی ہے اس وقت ٹرین پر سوار ہو کر اس علاقے سے دور جاسکتے ہیں۔" ہاشم نے بھاگتے ہوئے کہا اور فرحان کو لے کر ٹرین کی لرزتی کانپتی پٹریوں سے نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر بعد انجن مخالف سمت سے آتی ٹرین دکھائی دی۔ ٹرین کی رفتار واقعی اس وقت کم تھی ٹرین کے قریب آتے ہی وہ کوشش کرکے فرسٹ کلاس کی ایک بوگی میں سوار ہوگئے خوش قسمتی سے اس بوگی میں صرف چند مسافر تھے جو رات کے اس پہر سو رہے تھے وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے چہرے پر رومال لپیٹے سو رہا تھا۔

یہ فرحان کے حق میں بہتر ہی تھا کیونکہ وہ اس وقت بھی جیل کی وردی میں تھا۔ جبکہ ہاشم پولیس کی وردی کے باعث بہتر پوزیشن میں تھا۔ نوجوان کے قریب ہی ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس رکھا ہوا تھا۔ ہاشم کی نگاہیں اس اٹیچی کیس پر جمی ہوئی تھیں۔ فرحان اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ چکا تھا غالباً وہ اٹیچی کیس اڑانے کے چکر میں تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس اٹیچی کیس میں اس نوجوان کے کپڑے بھی ہوں گے اس کے کپڑے انہیں کسی بھی مشکل سے بچاسکتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور ٹرین کی وسل بجی۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی ریلوے اسٹیشن آنے والا ہے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم ٹرین سے اتر جائیں۔ اور اترتے اترتے اس نوجوان کا اٹیچی کیس بھی اٹھالیں۔" ہاشم نے سرگوشی کی اور اس نے

اثبات میں سر ہلا کر اس کی تجویز کی تائید کی۔

اب ٹرین کی رفتار خاصی کم ہو چکی تھی۔ ٹرین کی کھلی ہوئی کھڑکی سے پلیٹ فارم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں اٹھے اور نوجوان کے قریب پہنچے ٹرین کی رفتار خاصی کم ہو چکی تھی نوجوان نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اور اس کے چہرے سے رومال سرکتے ہی وہ حیرت سے اچھل پڑے وہ نوجوان ہو بہو فرحان کا ہم شکل تھا۔

اگر فرحان اپنے چہرے پر موجود بے ترتیب گھنی داڑھی صاف کرلیتا تو ان دونوں میں کوئی بھی فرق نہیں تھا نوجوان بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا شاید اس لئے بھی تھا کہ وہ قیدی کی وردی میں تھا۔ اسی وقت ہاشم کی نظر پلیٹ فارم پر موجود چند پولیس اہلکاروں پر پڑی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ ان میں سے ایک انسپکٹر ریک کا آفیسر تھا۔ ان کے ساتھ سپاہی ادیب بھی موجود تھا جسے وہ اس سنسان مقام پر بے ہوش چھوڑ آئے تھے اس کے جسم پر اس وقت بھی ہاشم والی قیدی کی وردی موجود تھی، پولیس نے بڑی چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اس پلیٹ فارم پر گھیرنے کا بندوبست کرلیا تھا۔ پولیس اہلکاروں کی نظر بھی ان پر پڑ چکی تھی۔

"بھاگو فرحان۔" ہاشم نے کہا اور فرحان نوجوان کا اٹیچی کیس اٹھا کر بھاگنے کے لئے مڑا پلیٹ فارم پر موجود پولیس انسپکٹر نے اس کا ارادہ بھانپ کر اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور ٹریگر دبادیا۔ اسی وقت اس کے ہمشکل نوجوان اسے اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر بھاگتے دیکھ کر سیٹ سے اٹھا اور انسپکٹر کی چلائی ہوئی گولی اٹھتے ہوئے نوجوان کی گردن میں لگی اور دوسری طرف سے گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ نوجوان دلدوز انداز میں چیختا ہوا گر گیا۔

وہ دونوں اٹیچی کیس اٹھا کر ٹرین کی دوسری سمت کے دروازے سے اترگئے اور ریلوے ٹریک پر بھاگنے لگے۔ گولی مفرور قیدی کے بجائے مسافر کو لگتے دیکھ کر پولیس اہلکار بوکھلا چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے ہاشم اور فرحان ریلوے ٹریک پر کافی آگے نکل چکے تھے پولیس اہلکار ٹرین پر چڑھ کر دوسری طرف کے دروازے سے اترے تو ان کے راستے مسدود ہو چکے تھے کیونکہ ساتھ والی ریلوے ٹریک پر آنے والی ٹرین گزر رہی تھی ٹرین گزر جانے کے بعد خالی ریلوے ٹریک انکا منہ چڑا رہی تھی دونوں مفرور قیدی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔ ادھر ان دونوں نے ریلوے ٹریک سے کافی دور جاکر اٹیچی کیس کا معائنہ کیا خوش قسمتی سے اٹیچی کیس لاک نہیں تھا۔ اندر چند جوڑے کپڑے ایک الیٹر اور کچھ تعلیمی سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ تھا۔ جس میں عنایت ولد فرید کا نام درج تھا۔ شناختی کارڈ پر آویزاں تصویر فرحان کے اس بدقسمت ہمشکل مسافر کی تھی جو اس کے نام کی آنے والی گولی کا شکار ہوکر مر چکا تھا۔ ان دونوں نے جلدی جلدی اٹیچی کیس سے کپڑے نکال کر پہنے تعلیمی سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ اور لیٹر فرحان نے اپنی جیب میں ڈال لئے۔" سنو دوست صبح کی سنسنی خیز سنسان ہونے والی ہے۔ میں تو اپنے اڈے پر جاؤں گا۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ چلو ویسے بھی تم جرائم کی جس راہ پر چل پڑے ہو اس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں اگر پولیس کے ہتھے چڑھے تو گولی کا شکار ہوجاؤ گے یا پھر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔" ہاشم نے کہا۔

"نہیں دوست اب میں اکیلا کام کروں گا۔ پہلے بھی میں اپنے گروپ کے ایک فرد کی غلطی سے پھنس گیا تھا۔" فرحان نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ہاشم کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے جبکہ فرحان جرائم کی اس لائن پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔ "جیسے تمہاری مرضی اپنا خیال رکھنا اور کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو میرے اڈے پر آجانا۔" ہاشم نے پرخلوص لہجے میں کہا اور اس سے ہاتھ ملا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ وہ کچھ دیر ہاشم کو جاتے دیکھتا رہا پھر وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ وہ اور اھر ادھر خوار اں رسیدہ پتے کی طرح ڈولتا ہوا وقت گزارنے لگا کہ پھر اسے ایک موقع مل ہی گیا کہ وہ مطلوبہ جگہ سے بہت دور نکل جائے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک بحری جہاز میں سوار تھا۔ قانون سے بچنے کے لئے اس نے مناسب یہی سمجھا کہ کچھ عرصے کے لئے ملک سے باہر چلا جائے اس سلسلے میں عنایت نے ڈاکومنٹس اس کے کام آئے اس نے اپنا نام عنایت ہی ظاہر کیا تھا۔ اس بحری جہاز کو بندرگاہ سے روانہ ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

رات کا پچھلا پہر تھا وہ اپنے کیبن میں سویا ہوا تھا کہ سائرن کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ جہاز بری طرح ڈگمگا رہا تھا اسی وقت مائیک پر جہاز کے عملے کے کسی فرد نے اعلان کیا۔ ”جہاز سمندری طوفان میں پھنس چکا ہے تمام مسافروں سے درخواست ہے کہ اپنے اپنے مذہبی طریقہ کار کے مطابق دعا کریں۔“

بری طرح ڈولتے بحری جہاز کو ایک زوردار جھٹکا لگا کھڑے ہونے کی کوشش کرنے والا فرحان نیچے اور اس کا سر بری طرح کسی چیز سے ٹکرایا۔ اور وہ ہوش و حواس سے عاری ہوگیا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو جہاز کے ایک بڑے سے تختے پر پڑے پایا۔ تختہ سمندر کی لہروں پر بہتا ہوا جا رہا تھا۔ سورج کی کرنیں بدن کو جھلسا رہی تھیں پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ بے بسی سے سمندر کے کڑوے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک تختے پر لیٹا سمندر کی لہروں کو خوف سے دیکھتا رہا۔ اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا کہ بحری جہاز سمندری طوفان یا کسی دوسری وجہ سے تباہ ہو چکا تھا اور شاید تمام مسافر ڈوب کر مر چکے تھے اس نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا کہ جس اللہ نے اسے پھانسی کے پھندے سے بچایا اور سمندری طوفان سے تباہ ہونے والے جہاز میں سے اسے اب تک زندہ رکھا اگر اس کی زندگی باقی ہے تو وہی اللہ اسے بچائے گا۔

شام کے قریب اسے دور سے ایک جزیرہ دکھائی دیا۔ وہ خوشی کے مارے اٹھ کر بیٹھ گیا تختہ جزیرے کے ساحل کے قریب پہنچ گیا ایک چٹان کے پاس رک گیا تھا وہ تختے سے نیچے اتر گیا سمندر کا پانی اس کے سینے تک تھا وہ چلتا ہوا سمندر سے باہر نکلا یہ ایک چھوٹا سا ویران جزیرہ تھا جس کے چاروں اطراف درخت تھے۔ ان درختوں پر سیب سے مشابہ عجیب قسم کے پھل تھے یہ درخت زیادہ اونچے نہیں تھے اس لئے وہ باآسانی ایک درخت پر چڑھ گیا سیب سے مشابہ یہ پھل خاصا لذیذ تھا پیٹ بھرنے کے بعد وہ درخت سے اتر گیا۔

بھوک تو ختم ہوگئی تھی لیکن پیاس کی شدت اب تک حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے وہ اس ویران اور سرسبز جزیرے پر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگا کچھ دور جا کر اسے ایک گڑھا دکھائی دیا۔ چاندنی روشنی میں صاف دکھائی دیتا تھا کہ گڑھا پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا وہ بے تابی سے دوڑتا ہوا گڑھے کے قریب پہنچا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ہاتھوں کے چلو میں پانی لیا۔ قدرے میلا سا پانی یقیناً بارش کا تھا۔ پیاس اس قدر اس پر غالب آ چکی تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں کے چلو میں موجود میلا سا پانی پی لیا۔ اسے باہر پانی سے بھلا وہ کیا میرا اب ہوتا وہ بے صبروں کی طرح پانی پیتا چلا گیا، یہ میلا سا پانی اسے اس وقت آب حیات سے کم نہ لگا تھا بھوک اور پیاس ختم ہوئی تو ایک نئی فکر ستانے لگی کہ وہ اس ویران اور سنسان جزیرے میں تنہا کب تک رہے گا۔ اور کھلے آسمان تلے سوئے کیسے؟

تقدیر نے اسے اس جزیرے تک پہنچایا تو وہ اسے لیکن اب یہاں سے نکلنا اسے ناممکن نظر آ رہا تھا۔

کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے وہ بھی سو گیا۔

ایک نامانوس غراہٹ آمیز آواز پر اس کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ علی الصبح کا وقت تھا اس سے کچھ فاصلے پر ایک جسیم مگر مچھ موجود تھا جس کے کھلے ہوئے منہ سے خوف ناک دانت صاف دکھائی دے رہے تھے مگر مچھ کی نگاہیں فرحان پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر مچھ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ ”فرحان نے بھاگنے میں اس سے بھی تیزی دکھائی اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا وہ خوف ناک دیو ہیکل مگر مچھ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود انتہائی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ فرحان بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا۔ وہ ریت کے چھوٹے

چھوٹے ٹیلوں کو پھلانگتے ہوئے کافی دور تک نکل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے مڑ کر دیکھا مگر مچھ اس کے پیچھے نہیں تھا گویا وہ مگر مچھ سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو چکا تھا اس نے ایک جگہ رک کر اپنے پھولے ہوئے سانسوں کو سنبھال کیا اگر اس کی آنکھ بروقت نہ کھلتی تو مگر مچھ اس کی گردن دبوچ لیتا۔ یہ سوچتے ہی اسے جھرجھری سی آ گئی کچھ دیر ستانے کے بعد وہ آگے چل دیا۔

تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد اسے دور سے درختوں کے تنے اور شاخوں سے بنے جھونپڑے دکھائی دیئے۔ ”گویا اس جزیرے پر انسانی وجود موجود ہے۔“ یہ سوچتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

صبح ہو چکی تھی۔ جب وہ مچھیری بستی کے قریب پہنچا، یہ درجنوں جھونپڑوں پر مشتمل آبادی تھی۔ اسی وقت ایک جھونپڑی سے ایک نوجوان سانولی رنگت کی لڑکی باہر نکلی وہ ششدر رہ گیا، عورت نے ستر پوشی کے لئے جسم پر کسی درخت کے بڑے بڑے پتے لپیٹ رکھے تھے عورت اسے دیکھتے ہی نامانوس زبان میں چیخ کر کچھ بولی۔ تو مختلف جھونپڑیوں سے بہت سی عورتیں اور لڑکیاں باہر نکلیں اور اسے گھیر لیا ان کے ہاتھوں میں کٹاری نما تیز دھار تلواریں تھیں، چار پانچ تگڑے دھڑنگ بچے بھی اس جگہ موجود تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح چیختی ہوئی اس کے اردگرد ہیجان خیز رقص کر رہی تھیں ان کی اچھل کود کے دوران چوتوں سے ڈھکے نشیب و فراز صاف دکھائی دے رہے تھے فرحان حیرت سے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اس نے اپنے جسم پر زوردار چٹکی بھری تکلیف کا احساس نے جتلا دیا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ وہ سچ مچ پتھر کے دور کے زمانہ قدیم کے کسی جزیرے پر قدم رکھ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس ہیجان خیز رقص کا اختتام ہوا۔ اور ایک خوبصورت لڑکی آگے بڑھی اس نے سر پر پرندوں کے پروں سے بنا عجیب و غریب تاج پہن رکھا تھا۔ اس نے فرحان کے قریب پہنچ کر اپنی نامانوس زبان میں کچھ الفاظ ادا کئے۔ اور اپنے گلے میں پڑی پتھروں کی مالا نکال کر فرحان کے گلے میں ڈال دی۔ اور طلوع ہونے والے سورج کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی فرحان استعجاب آمیز نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اس لڑکی نے سجدے سے سر اٹھایا اور فرحان کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچتے ہوئے ایک جھونپڑی کی طرف لے جانے لگی پھر وہ ایک جھونپڑی کے سامنے رکی اور اپنی ساتھی لڑکیوں سے کچھ کہا تو وہ تتر بتر ہوگئیں البتہ چار پانچ تلوار بردار لڑکیاں جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی ہوگئیں۔ جھونپڑی میں گھاس پھونس کی مدد سے بستر بنایا گیا تھا۔

لڑکی نے اسے دھکا دے کر اس بستر پر گرا دیا کٹاری نما تلوار اب تک اس کے ہاتھ میں تھی اس نے کٹار ایک طرف رکھی اور فرحان کے قریب بیٹھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا اور فرحان کی شرٹ کے بٹن کھولنے لگی فرحان اس کا ارادہ بھانپ کر بدک گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر انکار میں گردن ہلانے لگا وہ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود شراب اور شباب سے دور رہا تھا۔ اسے انکار میں گردن ہلاتے دیکھ کر لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے دوبارہ تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تلوار کی دھار اس کی گرد ن پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے فرحان کی شرٹ کے بٹن کھول کر شرٹ ایک طرف اچھال دی فرحان بے بسی سے اسے دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس حسین بلا سے پیچھا چھڑانے وہ اس جزیرے میں تنہا تھا۔ جبکہ درجنوں کی تعداد میں لڑکیاں تلواروں سے مسلح تھیں اور فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔

خیر فرحان نے بے اختیار اسے بانہوں میں بھر لیا وہ بھول چکا تھا کہ وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا ہے وہ بھی یہی چاہتی تھی اس لئے اس نے کھلکھلاتے ہوئے پیش قدمی کی اجازت دے دی۔

پھر دونوں نے چند لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا وہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے لیکن حسن اور عشق زبان کا محتاج نہیں ہوتا اور جذبات کی تو ایک الگ ہی زبان ہوتی ہے۔

جذبات کا طوفان تھما تو وہ کافی آسودہ نظر آرہی تھی جبکہ فرحان شرمسار تھا کہ وہ اپنے عہد سے پھر گیا اس نے بہت پہلے عہد کیا تھا کہ مناصل کے علاوہ کسی لڑکی کی طرف کبھی نہیں دیکھے گا مگر وہ حالات کے گرداب میں پھنس کر اپنا عہد توڑ بیٹھا تھا، وہ دن اس نے اس لڑکی کی قید میں گزارا، کھانے کے لئے عجیب قسم کے پھل اور مچھلیاں تھیں۔

دوسرے روز وہ اس لڑکی کے ساتھ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ عورتیں باہر چہل قدمی کررہی تھیں جبکہ چند بچے ایک طرف آپس میں کھیل کود رہے تھے سب سے حیرت انگیزیات اسے ان عورتوں میں گہری سانولی رنگت کا ایک مرد دکھائی دیا وہ پستہ قامت شخص تھا جس نے جگہ جگہ سے پھٹے بوسیدہ کپڑے پہن رکھے تھے وہ شخص شکل وصورت سے کسی اور جگہ کا دکھائی دیتا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کا دایاں ہاتھ تھام رکھا تھا فرحان اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ فرحان اس شخص کی طرف بڑھا اور اس سے مصافحہ کیا۔ ''میرا نام فرحان ہے اور میرا تعلق پاکستان سے ہے کیا تم مجھے بتانا پسند کروگے کہ تم یہاں کیسے آپہنچے۔ اور اس پراسرار جزیرے میں یہ پراسرار عورتیں کون ہیں؟ یہ پراسرار جزیرہ کس ملک میں ہے؟''۔

''میں رفیق ہوں اور میرا تعلق بنگلہ دیش سے ہے میں جس لانچ پر سوار تھا وہ سمندر میں پوشیدہ ایک چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہوئی ہم پانچ افراد بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوگئے اور بھٹکتے ہوئے اس جزیرے میں آن پہنچے اور پھنس گئے۔ اٹھارہ تعلق رکھنے والا ایک شخص پہلے سے یہاں موجود تھا اس نے اس قید میں کئی سال گزر چکے تھے مجھے اسی کی زبانی یہاں کے رہن سہن اور رسم ورواج کے بارے میں علم ہوا اس پراسرار جزیرے پر مرد ناپید ہیں اور یہ عورتیں سورج کی پرستش کرتی ہیں۔ تمہاری بیوی یہاں کی سردار ہے یہاں کے رسم ورواج کے مطابق مرد عورتوں کی طرح گھروں پر کام کرتے ہیں سب سے خوف ناک بات یہ ہے کہ اگر کسی کی بیوی مرجائے تو اسے اس کی بیوی کی لاش کے ساتھ کچھ فاصلے پر واقع ایک غار نما سرنگ میں قید کرکے اس کا دہانہ مضبوط پتھر سے بند کردیا جاتا ہے ظاہر وہ بے چارا بھوک پیاس اور الاؤں کی بدبو سے مرجاتا ہے یہاں سمندر میں آدم خود مچھلیاں بھی موجود ہیں جو موقع ملتے ہی انسان کو بوٹی کرجاتے ہیں میرے تین ساتھی انہی مگرمچھوں کا شکار ہوگئے تھے۔ جبکہ چوتھے کو اس کی بیوی کے مرتے ہی اس کی لاش کے ساتھ سرنگ نما غار میں قید کردیا گیا۔

یہ جزیرہ نہ ہی کسی ملک کی حد میں ہے اور نہ ہی بحری جہاز یا لائٹ کا روٹ ہے یہاں سے نکلنے کا خیال بھی دل سے نکال دو اب ہمیں یہاں مرنا ہے۔ رفیق نے اپنی روداد مکمل کی تو فرحان کی سٹی گم ہوگئی گویا وہ ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ اس شخص کی ادھیڑ عمر بیوی یا مالکہ لاتعلقی سے ان کے قریب ہی موجود تھی فرحان کی بیوی بھی ان کے قریب آچکی تھی وہ اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوگئی اور اسے گھاس کے بستر پر دھکیل کر خود بھی اس پر لدھ گئی۔ لیکن آج فرحان کے جذبات سرد تھے۔

رفیق کی زبانی اس پراسرار جزیرے کی حقیقت جانتے ہی وہ ہراساں ہوچکا تھا اسے یہ سوچ کر ہی دہشت ہورہی تھی کہ اسے عرصہ دراز اس جزیرے میں گزارنا تھا اگر وہ آدم خور مگرمچھوں سے بچ جاتا اور اس کی بیوی یا مالکن جو اس قبیلے کی سردار بھی تھی اس سے پہلے مرجاتی تو اسے بھی اسی کے ساتھ اس غار نما سرنگ میں دھکیل دیا جاتا۔

فرحان کو وہاں رہتے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے اس روز وہ مچھلیوں کے شکار کے لئے ساحل سمندر پر آئے ہوئے تھے کہ اچانک افراتفری مچ گئی ایک چٹان کی آڑ سے ایک جسیم مگرمچھ نکلا۔ اور عورتوں کا قافلہ فرحان اور رفیق سمیت ایک طرف بھاگا مگرمچھ کسی عفریت کی طرح ان کے پیچھے تھا۔ بھاگتے بھاگتے فرحان کی بیوی راستے میں پڑے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا جانے کے باعث گرگئی، فرحان مڑا اور سہارا دے کر اسے اٹھانا چاہا مگر یہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس لڑکی کا

دایاں پاؤں بری طرح زخمی ہوچکا تھا، فرحان نے اس کے پاؤں کو پکڑ رکھا تھا کہ اتنے میں مگرمچھ اس کے قریب پہنچ چکا تھا فرحان اسے اس کے حال پر چھوڑ کر ایک طرف بھاگا اور مگرمچھ نے اس لڑکی کی ٹانگ کو اپنے جبڑوں میں دبوچ لی۔

فضا اس لڑکی کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھی وہ اس کی چیخوں کی آواز سن کر مڑا اور جہاں کا تھا وہیں تھم گیا۔ لڑکی کی ٹانگ مگرمچھ کے خونی جبڑوں میں تھی اور وہ درد اور تکلیف کی شدت سے مسلسل چیخ رہی تھی اسی وقت ایک طرف سے دو مگرمچھ نکلے اور فرحان کی سمت لپکے وہ اس لڑکی کو بھول کر اپنی جان بچانے کے لئے بستی کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچ کر دم لیا۔

بالآخر وہ دن آن پہنچا تھا جس کا فرحان کو ڈر تھا۔ کچھ گھنٹوں بعد عورتوں کا قبیلہ فرحان اور رفیق کے ساتھ ساحل سمندر پر گیا۔ اور اس جگہ کا رخ کیا جہاں مگرمچھ نے سردار لڑکی کو دبوچا تھا۔ وہاں اب اس کے جسم کی چند بچی کھچی ہڈیاں پڑی تھیں۔ جنہیں ایک عورت نے سمیٹا۔ شام کے قریب تلوار بردار عورتوں نے فرحان کی چیخ وپکار کی پرواہ کئے بغیر اسے گھسیٹا اور اپنی بستی سے کافی دور ایک غار نما سرنگ کے قریب لے گئیں۔ سات آٹھ عورتوں نے سرنگ کے دہانے سے بمشکل بھاری بھرکم پتھر ہٹایا اور اس کی بیوی کی بچی کھچی ہڈیاں اس سرنگ میں پھینک کر اسے بھی اندر دھکیل دیا۔ اور دہانے پر بھاری بھرکم پتھر رکھ دیا گیا۔

یہ کافی طویل غار نما سرنگ تھی جو زمین میں بنی ہوئی تھی جگہ جگہ انسانی جسم کی بوسیدہ ہڈیاں اور گوشت پوست سے محروم کھوپڑیاں پڑی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہی وہ ڈر اور خوف سے کانپنے لگا۔ سرنگ میں لاشوں کے تعفن سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اس کا جی اس بدبو سے متلانے لگا یہ سوچ بھی کم خوف ناک نہ تھی کہ اسے اس بدبودار جگہ میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزارنے تھے اگر اسے بھوک اور پیاس سے دو دن میں مرنا تھا تو اس بدبو سے چند گھنٹوں میں میں مرجاتا۔ وہ چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک کھوپڑی سے ٹھوکر لگنے کے باعث گر گیا۔ وہ دوبارہ اٹھ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

جیسے جیسے دن ڈھلتا جارہا تھا اس سرنگ میں اندھیرا چھاتا جارہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں مکمل تاریکی چھا گئی، بدبو سے اسے الٹیاں بھی ہوئیں وہ چند لمحے وہیں بے سدھ پڑا رہا پھر چند قدم آگے بڑھ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اسے خیال آیا یہ سب اس کی گناہ آلود زندگی کی سزا تھی۔ اس نے زندگی بھر نماز نہ پڑھی تھی وہ ماں باپ کا نافرمان تھا۔ اور اس نے دولت کی لالچ میں جرائم کی راہ کا انتخاب کیا تھا۔ اب ایسی مشکل میں آن پھنسا تھا کہ نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

جب انسان مشکل میں پھنستا ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے اس نے بھی یہی کیا ایک طرف دوزانو ہوکر بیٹھ گیا احساس شرمندگی اور ندامت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''یا اللہ تو مہربان ہی رحیم وکریم ہے۔ یا اللہ میں نے ماں باپ کا دل دکھایا میں بہت گناہ گار ہوں، اے میرے خدا میرے گناہوں کو معاف فرما۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کروں گا۔ جرائم کی دنیا سے کنارہ کشی کرلوں گا۔ اے میرے خدا جس طرح تو نے دہکتی ہوئی آگ میں حضرت ابراہیمؑ کی مدد فرمائی اور جس طرح تو نے مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونسؑ کو محفوظ رکھا اور آزادکیا اور جس طرح تو نے اندھے کنویں میں سے حضرت یوسفؑ کو بچایا، یا اللہ مجھے بھی مصیبت سے بچا اور اس پراسرار جزیرے سے بحفاظت نکال دے۔'' وہ دعا مانگ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ روتا بھی جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پشیمانی کے وہ آنسو بہہ رہے تھے جو اللہ کو پسند ہیں۔

اسی وقت اس کے کانوں میں ایک ٹھوس آواز ابھری۔ ''اپنی جگہ سے اٹھو اور سیدھے چلتے جاؤ اس غار سے نکلنے کے بعد ساحل سمندر پر پہنچ جاؤ گے۔''

''آپ کون ہے؟'' اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر گھپ اندھیرے

اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ”میں اسی لازوال قوت کے تابع ہوں جسے تم نے سچے دل سے پکارا ہے۔ اس سے زیادہ بتانے کی مجھے اجازت نہیں۔“ وہی آواز دوبارہ ابھری تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ”مجھے ابھی مزید کتنا آگے جانا ہے۔؟“ اس نے پوچھا لیکن اس بار جواب میں کوئی آواز نہ سنائی دی۔

وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد فرحان خوشی سے کھل اٹھا اور اس سرنگ سے باہر نکلا کر ساحل سمندر کی طرف چلنے لگا۔ ساحل سمندر پر پہنچ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا، ساحل سے کافی فاصلے پر ایک بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ اس نے اپنی شرٹ اتاری اور فضا میں لہراتے ہوئے ایک بڑی سی چٹان پر کھڑا ہو کر مدد کے لئے پکارنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی شرٹ بھی لہراتا جارہا تھا۔

پھر شاید اسے جہاز سے دیکھ لیا گیا تھا ایک موٹر بوٹ بحری جہاز سے اتاری گئی کچھ دیر بعد موٹر بوٹ اس سے کچھ فاصلے پر موجود تھی جس میں ایک درمیانی قد وقامت کا نوجوان شخص سوار تھا فرحان چٹان سے اتر کر پانی میں چلتا ہوا موٹر بوٹ تک جا پہنچا، اس شخص نے اسے سوار ہونے میں مدد دی۔ ”میرا نام ہارون پاشا ہے تم کون ہو؟ اور سمندر میں گھرے اس ویران جزیرے میں کیسے پہنچے۔؟“ بوٹ سوار نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے پوچھا۔

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں موٹر بوٹ جلدی سے بحری جہاز کی طرف لے چلو۔ اس جزیرے میں آدم خور مگرمچھ بھی موجود ہیں۔“ فرحان نے کہا۔

آدم خور مگرمچھوں کا سنتے ہی ہارون پاشا کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اس نے بوٹ اسٹارٹ کی کچھ دیر بعد وہ جہاز کے عرشے پر موجود تھے۔ اس کے گرد کافی سارے مسافر اور جہاز کا عملہ بھی موجود تھا۔ بحری جہاز کا کپتان ہارون ایک مخلص انسان تھا وہ اسے اپنے کیبن میں لے آیا۔ پہننے کے لئے کپڑے دیئے جب وہ چینج کر کے ہارون پاشا کے قریب آیا تو چائے تیار ہو چکی تھی ہارون کے استفسار پر اس نے اسے بھی اپنا نام عنایت بتایا عنایت کے ڈاکومنٹس پولی تھین کی تھیلی میں اس کے لباس میں اب تک موجود تھے۔

وہ فرحان کی روداد حیرت اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ ”اگر خود ہمارے ساتھ ایک پراسرار واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو ہم تمہارے سنائے گئے قصہ کو من گھڑت کہانی سمجھتے۔ کھلے سمندر سے گزرتے ہوئے، بحری جہاز ہمارے کنٹرول سے باہر ہو گیا تھا اور یہاں پہنچتے ہی خود بخود رک گیا، ہم حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہمیں یہاں تک لانے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی، ہم عرشے پر کھڑے تھے کہ تم پر نظر پڑ گئی میں سمجھ گیا کہ تقدیر ہمیں اس لئے یہاں لے آئی تھی کہ وہ اس پراسرار جزیرے سے تمہیں نکالنا چاہتی تھی، اللہ سچے دل سے کی گئی دعا ضرور سنتا ہے۔“ ہارون نے کہا۔

”آپ لوگ کہاں جارہے ہیں۔؟“ فرحان نے پوچھا۔

”ہمارا جہاز پاکستان جارہا ہے۔“ ہارون نے جواب دیا۔ اور فرحان حیران رہ گیا۔

”دیکھو دوست تم پاکستان سے باہر جارہے تھے اور تقدیر تمہیں واپس تمہارے وطن لے جارہی ہے، ضرور اس میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے، اب تم بے خوف وخطر اپنے وطن لوٹ جاؤ تم نے سچے دل سے تو یہ کی ہے اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔“ ہارون نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ان کا بحری جہاز چند دن بعد ساحل سمندر پر لنگر انداز ہوا اور ہارون پاشا نے اسے گلے سے لگا کر رخصت کیا، ہارون نے اسے رخصت کرتے وقت اصرار کر کے پانچ ہزار روپے دیئے۔

فرحان نے ہیئر ڈریسر کی دکان میں جا کر شیو کروائی بال کٹوائے اور پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ وہ بے خود سا ایک طرف چل رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی انجانی قوت اسے کہیں لے جانا چاہتی ہے اس کے قدم رکے تو وہ ایک مزار کے قریب کھڑا تھا اس نے فاتحہ خوانی کی اور مزار کی سیڑھیاں اتر کر بس اسٹاپ پر پہنچا اور بلا

ارادہ ایک بس میں جا بیٹھا۔

اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے والدین اور بھائیوں کا سامنا کرتا اور وہاں جاتے ہی پولیس نے اسے دھر لینا تھا، اور آخر کار اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا۔

اس کے پاس جو عنایت کے کاغذات تھے اس میں ایک خط بھی موجود تھا۔ لفافہ چاک تھا اس نے لفافے میں سے کاغذ نکالا جس کا متن کچھ اس طرح تھا۔

پیارے بیٹے عنایت!

تمہارے بھائی ہدایت اللہ اور تمہاری بھابھی کو دلاور خان نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ بیٹا گاؤں میں مت آنا دلاور خان تمہیں بھی مار ڈالے گا۔ بیٹا اب تم ہی میرا واحد سہارا ہو اور میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں نوکری ملتے ہی مجھے خط لکھ دینا اور وہیں کرائے پر کوئی مکان لے لینا، میں خود تمہارے پاس آجاؤں گی۔

بدنصیب عاصمہ

خط پڑھتے ہی اسے دھچکا لگا۔ وہ مظلوم ماں ایک بیٹا اور بہو پہلے ہی کھو چکی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی پولیس کی گولی کا شکار ہو کر لاوارث قبر میں دفنا دیا گیا ہے تو ہو سکتا ہے اس کا دل دھڑکنا بھول جائے۔ وہ احساس شرمندگی کا شکار تھا عنایت اسی کی وجہ سے مارا گیا تھا اس نے سجاوند عنایت کا ہم شکل ہے اس کے گاؤں جا کر عاصمہ سے عنایت بن کر ملے گا اور اس کے دکھوں کا مداوا کرے گا۔ شاید یہی اس کا کفارہ ہوگا، یہ سوچتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔

دوسرے روز وہ بس کے ذریعے فیض آباد پہنچا، لاری اڈے پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف پیر آباد جانے والی مسافر وین کھڑی تھی وہ ٹکٹ لینے کے لئے آگے بڑھا مگر ٹھٹک کر رک گیا۔

ٹکٹ کاؤنٹر کے قریب گلابی کپڑوں میں ملبوس لڑکی کو دیکھتے ہی وہ دھک سے رہ گیا اسے یوں لگا جیسے اس کے قدموں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہو، اگر وہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوتا اور اس کے گلے میں پھندا ہوتا تو اس کی قلبی اور ذہنی کیفیت وہ نہیں ہو سکتی تھی جو اس لڑکی کو دیکھ کر ہوئی تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی زندگی میں اس سے اس کا سامنا ہوگا۔

وہ لڑکی کوئی اور نہیں مناحل تھی، وہی مناحل جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔

اس کے ساتھ ایک ہینڈسم سا نوجوان بھی تھا۔

”کیا یہ اس کا شوہر ہے؟“ یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اس نے چہرے کے گرد مفلر لپیٹا اور ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ مناحل بھی پیر آباد کے ٹکٹ لے رہی تھی، ان کے ٹکٹ لے کر کاؤنٹر سے ہٹتے ہی اس نے پیر آباد کا ٹکٹ لیا اور وین کی آخری نشست پر بیٹھ گیا۔

مناحل اس نوجوان کے ساتھ اس سے آگے کی سیٹ پر بیٹھی تھی فرحان نے اب تک چہرے پر مفلر لپیٹ رکھا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مناحل اسے پہچانے وہ پہلے ہی فرحان سے لئے دیئے رہتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے میڈیا کے ذریعے فرحان کے جرائم اور فرار کا علم ہو گیا ہوا ایسی صورت میں وہ فرحان سے نفرت کرنے لگتی کیونکہ وہ ڈی آئی جی حیدر علی کی بیٹی تھی جو اپنی اصول پسندی کی وجہ سے مشہور تھے، دوسرا اس کے ساتھ ہینڈسم نوجوان بھی تھا۔ جسے وہ اشعر کے نام سے مخاطب کر رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے مناحل نے اس سے شادی کر لی ہو۔؟“

وہ پیر آباد پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے مناحل اور وہ ہینڈسم نوجوان پیدل ہی ایک طرف چل دیئے وہ کچھ دیر وہاں رکا رہا اور سوچنے لگا، عنایت کی ماں کا گھر اس گاؤں میں کہاں ہے گاؤں کی گلیاں کو چے رات کے اس پہر ویران تھے۔ اور یہ مناسب نہیں لگتا تھا کہ کسی کا دروازہ بجا کر پوچھتا، اسی وقت اسے کسی نے مخاطب کیا۔ ”یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، چلو گھر کی طرف۔“ اس نے مڑ کر دیکھا وہ ایک تیس سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ ”چلو آؤ تمہیں گھر تک چھوڑ دوں، ماں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس شخص نے دوبارہ کہا اور فرحان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف چلنے لگا۔

"تم کون ہو؟" فرحان نے پوچھا۔

"گھر جا کر ماں کا خیال رکھنا وہ کافی کمزور ہو گئی ہیں اور دلاور سے ہوشیار رہنا گھبراؤ مت اللہ تمہاری مدد کرے گا، وہی اللہ جس نے فرعون کو اس کے لشکر سمیت دریا میں غرق کر کے آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا۔" اس شخص نے فرحان کے سوال کا جواب دیئے بغیر بے تاثر لہجے میں بولا۔

اب وہ ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے، فرحان نے چاند کی روشنی میں دیکھا اجنبی کے چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے اسے حیرت اس بات پر بھی تھی کہ چہرے پر مظفر ہونے کے باوجود اس شخص نے اسے عنایت کی حیثیت سے کیسے پہچانا۔ ان کے سفر کا اختتام ایک کچے مکان کے سامنے ہوا، فرحان نے لکڑی کے دروازے پر دستک دی جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ "شاید وہ سو رہی ہوں گی۔" فرحان نے کہا اور جواب نہ پا کر مڑا اسے یہاں تک پہنچانے والا وہ پراسرار شخص غائب ہو چکا تھا۔ "یہ کہاں چلا گیا۔" اس نے خود کلامی کی پھر سوچا۔ "شاید وہ اسے منزل تک پہنچا کر اپنے گھر چلا گیا ہو۔" اس نے دوبارہ دستک دی۔

کچھ دیر بعد قدموں کی چاپ دروازے کی طرف آتی سنائی دی دروازہ کھلا اور سفید بالوں والی ایک کمزور سی بوڑھی عورت نے باہر جھانکا یہ عنایت کی ماں عاصمہ تھی حالات نے قبل ازوقت اس کے چہرے پر جھریوں کا جال بچھا دیا تھا۔ فرحان نے اپنے چہرے سے جیسے ہی مظفر ہٹایا معاصمہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ "تو یہاں کیوں آیا میں نے تجھے یہاں آنے سے منع کیا تھا۔" وہ روتے ہوئے بولتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے پیار بھی کر رہی تھی جبکہ فرحان احساس جرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا اگر یہ جان جائے کہ میں اس کا بیٹا نہیں اور میری ہی وجہ سے عنایت مارا گیا ہے تو۔؟" یہ سوچتے ہی وہ لرز اٹھا۔

"آؤ اندر آؤ باہر بہت سردی ہے۔" وہ اسے لئے ہوئے اندر آئی اور ایک چارپائی پر بیٹھا کر خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں بان سے بنی ہوئی دو چارپائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک کے اوپر وہ دونوں بیٹھے تھے کمرے میں سوراخ کے بلب کی پیلی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بار بار فرحان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ رہی تھی۔ "ماں جی بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔؟" فرحان نے پوچھا۔ وہ اس کے بھیجے ہوئے خط میں پڑھ چکا تھا کہ کسی دلاور نامی شخص نے اس کے بڑے بیٹے ہدایت اللہ اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا تھا، عورت نے روتے ہوئے بتانا شروع کیا اس کی بیان کردہ سرگزشت سے فرحان کو جو کچھ معلوم ہوا وہ اس طرح تھا۔

عاصمہ پیر آباد کی رہائشی تھی، اس کے دو بیٹے تھے ہدایت اللہ اور عنایت۔ اس کا شوہر فرید جب اس کے بیٹے کم عمر تھے ہارٹ اٹیک سے مر گیا۔ اس نے بڑے کٹھن حالات میں دونوں بیٹوں کو پالا پوسہ تھوڑی بہت زمین تھی جو ہدایت اللہ نے جوان ہوتے ہی اپنی محنت سے آباد کر لی اور ان کے دن پھرنے لگے عنایت میٹرک کے بعد مزید تعلیم کے لئے شہر چلا گیا۔ ہدایت اللہ کی شادی پروین نامی لڑکی سے ہو چکی تھی جو گاؤں کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اس گاؤں کا سرپرست اعلیٰ چوہدری دلاور تھا۔ جو عیاش اور بے رحم شخص تھا۔ گاؤں کی جو لڑکی بھی اسے پسند آتی اس کے ایک اشارے پر اس کے کارندے اسے اٹھا کر حویلی میں پہنچا دیتے۔ چند روز بعد لڑکی واروں کے حوالے کر دی جاتی لوگ روح کو چیر پھاڑ ہو جاتے اس کے اثر و رسوخ اور طاقت کی وجہ سے کسی میں انکار یا مزاحمت کی ہمت نہ تھی اس نے گاؤں میں عجیب شرمناک قانون نافذ کر رکھا تھا۔

گاؤں والے چوہدری کے ظلم کے خلاف خاموش تھے پھر گاؤں پر قہر ٹوٹ پڑا۔ ایک دیو قامت انسان نما حیوان جس کے چار بازو تھے اور شکل بہت خوف ناک تھی اچانک ہی نمودار ہوتا۔ اور گاؤں کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے ہاتھوں مارا جاتا۔ وہاں کے بہت سے لوگ خوف کے مارے کوٹھوں کے حساب اپنی زمین دلاور خان کے ہاتھ فروخت کر کے بھاگ گئے۔

دلاور خان کے مظالم کی کتھا سنتے ہی نہ جانے کیوں فرحان کے سینے میں آتش فشاں دہک اٹھا۔ "بیٹا تم رات کی تاریکی میں گھر آئے ہو تمہیں کسی نے اس وقت یہاں آتے بھی نہیں دیکھا ہوگا میں تمہیں گھر سے نکلنے نہیں دوں گی دلاور تمہیں بھی مار ڈالے گا اس کے علاوہ اس گاؤں میں اس عفریت کی وجہ سے بھی تم ٹوٹا ہوا ہے وہ ہے تو انسانوں کی طرح پر بہت ہی جسیم اور خوف ناک ہے۔ اس کے چار ہاتھ ہیں کئی نوجوان اس کے ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے ہیں گاؤں کے لوگ کہتے ہیں وہ اچانک آتی ہے اور کسی نہ کسی انسان کو بڑی بے دردی سے مار کر غائب ہو جاتی ہے۔" عاصمہ نے خوف سے لرزتے ہوئے بتایا۔

باتیں کرتے کرتے فرحان کی نظر واہنی سمت کی دیوار پر آویزاں عنایت اور ایک دوسرا نوجوان تھا وہ دونوں عاصمہ کے دائیں اور بائیں کھڑے تھے۔ دوسرا نوجوان وہی تھا جو اسے وین کے اسٹاپ سے اس گھر کے دروازے تک لایا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر تصویر کو دیکھ رہا تھا عاصمہ نے اس کی محویت بھانپ لی۔

"تمہیں یاد ہے ہاں یہ تصویر پانچ سال پہلے تم نے اور ہدایت اللہ نے ضد کر کے میرے ساتھ بنوائی تھی یہ دیکھو ہدایت اللہ نے میرے کندھے پر بازو رکھا ہے کتنا خوبصورت لگ رہا تھا میرا بیٹا۔" وہ ہدایت اللہ کو یاد کر کے رونے لگی اور فرحان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی گویا اسے وین کے اسٹاپ سے اس گھر تک پہنچانے والی ہدایت اللہ کی روح تھی۔

"ماں جی آپ گھبرائیں نہیں اب میں آ گیا ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے عاصمہ کی گود میں سر رکھ کر کہا۔

نہیں بیٹا تم کچھ نہیں کرو گے اور نہ ہی گھر سے باہر نکلو گے چوہدری دلاور کوئی معمولی انسان نہیں اس علاقے کا بہت اثر و رسوخ والا بلکہ ایک قسم کا مالک ہے اس کے پاس غنڈوں کی فوج ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، میں ایک بیٹا کھو چکی ہوں دوسرا نہیں کھونا چاہتی میں اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر چکی ہوں ، جہاں نہ رشوت کام آتی ہے اور نہ ہی وکیلوں کی جھوٹی دلیلیں سنی جاتی ہیں۔ اللہ میرا انصاف کرے گا۔ دلاور گاؤں کے تقریباً ہر فرد کی زمین ہتھیا چکا ہے اور اب میری زمینوں کے پیچھے پڑا ہے ہم یہ سب چھوڑ کر اس گاؤں سے چلے جائیں گے مجھے زمین وجائیداد نہیں تمہاری ضرورت ہے۔" عاصمہ اس کا ماتھا چوم کر بولی۔

کچھ دیر باتوں کے بعد وہ فرحان کے منع کرنے کے باوجود اٹھی اور مکئی کی روٹی اور ساگ لے آئی دونوں نے مل کر کھانا کھایا خلوص اور پیار سے بنائے ہوئے اس کھانے میں ماں کی ممتا کی لذت تھی۔ اسے یہ کھانا دنیا کی ہر نعمت سے اچھا لگا پھر وہ باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب عاصمہ نے اسے جگایا۔

"وہ ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ "ماں میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔" اس نے ناشتہ کرنے کے بعد کہا۔

"نہیں بیٹا تم باہر نہیں جاؤ گے۔" عاصمہ نے منع کر دیا۔

"ماں جی آپ گھبرائیں مت مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے عاصمہ کو سمجھانا چاہا۔

"تو پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" وہ فرحان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔

وہ رات کے وقت گاؤں میں آیا تھا اب صبح گھر سے باہر نکلا تو اس سرسبز گاؤں کو دیکھ کر سحر زدہ گیا۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ چیڑ اور دیار کے درخت بڑا بلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ ایک پگڈنڈی پر چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ دائیں طرف ایک پیلے رنگ کی عمارت تھی۔ جس کے باہر پیر آباد گورنمنٹ ہائی اسکول درج تھا۔ وہ پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے ایک کھیت میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی چھوٹا سا سرکاری اسپتال تھا وہ اسپتال سے آگے نکل کر گاؤں کی کچی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ سامنے سے ایک جیپ آ رہی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بڑی بڑی مونچھوں والا کرخت صورت شخص بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے برابر قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک تیس چونتیس سالہ شخص موجود تھا۔ پچھلی نشست

پر ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ اس کے شانے سے جدید ساخت کی رائفل لٹک رہی تھی۔ ”یہ چوہدری وقار صاحب ہیں امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے چار سال پہلے گاؤں میں آئے ہیں۔“ عاصمہ نے بتایا۔

فرحان کی نظر جیپ پر چپی ہوئی تھی۔ جیپ ان سے کچھ فاصلے پر اس طرح رک چکی تھی کہ ان کے آگے بڑھنے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔

”حلیے سے تو تم پڑھے لکھے لگتے ہو لیکن یہ حرکت گنواروں والی ہے۔“ فرحان نے جیپ کے قریب پہنچ کر استہزائیہ انداز میں کہا۔

”رستم اسے بتاؤ کہ ہم کون ہیں؟ لگتا ہے بھائی کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے۔“ وقار غرایا۔

”پچھلی نشست پر موجود رائفل بردار جیپ سے اتر آیا۔ ”چھوٹے سرکار سے معافی مانگو ورنہ؟“ وہ فرحان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اس نے شانے سے رائفل اتارنے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ شاید اسے اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ ویسے بھی چھریرے بدن کا فرحان اس کے ڈیل ڈول اور درشت جسم کے سامنے ہاتھی کے مقابلے میں چیونٹی دکھائی دے رہا تھا۔

”ورنہ تم کیا کرلو گے؟“ فرحان نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی جو رستم کو تاؤ دلا گئی۔ اس نے لیفٹ ہینڈ کا استعمال کیا اور زوردار پنچ فرحان کے جبڑے پر رسید کیا تو فرحان نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور جوابی گھونسہ اس کے جبڑے پر رسید کر دیا، رستم کے چہرے پر تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرت کے آثار بھی تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جسے اس نے اس گاؤں کا دیہاتی سمجھ کر للکارا ہے۔ وہ عنایت نہیں اس کا ہم شکل اسٹریٹ کرائم کا بادشاہ فرحان ہے۔

ابھی وہ حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ فرحان نے اچھل کر زوردار جیپ سائیڈ کک اس کے سینے پر رسید کی۔ رستم پشت کے بل جیپ سے ٹکرا کر آگے کی طرف آیا تو فرحان نے اس کے جبڑے پر اسپین کک ماری۔ رستم کی آنکھوں کے سامنے تارے سے رقص کر گئے فرحان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر چپ فرنٹ کک ماری۔ رستم نے بلاک کرتے ہوئے زوردار گھونسہ فرحان کے جبڑے پر رسید کیا اور گھوم کر اس کے سینے پر بیک کک رسید کی۔ فرحان پیچھے کی طرف لڑھکتا گیا۔ اور رستم نے برق رفتار سے اپنے شانے سے رائفل اتار کر لاک پن ہٹائی اور ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ ”بس اب تمہاری بندر کی طرح اچھل کود ختم تم نے رستم پر ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا ایک بڑے ٹائروں والی جیپ قریب آ رکی اس میں سے دو رائفل بردار پولیس اہلکار اترے تعجب کی بات یہ تھی کہ پولیس اہلکاروں کے ساتھ مناحل اور وہ نوجوان بھی تھا جسے مناحل دوران سفر اشعر کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

اشعر اور مناحل کے ہاتھوں میں نائن ایم ایم کے پسٹل موجود تھے۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں۔؟ اپنی رائفل ایک طرف پھینک دو۔“ اشعر نے پسٹل کی نال کا رخ رستم کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ مناحل ایک لمحے کے لئے فرحان کو دیکھ کر چونکی پھر اس کے چہرے کے تاثرات نارمل ہو گئے تھے۔

چوہدری وقار بھی جیپ سے اتر چکا تھا۔ میں ایم پی اے چوہدری دلاور کا چھوٹا بھائی چوہدری وقار ہوں تمہارے یہ ساہی مجھے جانتے ہیں اور یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے تم لوگ اس میں مداخلت مت کرو۔“ وقار تند لہجے میں بولا۔

”مسٹر وقار ایم پی اے کا چھوٹا بھائی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم سرعام کسی پر رائفل تان کر قانون ہاتھ میں لو اس غیر قانونی حرکت پر تمہیں ارسٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔“ مناحل سرد لہجے میں بولی۔

”مجھے گرفتار کون کرے گا۔“ وہ ہنسا۔

”میں تمہیں گرفتار کروں گی۔“ مناحل تیزی سے بولی وہ ذرا برابر بھی وقار سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

”محکمہ پولیس کے بڑے بڑے افسران ہماری

اسماء الحسنیٰ ۔۔۔۔ کامیابی کا راستہ

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

پریشانیوں سے چھٹکارہ

ہمارا ماہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو | جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح | اولاد کا نہ ہونا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی | کاروباری بندش
جنات کا سایہ | دیگر مسائل

سید فرمان شاہ کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔
وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بڑے کام بنائے

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ جس علم سات سمندر پار چلے کالے وسفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہو گا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوں نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

سسرال میں، محبوب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ

خواہش

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہو گی انشاء اللہ

کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپ کی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آزمائیے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔

نوٹ: جو خواتین وحضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ آنکھیں ہی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان

سید فرمان شاہ 0300-6484398

حویلی میں حاضری دیتے ہیں۔اورتم ہوکون۔؟" وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

مناصل نے اپنا کارڈ اس کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ وقار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ ایک حساس ادارے کی آفیسر تھی رستم نے وقار کے اشارے پر اغل دوبارہ شانے سے لٹکالی۔"حساس ادارے کے افسران کا اس چھوٹے سے گاؤں میں کیا کام ہے۔؟" اس بار وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔

"مسٹر وقار تمہارے اس پہاڑی علاقے میں تین نوجوان سیر وتفریح کی غرض سے آئے تھے بعد میں ان میں سے دو جوانوں کی خونچکاں لاشیں ملیں۔ان کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں کسی درندے نے ہلاک کیا ہے ان کا ایک ساتھی جو بچ نکلا اس کا بیان ناقابل یقین ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کوئی انسان نما جسیم حیوان تھا قد تو نوفٹ سے اوپر اور اس کے چار بازو تھے اس سے قطع نظر تم جانتے ہو مرنے والے کون تھے ایک میرا بھائی شرجیل اور دوسرا ایک افسر کا بیٹا خالد تھا اس معاملے کی تفتیش میں پولیس ناکام رہی۔ یہ کیس ہمارے ادارے کے سپرد کردیا گیا ہے۔ میں اس معاملے کی تفتیش کے لئے اپنے ڈپارٹمنٹ کے آفیسر اشعر کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔" مناصل نے کہا۔

وقار نے فی الحال عافیت اسی میں جانی کہ رستم سمیت جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گیا۔

"فرحان تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہورہا ہے،اب تمہیں گرفتار کرنے کا ناگوار فریضہ بھی مجھے ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ تم جیل سے بھاگے ہوئے خطرناک مجرم ہو۔" مناصل سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"میڈم لگتا ہے آپ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہیں میرا نام فرحان نہیں عنایت ہے۔ یہ رہے میرے ڈاکومنٹس اگر اس سے بھی آپ کی تسلی نہ ہو تو یہ میری والدہ ہیں آپ ان سے بھی میرے بارے میں پوچھ سکتی ہیں اور گاؤں کے کسی بھی فرد سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔" فرحان نے شناختی کارڈ اور تعلیمی سرٹیفکیٹ اسے تھمادیئے۔

مناصل نے حیرت کے ساتھ شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات کا معائنہ کیا اور اسے واپس لوٹادیئے۔

"بیٹی یہ میرا بیٹا عنایت ہی ہے۔" کافی دیر سے خاموش کھڑی عاصمہ بولی۔

"حیرت ہے یقین نہیں آتا تمہاری آواز لب ولہجہ قدوقامت خیرتم کبھی قانون ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کرنا کوئی بھی مسئلہ ہو تو سرراہ لڑنے کے بجائے پولیس اسٹیشن چلے آنا۔" مناصل نے تنبیہ کی۔

"قانون ایم پی اے دلاور جیسے اثر ورسوخ کے حامل افراد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔اس وقت قانون کہاں سویا ہوا تھا جب دلاور اور اس کے کارندوں نے سرعام میرے بھائی ہدایت اللہ کو قتل کیا اور اس کی لاش کو گھوڑے سے باندھ کر گھسیٹا۔اس وقت قانون کیوں اندھا ہوگیا تھا جب سرعام پروین کو بے عزت کرنے کے بعد آدم خور کتوں کے حوالے کردیا گیا اور اس وقت قانون کیوں بہرہ ہوگیا تھا جب میری بیوہ بوڑھی ماں پولیس اسٹیشن میں قانون کے رکھوالوں کے سامنے فریاد کرتی اور اسے دھکے دے کر پولیس اسٹیشن سے نکال دیا گیا۔" فرحان سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس واقعہ کا کوئی گواہ تو ہوگا؟" مناصل نے پوچھا۔

"پورا گاؤں قتل کا چشم دید گواہ ہونے کے باوجود دلاور کے خوف سے خاموش ہے کوئی بھی گواہی دینے کو تیار نہیں۔"

"میں اس معاملے کی بھی تفتیش کروں گی تم فکرمت کرو اگر دلاور اس معاملے میں ملوث ہوا تو اسے میں اپنے ہاتھوں سے ہتھکڑی پہناؤں گی۔اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ہر پولیس والا بکاؤ نہیں ہوتا۔ چند ضمیر فروشوں کی وجہ سے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو بدنام کرنا ٹھیک نہیں۔" مناصل نے کہا اور وہ پولیس جیپ کی طرف بڑھنے لگی جبکہ فرحان حسرت بھری نگاہوں سے مناصل

کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت مناصل نے مڑکر دیکھا اور فرحان اپنی چوری پکڑے جانے پر گڑبڑا گیا جبکہ مناصل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

وہ گھر واپس لوٹ آئے۔"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ باہر مت نکلو دیکھ لیا کس کا نیچہ؟ اب نہ جانے کیا ہوگا۔" عاصمہ فکرمند تھی۔

"ماں جی جب تک آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" وہ عاصمہ سے لپٹ کر بولا اس نے عاصمہ کو حقیقی ماں کا درجہ دے دیا تھا اور عہد کرلیا تھا کہ وہ کبھی بھی اسے پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ اس کا بیٹا عنایت نہیں فرحان ہے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔جب کٹ پٹ کی آواز سن کر فرحان کی آنکھ کھلی عاصمہ بے خبر سو رہی تھی اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پٹ کھولا اگلا ہی لمحہ ناقابل یقین تھا صحن میں ایک دیوہیکل انسان برہنہ کھڑا تھا۔ اس کے چار بازو اور شکل وصورت انتہائی خوف ناک تھی قد اس جسیم انسان نما حیوان کا نوفٹ کے قریب تھا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان ہی کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔صحن کی بیرونی دیوار ٹوٹی ہوئی صاف نظر آرہی تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ بہت خوف ناک بات تھی جو نفیر ایک مضبوط دیوار توڑ سکتا تھا تو لکڑی کا معمولی دروازہ بھلا اس کے سامنے کیا چیز تھی۔ اس نے عاصمہ کو جھنجھوڑ کر جگایا۔"کیا ہوا بیٹا؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"ماں جی خطرہ ہے۔وہ خوف ناک بلا صحن کی دیوار توڑ کر گھر میں گھس آئی ہے۔" فرحان نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا اور عاصمہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کا پچھلا دروازہ کھولا اس طرف دوسرا کمرہ تھا۔

اسی وقت اس عفریت نے زور دار دھکا دیا۔ دروازہ مقفل ہونے کے سبب کھل نہ سکا تو اس نے دروازہ توڑ ڈالا تھا پھر وہ عاصمہ سمیت صحن میں پہنچا اور دروازہ کھول کر باہر بھاگنے لگا۔

رات کا پچھلا پہر تھا گاؤں میں ہر طرف سناٹے کا راج تھا وہ دونوں اس اندھیری رات میں اس حیوان نما انسان سے جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے فرحان کے لئے سب سے بڑی مشکل عاصمہ تھی وہ اس کی وجہ سے تیز نہیں دوڑ سکتا تھا جب کہ وہ انسان نما حیوان گھر سے نکل کر ان کے پیچھے چنگھاڑتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ اس کے چنگھاڑنے کی آواز ہاتھی کی چنگھاڑ سے مشابہ تھی جسامت اور وزن کے لحاظ سے اس کے بھاگنے کی رفتار قابل دید تھی، وہ لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب ہوتا جارہا تھا۔

ایک جگہ عاصمہ کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ چیختی ہوئی گر گئی۔اس کی چیخ سن کر فرحان رک گیا۔

وہ انسان نما خوف ناک حیوان، عاصمہ کے قریب پہنچ چکا تھا اس کی چنگھاڑ سن کر عاصمہ زور اور خوف کی زیادتی سے بے ہوش ہوگئی۔

عاصمہ کو موت کے منہ میں دیکھ کر فرحان انجام سے بے پرواہ اس انسان نما حیوان کی طرف بھاگا اور زوردار فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی زوردار فلائنگ کک کے باوجود وہ عفریت اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں جبکہ فرحان فلائنگ کک مارتے ہی فضا میں قلابازی کھا کر گھڑا ہوچکا تھا۔ اور اب حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے اس عفریت کو دیکھ رہا تھا جو عاصمہ کو بھول کر چنگھاڑتے ہوئے فرحان کی طرف لپکا، فرحان کا زوردار کیکو زوکی پنچ اس عفریت کے سینے پر پڑا اس پنچ سے اس عفریت کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ فرحان کا ہاتھ جھنجھنا اٹھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے گھونسہ پتھر کی چٹان پر مارا ہو۔ اس انسان نما حیوان نے فرحان کو کسی کھلونے کی طرح اٹھایا اور ایک طرف اچھال دیا پتھریلی زمین پر گرتے ہی درد اور اذیت کی ٹیسیں لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی اسے ایسا لگا جیسے اسکے بدن کی ہر ہڈی سے باہر نکل اب کمرے سے اس حیوان نما انسان کی خوف ناک چنگھاڑ سنائی دے رہی تھی شاید اس نے دوسرا دروازہ بھی توڑ ڈالا تھا پھر وہ عاصمہ سمیت صحن میں پہنچا اور دروازہ کھول کر باہر بھاگنے لگا۔

ٹوٹ چکی ہے، اس عفرت نے آگے بڑھ کر فرحان کو دوبارہ اٹھا کر سر سے بلند کیا اور ایک طرف پھینک دیا۔ فرحان کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی، بدقسمتی سے اس بار اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا اور اس کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی۔ اس نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے سوچا۔ "شاید اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔" اور پھر وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا، یہ پیر آباد کا سرکاری اسپتال تھا اس کے قریب ہی ادھیر عمر کلین شیو ڈاکٹر اور مناصل موجود تھے۔ "خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آگیا۔" مناصل نے کہا اور فرحان نے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر وہ کراہتے ہوئے بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھا اس کے پورے وجود میں اب تک درد کی شدید ترین لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور شدید قسم کا درد ہو رہا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ ریڑھ کی ہڈی سمیت تمہاری تمام ہڈیاں سلامت ہیں، صرف سر پر شدید چوٹ پہنچی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ چوٹ بھی اتنی خطرناک نہیں، تم دو تین روز میں بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔" ڈاکٹر نے کہا اور اسے پین کلر کا انجکشن لگا دیا اس دوران عاصمہ بھی آچکی تھی وہ تو فرحان سے لپٹ کر رونے لگی لیکن مناصل اور ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

فرحان کے ذہن پر غنودگی چھانے لگی تھی اور پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں شاید انجکشن میں خواب آور دوا بھی شامل تھی۔ وہ دو تین روز میں ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا تھا تیسرے روز ڈاکٹر نے اسے جانے کی اجازت دے دی وہ اسپتال سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک جیپ اس کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مناصل موجود تھی۔ "بیٹھو گاڑی میں۔" مناصل نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور وہ خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا مناصل نے گیئر لگایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"ماں جی کہاں ہیں۔؟" فرحان نے پوچھا۔

"وہ پولیس اسٹیشن کے قریب اس کوارٹر میں ہیں جہاں میری رہائش ہے، تم نے اب تک نہیں پوچھا کہ تم اسپتال کیسے پہنچے چلو میں بتا دیتی ہوں۔" اس روز اس عفریت نے جہاں تم دونوں کو گھیرا تھا اس کے قریب ہی وہ گہرے جہاں میری رہائش ہے میں ایک اور ادھیر عمر ملازمہ کے ساتھ وہاں رہتی ہوں تمہاری چیخوں اور اس بلا کی خوف ناک چنگھاڑ سن کر باہر نکلی چیخ پکار سن کر میں اور ان تمام حیوان کو دیکھ کر میں بھی ڈر گئی تھی لیکن تم دونوں کی زندگی خطرے میں تھی، میں نے اس عفریت پر فائرنگ بھی کی لیکن جسیم ہونے کے باوجود وہ پھرتی سے چھلانگیں مار کر نشیب میں غائب ہوگیا۔" مناصل نے کہا۔

"یہ تم کہاں جا رہی ہو؟ یہ راستہ تو گاؤں سے باہر جا رہا ہے۔" "فرحان بوکھلا گیا۔

"ڈرو مت میرا تمہیں اغوا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔" اس نے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی، کچھ فاصلے پر پل تھا جس کے نیچے دریا پانی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ مناصل اب اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔؟" وہ گڑبڑا گیا۔

"یہ تو قلم اور کاغذ اس پر صرف اپنا نام لکھو۔" مناصل نے اسے قلم اور کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ فرحان نے ناسمجھی کے عالم میں اس سے کاغذ قلم لیا اور اپنا نام عنایت لکھ کر کاغذ قلم اسے دے دیا، مناصل غور سے کاغذ پر لکھے نام کو دیکھنے لگی۔ "بہت خوب تمہارا کہنا ہے کہ تم فرحان نہیں عنایت ہو جب کہ مجھے پورا یقین ہے کہ تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی فرحان ہو۔" وہ سناٹے سے بولی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔؟" وہ جز بز ہوگیا۔

مناصل نے اپنے پرس میں سے گلابی رنگ کا ایک کاغذ نکالا اور اسے دکھایا۔ "اس کاغذ کو پہنچتے ہوئے اس کاغذ پر ایک غزل لکھی ہے یہ کاغذ مجھے میرے کلاس فیلو فرحان نے دیا تھا اور میں نے اسے ہُبہ کیا تھا، میں کالج میں تعلیم حاصل کرنے جاتی تھی اور اس فرحان کی باتوں کو ناپسند کرتی تھی اتفاق سے فرحان کو تمہاری ہینڈ رائٹنگ ایک جیسی ہے اور تمہارے فنگر پرنٹ چیک کرنے کے بعد سچائی خود سامنے آجائے گی کیونکہ فنگر پرنٹ جھوٹ نہیں بولتے۔" مناصل نے کہا اور فرحان سناٹے میں آگیا۔

وہ واقعی حساس ادارے کا ذہین آفیسر تھی اس نے پل بھر میں اسے بے نقاب کر دیا تھا کو یا اب وہ دوبارہ جیل کی سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے جائے گا اور DIG حمید علی کی بیٹی اسی کی طرح اصول پرست تھی۔ فرحان کو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ مناصل نے اس کا دیا ہوا کاغذ اب تک کیوں سنبھال کر رکھا تھا۔ جب فرحان نے اسے غزل لکھ کر دی تھی تو اس نے کاغذ پر لکھی غزل پڑھتے ہی اسے جھٹک دیا تھا۔

یہ ایسی تھی تھی جتنا اور سلجھاتا الجھ جاتی۔ مناصل کے ہاتھ سے اس نے قدرے ہٹ کے بعد کاغذ لیا اور اپنی لکھی ہوئی وہ غزل پڑھنے لگا۔

اے خدا۔
آج یہ فیصلہ کر دے
اسے میرا بنا مجھے اس کا کر دے
بہت دکھ سہے ہیں میں نے کوئی خوشی تو میرا مقدر کر دے
نہیں لکھا اگر نصیب میں میرے ساتھ اس کا
تو ختم کر یہ زندگی اور بخش دے
فقط فرحان تنہا۔

"مناصل میں مانتا ہوں کہ میں جیل سے بھاگا ہوا سزا یافتہ قیدی ہوں اور تم قانون ہاتھ میں لینے والے ادارے سے تعلق رکھتی ہو، میں گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں اور جرائم کی دنیا کو خیر باد کہہ چکا ہوں، میں یہاں اپنے ایک گناہ کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں۔ جسے ادا کرتے ہی میں خود قانون کے حوالے کر دوں گا لیکن میری ایک درخواست ہے، ماں جی کو نہیں بتانا کہ میں عنایت نہیں ورنہ صدمے سے ان کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ اس بے چاری کا بیٹا میری ہی وجہ سے مارا گیا ہے۔" فرحان نے کہا اور اپنی پوری روداد اسے سنا ڈالی۔

"ٹھیک ہے اس جنگ میں، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔" میں نے ہدایت اللہ کے قتل کا مقدمہ درج کرایا ہے انشاء اللہ جلد ہی اس کے قاتل انصاف کے کٹہرے میں ہوں گے۔" مناصل نے کہا۔

"نہیں چند ایہ تمہاری بھول ہے۔ تم زندہ رہو گے تو کچھ کر دو گے ناں۔" ان کی سماعت سے ایک سرد آواز ٹکرائی انہوں نے مڑ کر دیکھا جیپ کے قریب ہی دو رائفل بردار کھڑے تھے۔ جن کی رائفلوں کا رخ ان ہی کی طرف تھا۔

مناصل نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا۔

"نہیں پھولن دیوی ہوشیاری مت دکھانا ورنہ یہ ڈیڑھ انچ کی گولی تم لوگوں کی کھوپڑی میں اتار دوں گا چلو باب شرافت سے پسٹل مجھے دے دو۔" ایک رائفل بردار مناصل کی کنپٹی سے رائفل کی نال لگاتے ہوئے غرایا۔

وہ دونوں رائفل بردار خوبرو اور بڑی بڑی مونچھوں اور کرخت چہرے سے ڈاکو دکھائی دے رہے تھے مناصل نے اپنا پسٹل قریب کھڑے رائفل بردار کے حوالے کر دیا دونوں رائفل بردار جیپ کی عقبی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔ "اسے کہتے ہیں رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی، چل کٹو، گاڑی پل پر چڑھاوے، دونوں چوہدری تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" ایک رائفل بردار مناصل کی گردن پر رائفل کی نال لگاتے ہوئے بولا۔

مناصل نے سر دآہ بھرتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

"جھانسی کی رانی تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں تمہارے اس یار کو تو یہیں پل پر گولی مار کر اس دریا میں پھینک دیں گے اور تمہیں چوہدریوں کے حوالے کر دیں گے۔ اور وہاں تمہارے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو ہدایت اللہ کی بیوی کے ساتھ ہوا تھا۔" ایک رائفل بردار نے اپنے خبیثانہ خیالات کا اظہار کیا۔

"اپنی بکواس بند کرو۔" فرحان دھاڑا۔

"تم چپ رہو ورنہ پل آنے سے پہلے ہی گولی مار دوں گا۔" دوسرا رائفل بردار رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔

جیپ پل پر چڑھ چکی تھی نیچے دریا اپنی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اب عمل کا وقت آچکا تھا۔ تختہ یا تختہ، زندگی یا پھر موت، مناصل جانتی تھی مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنا بھی اس سنگین مسئلے کا حل نہیں تھا، وہ فرحان کو مار ڈالتے اور اس کی عزت خطرے میں پڑ جاتی۔

ایک شریف باحیا عورت اپنی جان تو دے دیتی ہے لیکن اپنی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ مناصل نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ گھمایا۔ جیپ پل کی ریلنگ توڑتی ہوئی دریا میں جا گری جو کچھ بھی ہوا آناً فاناً ہوا کسی کو بھی سنبھلنے کی مہلت نہیں ملی۔

جیپ پل سے گرتے ہی فرحان کا جسم جیپ سے باہر گرا اس نے خود کو دریا کی تہہ میں جاتا محسوس کیا۔ وہ جتنی تیزی سے اندر گیا اتنی ہی تیزی سے پانی نے اسے واپس سطحِ آب پر اچھالا مگر حیرت ان آنکھوں پر جو بہن کھلے مرجھا گئے وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ اس نے جان بچانے کے لئے الٹے سیدھے ہاتھ پیر چلائے مگر وہ خود کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

اس کا ذہن سخت اذیت میں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے چاروں اطراف ان دیکھی آگ جل رہی ہے۔ یہ جلن اس قدر شدید تھی کہ اس نے چیخنے کی کوشش کی مگر چیخ نہ سکا لگتا تھا کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہے۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں سوچنے لگا۔ کیا وہ مر چکا ہے اور اپنے برے اعمال کے سبب دوزخ میں پہنچ گیا ہے۔ پھر اسے اپنے قریب ایک خوف ناک آواز سنائی دی یہ آواز شیر کی دھاڑ سے مشابہ تھی وہ کوئی بھی تھا کہہ رہا تھا۔

"اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا یہ ماں باپ کا نافرمان ہے۔ اور زندگی بھر اس نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے لوگوں کا حق چھینا۔"

اسی وقت ایک دوسری مہربان اور شیریں آواز سنائی دی۔ "نہیں یہ بچے دل سے توبہ کر چکا ہے یہ میرے ساتھ جائے گا۔"

ان دونوں میں تکرار ہونے لگی وہ نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی بول سکتا تھا وہ۔ بس خاموشی سے ان کی بحث سنتا رہا۔ اتنے میں تیسری آواز سنائی دی۔ "یہ تم دونوں کے ساتھ نہیں جائے گا ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

کچھ دیر بعد اسے ایسا لگا جیسے اسے کوئی جھنجھوڑ رہا ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی دوسری چارپائی پر ایک تیس سالہ خوبصورت عورت بیٹھی تھی عورت کے قریب پانچ سالہ بچہ بھی موجود تھا جبکہ فرحان کے قریب ہی ایک ضعیف العمر شخص کھڑا تھا۔ اسے جھنجھوڑنے والا وہ ضعیف العمر شخص ہی تھا۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ خوبصورت عورت بھی چارپائی سے اتر کر کھڑی ہو گئی فرحان نے گردن گھما کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا یہ مٹی کا بنا ہوا کچا کمرہ تھا۔ جس کی دیواروں پر گارے سے لیپائی کی ہوئی تھی۔ جیسا عموماً گاؤں دیہاتوں میں اکثر مکان ہوتے ہیں کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ جن میں سے ایک پر وہ خود لیٹا ہوا تھا کمرے کے ایک کونے میں ٹین کی بڑی سی پیٹی تھی جس کے اوپر بستر اور کمبل وغیرہ موجود تھے۔ فرحان اٹھ بیٹھا تھا اٹھتے ہی اس کی نظر اپنے لباس پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔

وہ دریا میں گرا تو پینٹ اور شرٹ میں ملبوس تھا جبکہ اس وقت اس کے جسم پر شلوار قمیض موجود تھے۔ "کیسے ہو بیٹا؟ تمہیں چار گھنٹوں بعد ہوش آیا ہے۔؟" اسے مخاطب کرتے ہوئے ضعیف العمر شخص اس کے قریب بیٹھ گیا جبکہ عورت اور بچہ چارپائی کے قریب ہی خاموش کھڑے تھے۔

"میں کہاں ہوں اور مناصل کہاں ہے؟" اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

"کون مناصل؟ ہم تو دریا کے کنارے کھڑے تھے۔ تم پانی میں بہتے ہوئے دریا کے کنارے جھاڑیوں میں جا پھنسے، تمہارے جسم میں زندگی کی ہلکی سی رمق باقی تھی میں نے اپنے نحیف ہاتھوں سے تمہارے پیٹ سے پانی نکالنا چاہا لیکن ناکام ہونے پر فائدہ کی مدد لی پھر ہم باپ بیٹی بمشکل تمہیں اٹھا کر اپنے گھر لے آئے، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ہی زندگی دی۔" بوڑھے نے کہا۔

اور اسے پھر مناصل کا خیال آ گیا۔ "کیا وہ دریا میں ڈوب چکی ہے۔؟" یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اس نے دل کی گہرائیوں سے مناصل کو پکارا اس کا دل و دماغ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ "مر مناصل مر چکی ہے۔"

یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا اسے پتہ نہیں چلا کب اس کی آنکھوں کے گوشوں سے پانی بہنے لگا یہ آنسو تھے جو مناصل کی یاد میں بہہ رہے تھے۔

"بیٹا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو، تم بالکل میرے بیٹے کی طرح ہو مجھے بتاؤ تمہیں کس بات کا دکھ ہے۔؟" بوڑھے نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اس نے روتے ہوئے اپنی روداد بوڑھے کو سنا ڈالی اور بولا۔ "بابا مجھے مرجانے دیا ہوتا۔ مجھے کیوں بچایا، یہ زندگی مناصل کے بنا ادھوری ہے اگر وہ نہیں رہی تو میں بھی اپنی جان دے دوں گا۔" اس کا لہجہ ہسٹریائی ہو چکا تھا۔

بوڑھے نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرایا۔

"اسے دیکھ رہے ہو یہ فائزہ ہے بیٹی، ہو بہو یہ میرا پوتا ہے علی، یہ دنوں میری کل کائنات ہیں تمہاری طرح میرا بھی ایک جوان بیٹا علی یار خان، وہ بہت دلیر تھا اس کی ماں اس کے بچپن میں ہی مر چکی تھی۔ پھر میں نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ میں اسے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔

علی یار کا تعلق فوج سے تھا وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ وطن پر شہید ہو گیا میں نے اس کی یاد میں اس وقت سے لے کر اب تک ایک بھی آنسو نہیں بہایا لوگ کہتے تھے فیاض کا دل پتھر کا ہے بیٹے کی موت پر بھی نہیں رویا۔ لیکن میں صبر کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بیٹا یہ زندگی اللہ کی امانت ہے جسے وہ جب چاہے لے لے۔ ہمیں اس کی رضا میں خوش رہنا چاہئے۔ ابھی جو تم نے جان دینے کی بات کی ہے، دوبارہ ایسا سوچنا بھی مت۔ اللہ نے ہمیں ایک مقصد کے تحت اس دنیا میں بھیجا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ ہم اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ اس کی مخلوق کے بھی کام آئیں کسی کا دل نہ دکھائیں کسی کی حق تلفی نہ کریں یہ زندگی چند روز کی ہے اور زندگی تو سب کی گزر ہی جاتی ہے لیکن زندگی زندگی میں بڑا فرق ہے وہ زندگی جس میں پروردگار کی بندگی شامل نہ ہو، وہ شرمندگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جو زندگی اللہ کی عبادت اور اطاعت سے بھری ہو، دین و دنیا دونوں میں ایسی زندگی گزارنے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے خوشخبریاں اور انعامات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، اس ایمان والی زندگی عطا فرمانے کے لئے ہم اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے۔

ہم تو ذرا سی تکلیف پر رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے تم خودکشی کی باتیں کر رہے تھے بیٹا خودکشی حرام فعل ہے، یہ زندگی اللہ کی امانت ہے اسے اس کی اطاعت میں گزارو، اللہ تمہیں اس کا اجر دنیا اور آخرت دونوں میں دے گا۔ نماز کا وقت ہو چکا ہے آؤ میرے ساتھ نماز پڑھ کر صدق دل سے دعا مانگو اس سے پہلے بھی اللہ نے تمہیں بڑی مصیبت سے نکالا ہے۔"

بابا فیاض کا دھیما لہجہ اس پر اثر انداز ہونے لگا، انہوں نے ظہر کی نماز ادا کی۔

"بابا میں وہاں جانا چاہتا ہوں جس جگہ پل سے ہماری جیپ گری تھی۔" فرحان نے کہا بابا فیاض کچھ لمحے سوچتے رہے۔

پھر بولے۔ ”تم فائزہ کو بھی ساتھ لے جاؤ یہ اس علاقے سے واقف ہے۔“

وہ فائزہ کے ساتھ گھر سے باہر نکلا۔ ”تم وہاں جا کر کیا کرنا چاہتے ہو؟“ چلتے چلتے فائزہ نے پوچھا۔

”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان غنڈوں کا کیا حال ہوا جنہوں نے گن پوائنٹ پر ہمیں اغوا کیا تھا اور ہو سکتا ہے میری طرح مناصل بھی بچ گئی ہو۔“ وہ پرخیال لہجے میں بولا۔

”تمہیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تم کوئی ماہر تیراک نہیں ہو جو دریا کی تہہ میں جا کر دیکھو گے۔“ فائزہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ فرحان نے کہا اور پھر بولا۔

”وہاں چلتے ہیں شاید اللہ کوئی راستہ نکالے۔“

کچھ دیر بعد وہ پل کے نیچے دریا کے کنارے کھڑے تھے فرحان بے بسی سے اس بپھرے ہوئے دریا کو دیکھ رہا تھا یہی دریا اس کی مناصل کو نگل چکا تھا وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر واپسی کے لئے مڑا، اسی وقت سامنے سے دو افراد آتے دکھائی دیئے وہ دونوں ادھیڑ عمر اور اچھی صحت کے مالک تھے، انہوں نے بھی فائزہ اور فرحان کو دیکھ لیا تھا اور اب ان ہی کی طرف آ رہے تھے۔

”السلام علیکم و یونچا چارزمان چاچا۔“ فائزہ نے قریب پہنچتے ہی ادب سے سلام کیا۔

”کیسی ہو بیٹا؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور یہ کون ہے۔؟“ ان میں سے ایک شخص بولا۔

”دینو چاچا یہ فرحان ہیں ایک حادثے میں یہ جیپ سمیت دریا میں جا گرے تھے۔ ان کی بیوی کا کوئی پتہ نہیں چلا البتہ یہ بچ گئے۔“ فائزہ نے جواب دیا۔

”اللہ خیر کرے اب سے دو گھنٹے پہلے یہاں پولیس کی دو جیپیں آئی تھیں وہ بہت لوگ تھے ان کے ساتھ دو ماہر تیراک بھی تھے جو دریا کے کنارے درخت سے رسی باندھ کر دریا میں کود گئے، کافی محنت سے انہوں نے دریا سے دو مرد اور ایک عورت کی لاش نکالی تھی وہ لاشیں پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔“ دینو چاچا نے جواب دیا اور فرمان کو ایسا لگا جیسے آسمان اس کے سر پر ٹوٹ کر گر گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دینو چاچا اور اس کے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ ”پتر حوصلہ کرو اور تھانے جا کر پتہ کرے۔“ دینو چاچا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔

”فائزہ میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”پہلے بابا کے پاس چلو وہ تمہیں بہتر مشورہ دیں گے۔“ فائزہ بولی اور فرحان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی اپنے محسن سے ملے بغیر جانا نامناسب سمجھ رہا تھا اس نے فرحان کی جان بچائی تھی۔ وہ دونوں افسردہ سے بابا فیاض کے گھر چل دیئے تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ گھر پر بابا فیاض کے سامنے موجود تھے۔

”بابا میں پیر آباد پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ چاچا دینو نے بتایا ہے کہ دریا سے دو مرد اور ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

بیٹا دلاور خان اور اس کے کارندے تمہارے خون کے پیاسے ہیں، تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ مغرب کے بعد چھپ کر وہاں جاؤ اور اشعر نامی اس نوجوان سے ملو جس کا ذکر تم نے اپنی داستان میں کیا ہے۔ کہ وہ مناصل کے ادارے سے تعلق رکھتا ہے۔“ بابا نے مشورہ دیا اور وہ خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا ورنہ اس کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اڑ کر پولیس اسٹیشن جا پہنچے۔

شام سات بجے کے قریب اس نے بابا فیاض سے جانے کی اجازت طلب کی۔ ”ایک منٹ رکو۔“ وہ ایک طرف رکھے صندوق کی طرف گئے واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا۔ ”بیٹا اسے اپنی حفاظت کی غرض سے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ خنجر میرے بیٹے علی یار کو بہت پسند تھا۔“ انہوں نے خنجر فرحان کو دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا بابا خدا حافظ میرے لئے دعا ضرور کریں۔“ فرحان نے کہا اور خنجر پنڈلی سے باندھ کر رخصت ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اشعر شخت پریشان تھا اور ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ اس کی ساتھی ٹیمر مناصل صبح سے غائب تھی ہنوز اس کا کوئی اتا پتا نہیں چلا تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق وہ آخری بار عاصمہ کے بیٹے عنایت (فرحان) کے ساتھ گاؤں کے سرکاری اسپتال میں دیکھی گئی تھی وہ جس مشن پر اس گاؤں میں آئے تھے ابھی تک اس کا کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تھا۔ ہاں البتہ اس روز مناصل نے بذات خود اس انسان نما حیوان کو دیکھا تھا اگر کوئی دوسرا اس قسم کی بات کرتا تو اسے یقین نہیں آنا لیکن مناصل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی اس کی بات کو جھٹلانا اس کے بس سے باہر تھا۔ جب سے وہ اس کے ڈپارٹمنٹ میں آئی تھی اشعر اس کی صلاحیتوں کا معترف ہو چکا تھا وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے بھی لگا تھا۔ لیکن اب تک اظہار محبت کی نوبت نہیں آئی تھی اس کی وجہ مناصل کا سنجیدہ رویہ تھا وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ بلاضرورت کسی سے بات چیت اس کی سرشت میں شامل نہ تھی۔

اشعر نے پیر آباد آتے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ وہاں سے جاتے ہی اپنے والدین کو مناصل کے گھر رشتہ کے لئے بھیجے گا۔

دوپہر کے قریب ایک دیہاتی نے اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ دریا کے پل کے قریب مناصل اور عنایت کو چوہدری دلاور کے دو مسلح کارندوں نے اغوا کر لیا تھا۔ اور اس کی نظروں کے سامنے جیپ پل کی ریلنگ کو توڑتی ہوئی دریا میں جا گری تھی۔

اشعر یہ خبر سنتے ہی پولیس پارٹی اور ماہر تیراکوں کے ساتھ دریا کے اس مقام پر جا پہنچا جہاں جیپ گری تھی ماہر تیراکوں نے بڑی جدوجہد سے دو مردوں اور ایک عورت کی لاش دریا سے نکالی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لاش کا چہرہ ناقابل شناخت ہو چکا تھا یہ دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا کہ متوفیہ نے ویسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے جیسے صبح مناصل نے پہنے ہوئے تھے اس عورت کا قد و قامت بھی مناصل کی طرح تھا اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اشعر کو جب یہ معلوم ہوا تھا کہ اس حادثے میں چوہدری دلاور کا ہاتھ ہے تب سے اس کے سینے میں آتش انتقام بھڑک رہی تھی لیکن بغیر ٹھوس ثبوت کے اس خلاف کسی بھی قسم کی قانونی کارروائی ناممکن تھی اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا اس نے فون پر اپنے محکمے کے افسر اعلیٰ کو اس پیشرفت سے آگاہ کیا جس نے بڑی مشکل سے چوہدری دلاور کی حویلی کی تلاشی کے لئے وارنٹ جاری کروانے کی حامی بھری۔ اشعر نے تھانے کے عملے کو تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسے خود تلاشی کے وارنٹ کا انتظار تھا۔

تھانے میں اس وقت پانچ سپاہی موجود تھے تھانہ انچارج شمس الزمان ابھی کچھ دیر پہلے اس سے معذرت کر کے گھر جا چکا تھا اس کا کہنا تھا کہ اس کے بچے کی طبیعت خراب ہے مغرب سے ذرا پہلے وارالحکومت سے بھیجا گیا تلاشی کا وارنٹ بھی پہنچ گیا۔

اشعر دراصل حویلی کی تلاشی اس لئے لینا چاہتا تھا کہ اسے گاؤں کے کچھ لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ حویلی کے تہہ خانے میں نجی جیل موجود ہے۔ اس کے علاوہ حویلی میں غیر قانونی اسلحہ بھی تھا۔ اشعر نے وارنٹ پاکٹ میں ڈالا اور کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ ایک زوردار چنگھاڑ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی کی دلدوز چیخ بھی سنائی دی۔ وہ دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکلا راہداری میں ایک سپاہی کی لاش پڑی تھی، سپاہی کی گردن عجیب انداز سے مڑی ہوئی تھی اور سر سے خون بہہ رہا تھا وہ سمجھ گیا کہ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔

اسی وقت وہ چنگھاڑ ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ بھیانک آواز قریبی کمرے سے آ رہی تھی اس نے اپنے ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور بلا جھجک کمرے میں داخل ہو گیا اندر کا منظر دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ انسان نما حیوان نوفٹ کے قریب دیوہیکل عفریت تھا۔ جس کے چار بازو اور چہرہ انتہائی خوف ناک تھا اس نے

ایک سپاہی کو ایک ہاتھ سے گردن پکڑ کر فضا میں بلند کر رکھا تھا، وہ سپاہی خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

اشعر ششدر کھڑا اس خوف ناک بلا کو دیکھ رہا تھا اس بلا نے اپنے دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند کی اور کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ مارا پھر اس نے دیکھا سپاہی کی کھوپڑی تربوز کی طرح پھٹ گئی اشعر جیسے نیند سے جاگا اس نے اس عفریت کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی عفریت کے بائیں پہلو میں لگی۔

اشعر کا حیرت اور خوف سے برا حال تھا گولی لگنے کے باوجود وہ عفریت اپنے قدموں پر کھڑا تھا اس نے سپاہی کی لاش ایک طرف پھینکی غضب ناک نگاہوں سے اشعر کو دیکھا اور چنگھاڑتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی اشعر نے گولی چلائی مگر گھبراہٹ میں اس کا نشانہ خطا ہو گیا وہ انسان نما حیوان اشعر پر جا گرا تھا اشعر کو ایسا لگا جیسے وہ کسی بھاری چٹان تلے دب چکا ہو۔ مسلسل بھی اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس عفریت نے اپنے چاروں بازو کمر کے گرد حمائل کئے اور زور لگانا شروع کیا۔ اشعر کا سانس رکنے لگا بلا شبہ اس عفریت میں حیوانی طاقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں اشعر نے آخری کوشش کے طور پر اپنی انگلیوں کو وی (V) کی شکل دی اور اس عفریت کی آنکھوں پر پوری طاقت سے گھسیڑ دیں۔

اس بلا کی چیخ بہت خوف ناک تھی اور اس کی زخمی آنکھوں سے خون بہنے لگا تھا۔ عفریت کی دونوں آنکھیں پھوٹ چکی تھی اور ریتی مادہ اشعر کی انگلیوں سے چپک چکا تھا۔ زخمی ہوتے ہی عفریت کی گرفت اشعر پر سے کمزور ہوگئی وہ چنگھاڑتے ہوئے اشعر سے الگ ہوا اور اندھا دھند ہاتھ چلانے لگا کہ بدقسمتی سے اس کی زد میں اشعر آ گیا اس کے سر کا پچھلا حصہ فرش سے ٹکرایا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

عفریت تکلیف کی شدت سے چنگھاڑتا ہوا تھانے سے باہر نکلا۔ راستے میں آنے والا جو شخص بھی اس حیوان نما انسان کو دیکھتا خوف سے چیختا ہوا دوسری طرف بھاگ جاتا۔ ادھر فرحان چہرے پر مظر لپیٹے تھانے میں داخل ہوا تو یہاں کا حال دیکھ کر پریشان ہو گیا گیٹ کے قریب دو سپاہیوں کی خونچکاں لاشیں پڑی تھیں یہی صورتحال راہداری میں بھی تھی۔ یہاں بھی ایک سپاہی مردہ حالت میں موجود تھا اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ مختلف کمروں میں جھانکنے سے اسے ایک کمرے میں ایک سپاہی کی خونچکاں لاش اور بے ہوش اشعر نظر آ گیا اس کے سر پر بڑا سا گومڑ بنا ہوا تھا اس نے جھنجھوڑ کر اشعر کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جو کچھ ہی دیر میں بارآور ہوگئی اشعر ہوش میں آ کر اسے کچھ دیر تک خالی الذہنی سے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو۔

"مناحل کو کیا ہوا تھا اس کی جیب دریا میں کیسے گری۔؟" فرحان کو سامنے دیکھ کر وہ سب کچھ بھول کر مناحل کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"دلاور کے کارندے ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے کہ مناحل نے جیب دریا میں گرا دی مجھے گاؤں کے ایک شخص فیاض نے بچایا۔ میں ہوش میں آنے کے بعد مناحل کی تلاش میں دریا پر پہنچا تو پتہ چلا پولیس نے دو مردوں اور ایک لڑکی کی لاش دریا سے نکالی ہے یہ سنتے ہی میں یہاں چلا آیا لیکن یہ سب کیا ہے؟ پولیس اہلکاروں کو اتنی بے دردی سے کس نے قتل کیا؟" فرحان نے پوچھا۔

"دریا سے ملنے والی دونوں لاشوں سے تو یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ وہ چوہدری دلاور کے کارندے ہیں جبکہ لڑکی کی لاش ناقابل شناخت ہے البتہ اس نے ویسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے جیسے حادثے سے پہلے مناحل نے پہن رکھے تھے اب ڈی این اے (DNA) ٹیسٹ کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ وہ لاش کہیں؟" اشعر کہتے کہتے رک گیا۔

"یہاں کیا ہوا تھا۔؟" فرحان نے اپنا سوال

دوبارہ دہرایا۔

"وہ انسان نما حیوان یہاں پہنچ گیا تھا۔ جس نے تمہیں زخمی کیا تھا میں بڑی مشکل سے مرنے سے بچا ہوں۔ مگر اب ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے ہمارے ہاتھوں زخمی ہو چکا ہے ہم بلا کے خون کے نشانات پر چلتے ہوئے اس تک پہنچ جائیں گے۔" اشعر نے کہا اور ایک طرف پڑا رائفل اٹھا لی۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی ایک رائفل اٹھا لوں۔" فرحان بولا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد اشعر نے اسے اجازت دے دی۔

فرحان نے ایک طرف پڑی ایک دوسری رائفل اٹھا لی تھی۔ "تم یہیں رکو میں آتا ہوں۔" اشعر بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی موجود تھا۔ اشعر نے روانہ ہونے سے پہلے اپنے افسر اعلیٰ کو فون کیا اور اس سانحے کی تفصیلی رپورٹ دی مدد کے لئے نفری طلب کی وہ جانتا تھا مزید نفری آنے میں خاصی دیر لگے گی۔ اس لئے وہ انتظار کئے بغیر تھانے سے باہر نکلے اور اس بلا کے خون کے نشان پر آگے بڑھنے لگے۔ ٹارچ کی روشنی ان کی معاون تھی۔

رات کے اس پہر ویسے بھی گاؤں کی گلیاں کوچے ویران ہو جاتے ہیں دن کا تو پتا اور گرد سے آوارہ کتوں کے بھونکنے اور کبھی کبھار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اشعر کسی ماہر کھوجی کی طرح اس عفریت کے خون کے نشانات دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہیں کہیں یہ نشانات معدوم ہو جاتے وہاں وہ اندازے سے آگے بڑھتے تھے اب وہ گاؤں کی نا ہموار کچی سڑک پر پہنچ چکے تھے سڑک پر جگہ جگہ گڑھے اور اطراف میں بے ڈھنگ تھے دو فرلانگ چلنے کے بعد ان کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان آ گیا یہاں بھی خون کے نشان موجود تھے وہ خون کے نشانات دیکھتے ہوئے مزید آگے بڑھے چند گز کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض حویلی موجود تھی اس بلا کے خون کے نشانات حویلی کے مین گیٹ تک جا رہے تھے۔ "یہ تو چوہدری دلاور

صنف نازک کی حقیقت

دنیا کو تعلیم دینے والا مرد، لیکن مرد کو تعلیم دینے والی عورت ہے۔ عورت اس لئے پیدا کی گئی کہ مرد کو مانوس کرے۔ عورت کے محبت بھرے دل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔

جس طرح کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو پھول خوبصورت بنا دیتا ہے، اسی طرح غریب سے غریب گھر کو نیک سیرت اور وفا شعار عورت۔

زیادہ تر آدمی عورت میں وہ تلاش کرتا ہے، جس کی اس کے کردار میں کمی ہوتی ہے۔ دنیا میں اک عورت کو جو کچھ کرنا ہے وہ بیٹی، بہن بیوی اور ماں اور صدر کے لئے نفری طلب کی وہ جانتا تھا مزید نفری آنے میں خاصی دیر لگے گی۔ اس لئے وہ انتظار کئے بغیر تھانے سے باہر نکلے اور اس بلا کے خون کے نشان پر آگے بڑھنے لگے۔ ٹارچ کی روشنی ان کی معاون تھی۔

رات کے اس پہر ویسے بھی گاؤں کی گلیاں کوچے ویران ہو جاتے ہیں دن کا تو پتا اور گرد سے آوارہ کتوں کے بھونکنے اور کبھی کبھار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اشعر کسی ماہر کھوجی کی طرح اس عفریت کے خون کے نشانات دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہیں کہیں یہ نشانات معدوم ہو جاتے وہاں وہ اندازے سے آگے بڑھتے تھے اب وہ گاؤں کی نا ہموار کچی سڑک پر پہنچ چکے تھے سڑک پر جگہ جگہ گڑھے اور اطراف میں بے ڈھنگ تھے دو فرلانگ چلنے کے بعد ان کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان آ گیا یہاں بھی خون کے نشان موجود تھے وہ خون کے نشانات دیکھتے ہوئے مزید آگے بڑھے چند گز کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض حویلی موجود تھی اس بلا کے خون کے نشانات حویلی کے مین گیٹ تک جا رہے تھے۔ "یہ تو چوہدری دلاور

کی حویلی ہے وہ انسان نما حیوان زخمی ہونے کے بعد اس حویلی تک کیوں آیا اور سب سے حیرت کی بات یہ ہے کہ شدید زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دونوں آنکھیں بھی ضائع ہو چکی تھیں اس کے باوجود اتنا طویل فاصلہ طے کرنا حیرت انگیز ہے۔'' اشعر نے حیرت سے کہا۔

''شاید اس حیوان نما انسان نے حویلی کے مکینوں پر حملہ کرنا تھا لیکن آنکھوں سے محروم وہ بلا حویلی کے مکینوں کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔'' فرحان بولا۔

اشعر خاموش رہا اور اپنی پیش قدمی جاری رکھی اب وہ حویلی کی عقبی سمت جا پہنچے تھے یہاں درختوں کا جھنڈ تھا دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور احاطے کی دیوار پر چڑھ گئے احاطے میں کوئی ذی نفس موجود نہ تھا وہ چند لمحے احاطے کا جائزہ لینے کے بعد پنجوں کے بل نیچے کود گئے عین اسی وقت انہیں غراہٹ سنائی دی وہ دونوں ہی اس غراہٹ سے بخوبی واقف تھے یہ کتوں کی غراہٹ تھی جوان سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں موجود تھے یہ کتے تعداد میں چار تھے ایک نظر دیکھتے ہی انہیں علم ہو گیا یہ بل ٹیرز کتے تھے ڈیوبیکل اور خونخوار مدمقابل کو لمحوں میں چیر پھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتے تھے، اسی وقت وہ کتے اٹھ کھڑے ہوئے اور غراتے ہوئے ان کی طرف لپکے فرحان نے اپنی رائفل سیدھی کی بلٹ کو کھینچا اور رائفل کو برسٹ موڈ پر کر کے اپنی طرف لپکنے والے کتوں پر فائر کھول دیا۔ ٹڑ ٹڑاہٹ کی گونج دار آواز کے ساتھ برسٹ کی صورت میں گولیاں نکلیں اور کتے خرخراہٹ کی آواز نکالتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

گولیوں کی آواز اور کتوں کی خرخراہٹ نے حویلی کے مکینوں کو ہوشیار کر دیا تھا لائٹس آن کر دی گئی تھیں اور چاروں طرف روشنی پھیل گئی تھی۔

''احمق انسان یہ تم نے کیا ہم دلاور خان سے الجھنے نہیں آئے تھے بلکہ اس عفریت کے پیچھے آئے تھے۔'' اسے گولیاں چلانے سے اشعر غصے میں آ گیا وہ جانتا تھا کہ چوہدری دلاور لامحدود اختیارات کا مالک ہے۔

اسے بڑی مشکل سے حویلی کی تلاشی کا وارنٹ ملا تھا۔ حویلی پر حملہ کرنے کے جرم میں نہ صرف اس کی نوکری جا سکتی تھی بلکہ اسے جیل بھی ہو سکتی تھی۔

اشعر اب تک غصے میں تھا فرحان نے درخت کی آڑ سے جھانک کر آمدہ بدستور خالی تھا حویلی کی چھت پر بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا تو پھر ان پر فائرنگ کہاں سے کی گئی تھی فرحان سوچ میں پڑ گیا۔ حویلی کے اندر بھی لائٹ آن کر دی گئیں تھیں اسی وقت ایک بار پھر ٹڑ ٹڑاہٹ کے ساتھ درجنوں گولیاں ان درختوں کے تنوں میں پیوست ہو گئیں۔ جن کی آڑ میں وہ دونوں مور چہ زن تھے۔

اشعر کا اندازہ درست نکلا تھا وہ فرحان کی غلطی کی وجہ سے بری طرح گھر چکے تھے دشمن یقیناً محفوظ مقام پر روپوش تھا۔

اچانک ایک کمرے کے دروازے سے ایک رائفل بردار نکلا اور برق سرعت سے برآمدے کے ستون کے پیچھے روپوش ہو گیا ستون کی آڑ میں کھڑے شخص نے رائفل کی نال باہر نکالی اسی وقت فرحان اچھلا اور پوزیشن تبدیل کرنے کے لئے قریبی درخت کی طرف دوڑ لگا دی اس شخص نے جبلت میں فائر کیا گولی فرحان کا شانہ چھوتی ہوئی گزری اسے شدید قسم کی جلن کا احساس ہوا لیکن وہ درخت کی آڑ میں پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ یہاں سے رائفل بردار کے جسم کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔

فرحان نے رائفل کو سنگل شاٹ موڈ پر کیا اور اس کا شانہ لے کر فائر کر دیا گولی رائفل بردار کی گردن میں لگی اور حویلی اس کی چیخ سے گونج اٹھی۔ اشعر اس صورتحال سے سخت پریشان تھا نہ ہی وہ پیچھے ہٹ سکتا تھا اور نہ ہی فرحان کو روک سکتا تھا فرحان مزید آگے بڑھ کر ایک دوسرے درخت کے پیچھے مور چہ زن ہو چکا تھا۔ اب دوبارہ خاموشی چھا چکی تھی۔

اشعر سوچ رہا تھا یہ خاموشی کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ فرحان ایک بار پھر اپنی جگہ سے باہر نکلا اور دلاور کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک

دوسرے درخت کی آڑ میں پوزیشن سنبھال لی ایسے ہی وقت فضا مختلف رائفلوں کی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی ان پر یہ فائرنگ چھت پر سے کی جا رہی تھی۔

ادھر اشعر اس بات پر حیران تھا کہ وہ انسان نما حیوان حویلی میں داخل ہونے کے بعد کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس بار فرحان نے جوابی فائرنگ کی حماقت نہیں کی اس طرح ان کے حریف ان کی پوزیشن سے آگاہ ہو سکتے تھے وہ کراس کرتا ہوا درخت کی آڑ سے نکلا اور دیوار کے قریب جا پہنچا اور چند لمحے وہیں دبکا رہا اور پھر اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا دیوار سے چھت زیادہ اونچی نہیں تھی وہ بآسانی دیوار پر کھڑا ہو گیا چھت پر جا پہنچا اس نے چھت پر کھڑا ہونے یا بیٹھنے کی بے وقوفی نہیں کی بلکہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ چھت پر دو رائفل بردار ریت کی بوریوں کے پیچھے مورچہ زن تھے ان کی توجہ حویلی کے سامنے والی جانب برآمدے پر تھی وہ وقفے وقفے سے اشعر پر فائرنگ کر رہے تھے اب وہ بھی ان کی فائرنگ کا بھرپور جواب دے رہا تھا۔

فرحان کو ایک رائفل بردار کا سر دکھائی دیا تو اس نے بلا جھجک فائر کر دیا گولی رائفل بردار کے سر میں پیوست ہو گئی وہ بنا کوئی آواز نکالے جہنم رسید ہو گیا دوسرا رائفل بردار اپنے ساتھی کو مرتا دیکھ کر اور اپنے ایک دشمن کی چھت پر موجودگی کا علم ہوتے ہی اضطراری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اشعر کی چلائی ہوئی گولی کا شکار ہو گیا گولی اس کے سینے میں لگی تھی وہ دلدوز انداز میں چیختا ہوا ریت کی بوری کے پیچھے ڈھیر ہو گیا۔

فرحان سمجھ گیا میدان صاف ہو چکا ہے اب وہ بلا خوف وخطر کھڑا ہو کر ریت کی بوریوں سے بنے مورچے کی طرف بڑھا۔ چھت پر دونوں رائفل بردار مردہ کتوں کی طرح پڑے تھے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ چھت کی سیڑھیاں اتر کر ہال میں جا پہنچا یہاں آمنے سامنے قطار میں کمرے بنے ہوئے تھے وہ بلی کی سی چال چلتا ہوا آگے بڑھا اور آہٹ کی سے ایک کمرے کا دروازے کھولا یہ کمرہ خالی تھا۔ وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ دو رائفل بردار باہر نکلے فرحان نے اضطراری طور پر ٹریگر دبا دیا۔ برسٹ کی صورت میں نکلنے والی گولیاں ان دونوں رائفل برداروں کو چھلنی کر گئیں۔ آخر میں اس کی رائفل سے ٹھک کی آواز ابھری اس کے پاس فاضل ایمونیشن نہیں تھا اس نے خالی رائفل ایک طرف پھینکی اور لاشوں کے قریب جا پہنچا اسی وقت ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ یہ دلاور کا دست راست رستم تھا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل موجود تھا فرحان اسے دیکھ چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ رستم گولی چلاتا فرحان چشم زدن میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہوتے ہوئے گرے، فرحان نے اس کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اب ان میں پسٹل کے حصول کے لئے کشمکش جاری تھی۔ کبھی فرحان نیچے ہوتا اور کبھی رستم ایک موقع پر نیچے، کہ رستم نے دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر گھونسے مارا۔ فرحان نے اس کی کلائی تھام کر اس کی ناک پر زوردار ٹکر رسید کی تو رستم کی ناک خون آلود ہو گئی اور پسٹل پر اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور ہو گئی فرحان نے پسٹل ہاتھ میں آتے ہی اس کی نال کا رخ رستم کی طرف کر دیا۔

رستم چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر کسی وحشی سانڈ کی طرح اس کی طرف دوڑا اور اس کے سینے پر پنگر مار دی فرحان نے ایک طرف ہٹ کر خود کو بچایا اور ایک بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے لاک لگایا اور دوسرا ہاتھ اس کی جانگھ میں ڈال کر اسے سر سے بلند کر کے پختہ فرش پر دے مارا، رستم کے حلق سے کربناک چیخ نکلی۔

''بس اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے اب اسے میرے حوالے کر دو۔'' اشعر بولا تو فرحان دانتوں سے اپنا ہونٹ کچلتا ہوا ایک طرف کھڑا ہو گیا جبکہ اشعر نے اپنی رائفل کی نال رستم کی پیشانی پر رکھ دی۔

''رستم میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو میرے چند سوالات کے صاف

صاف جواب دے کر اپنی جان بچالو۔ ورنہ میں تمہیں وقت ضائع کئے بغیر گولی مار کر خاموشی سے نکل جاؤں گا۔ ہر غالم اندر سے کمزور ہوتا ہے وہ صرف کمزوروں پر ہاتھ اٹھانا جانتا ہے۔"

رستم بھی اپنے سامنے موت کو دیکھ کر ساری اکڑفوں بھول گیا تھا۔

"مم ..... مجھے مت مارو مم..... میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں گا۔"

"چوہدری دلاور اور اس کا بھائی وقار کہاں ہیں؟" اشعر نے پوچھا۔

"ٹائیگر بری طرح زخمی تھا اس کے دائیں پہلو میں گولی لگی تھی اور دونوں آنکھیں بھی ضائع ہو چکی تھیں وہ اسے تجربہ گاہ میں لے گئے ہیں۔" رستم نے جواب دیا۔

"کون ٹائیگر؟ اور یہ تجربہ گاہ کس چیز کی ہے اور کہاں قائم ہے۔؟" اشعر نے حیرت سے پوچھا۔ اشعر کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا جدید ریکارڈ بھی موجود تھا۔

"وہ نوٹ کے قریب انسان نما حیوان ہے جو انتہائی خطرناک اور خوف ناک شکل کا ہے اس کے چار ہاتھ ہیں اس کا نام وقار صاحب نے ٹائیگر رکھا ہے۔" رستم نے جواب دیا پھر اس نے اشعر کے پوچھنے پر تفصیل سے اس حیوان نما انسان کے بارے میں بتایا جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

چوہدری دلاور کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق نہیں تھا باپ کے مرنے کے بعد جائیداد اسی نے سنبھالی ایم پی اے کی یہ سیٹ ان کی خاندانی سیٹ تھی۔ دلاور اس سیٹ پر باآسانی جیت گیا وہ انتہائی بے رحم، سنگدل اور عیاش انسان تھا گاؤں کے غریب لوگوں پر ظلم ڈھانا اور ان کی بہن بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنا اس کی فطرت تھی۔ شادی اس نے کی ہی نہیں۔ ان ہی دنوں گاؤں کے ایک غریب جولاہے کے گھر جڑواں بچوں نے جنم لیا یہ عجیب الخلقت بچے تھے جن کے چار ہاتھ اور شکل وصورت انتہائی خوف ناک تھی سب سے حیرت انگیز بات ان بچوں کے رونے کی آواز بھی خوف ناک اور ہاتھی کی چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ ان کے والدین اس صورتحال سے سخت پریشان تھے۔

چوہدری دلاور کو ان بچوں کی پیدائش کی خبر ہوئی تو نہ جانے اس کے شیطانی دماغ میں کیا سمایا کہ وہ رستم کے ساتھ اسی رات ان کے گھر جا پہنچا ہزاروں روپے دے کر ان کا منہ بند کرنے کے لئے انہیں دیئے اور دونوں بچے ان سے لے لئے اور تاکید کی کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ انہوں نے یہ بچے دلاور کے حوالے کئے ہیں بلکہ یہ کہیں کہ ان بچوں کا انتقال ہو چکا تھا اور انہوں نے ان کو خاموشی سے دفنا دیا۔

وقار اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا ایک حادثے میں ان عجیب الخلقت بچوں کے والدین بھی مارے گئے یعنی انہیں دلاور نے ہی چالاکی سے مروایا تھا۔ تاکہ کبھی وہ راز نہ کھلے بعد میں پتہ چلا کہ ان بچوں کو حویلی تک لانے کی ضد وقار نے ہی کی تھی وقار بھی اپنے بھائی ہی کی طرح ظالم اور بے رحم انسان تھا۔ لیکن تھا وہ ذہین اپنی ذہانت کے سبب وہ آگے بڑھتا چلا گیا برسوں بعد وہ سائنس کی تعلیم حاصل کر کے گاؤں واپس لوٹا۔ تو ذہین سائنسدان تھا اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں غیر معمولی مہارت حاصل کر لی تھی۔ پیرآباد کے جنگل میں وقار نے زیرزمین تجربہ گاہ بنائی جدید ترین مشینری لائی گئی۔

عجیب الخلقت بچے جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے اس نے ان پر تجربات کئے، انجکشنوں اور دوائیوں کے سبب وہ دیوہیکل اور جسیم ہوتے چلے گئے اس نے نہ جانے ان کے جسم میں کیسے کیسے مشینی آلات نصب کئے وہ دونوں روبوٹس کی طرح وقار کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ وہ انسان نما حیوان کتوں کی طرح سونگھنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ وقار کی ہر بات سننے سمجھنے اور اس پر عمل کرتے۔ وہ بول نہیں سکتے تھے ان کی آواز ہاتھی کی چنگھاڑ سے مشابہ تھی۔ جب وہ غصے میں آتے ہیں تو ان کی چنگھاڑ بہت خوف ناک ہوتی ہے وہ بے پناہ حیوانی طاقت کے مالک ہیں۔

وقار اور دلاور نے ان عفریتوں کو گاؤں والوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کیا بہت سے لوگ ان کے ڈر سے گاؤں چھوڑ کر جانے لگے چوہدری دلاور ان کی زمینوں پر قابض ہو گیا وہ ڈرا دھمکا کر ان سے زمین ہتھیا لیتا تھا۔ جو نہیں مانتا تھا ان عفریتوں کے ہاتھوں مروا دیتا۔

ان ہی دنوں ایک وزیر صاحب کا بیٹا اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں برفباری تفریح کی غرض سے آیا اور اس انسان نما جانور کی نظر ان پر پڑ گئی خونریزی ان عفریتوں کی آنکھوں میں سما چکی تھی ان میں سے دو ایک عفریت کی آنکھوں مارے گئے تیسرا بچ نکلا پھر اشعر اور مناظل گاؤں میں آئے۔

مناظل کی جب دریا میں گرنے کے بعد اشعر نے تلاشی کے وارنٹ حاصل کر لئے تھے، چوہدری کے نمک خوار تھانیدار نجاف نے اسے مخبری کر دی کہ اشعر حویلی کی تلاشی لینے آنے ہی والا ہے وقار کے حکم پر ایک عفریت تھانے میں جا پہنچا۔ جہاں کئی سپاہیوں کو مارنے کے بعد وہ اشعر کے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا بائیں پہلو میں گولی لگنے اور آنکھیں ضائع ہونے کے باوجود وہ اپنی سونگھنے کی حس کی مدد سے حویلی پہنچ گیا۔

وقار نے اسے انجکشن لگا کر بے ہوش کیا اور چوہدری دلاور اور چند دوسرے کارندوں کے ساتھ گاڑی میں ڈال کر اپنی تجربہ گاہ میں لے گیا اس دوران اشعر اور زمان اس حیوان نما انسان کے خون کے نشانات کا پیچھا کرتے ہوئے حویلی میں آئے اور وہاں چوہدری دلاور کے کارندوں کو مار دیا۔

"ہدایت اللہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔؟" اس بار فرحان نے سوال کیا۔ اور رستم نے تفصیل سے ہدایت اللہ اور اس کی بیوی کے ساتھ ہونے والی درندگی کے بارے میں بتایا۔

"تجربہ گاہ جنگل میں کس طرف ہے؟ اور اس کی لوکیشن کیا ہے۔؟" اشعر نے اگلا سوال پوچھا۔ اور رستم نے تجربہ گاہ کی لوکیشن بتاتے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جانتا۔

"زیرزمین تجربہ گاہ کا خفیہ راستہ کہاں ہے ۔؟" پوچھ گچھ اختتام میں پہنچتے ہی فضا پولیس موبائل کے ہوٹرز سے گونج اٹھی اشعر رستم کا بیان ریکارڈ کر چکا تھا پولیس موبائلز کے ہوٹرز کی آواز سنتے ہی اس کی توجہ باہر کی طرف ہوئی فرحان نے چشم زدن میں ایک طرف پڑا پسٹل اٹھایا اور رستم کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا پے در پے کئی فائر ہوئے گولیاں رستم کے سینے اور سر میں لگی تھیں

"یہ تم نے کیا کیا۔" اشعر چلایا۔

"یہ ہدایت اللہ سمیت کئی معصوم لوگوں کا قاتل ہے اسے گرفتار کر کے تم خوامخواہ عدالت کا وقت ضائع کرتے۔" فرحان نے پسٹل ایک طرف پھینکتے ہوئے جواب دیا اور اشعر متاسف رہ گیا۔

پولیس اہلکار اندر آ چکے تھے یہ درجن بھر پولیس کمانڈوز تھے چوہدری دلاور کے خلاف ثبوت حاصل ہو چکا تھا رستم کی گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی حویلی کے تہہ خانے میں بھی جیل سے کئی بے گناہ لوگ برآمد کئے گئے جنہوں نے چوہدری دلاور کے خلاف بیان دیا۔

موبائل فون پر حساس ادارے کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا جس نے چوہدری دلاور اور وقار کی گرفتاری کا آرڈر دے دیا۔

وہ قانونی کارروائی میں مصروف تھے کہ فرحان خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا وہ جانتا تھا کہ قانونی کارروائی میں وقت لگے گا چوہدری دلاور، مناظل، ہدایت اللہ سمیت بہت سے لوگوں کا قاتل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس اور اشعر چوہدری دلاور کو اگر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ اپنے اثر و رسوخ اور مہنگے ترین وکلا کے ذریعے یا تو بچ جائے گا یا اسے محض چند سال کی سزا ہو جائے گی۔

اشعر کو جب فرحان کی عین موجودگی کا علم ہوا تو خاصی دیر ہو چکی تھی اشعر کے لئے اسے روکنا ضروری تھا دلاور خان کوئی معمولی غنڈہ یا بدمعاش نہیں تھا جس پر فرحان تن تنہا ایک رائفل کے بل بوتے پر قابو پا لیتا پھر وہاں وہ دیوہیکل خوف ناک مخلوق بھی تھی وہ تین چیتوں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے ابھی وہ جنگل سے کچھ ہی فاصلے

پرتے کہ فرحان نظر آ گیا وہ بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" اشعر اس کے قریب جیپ روکتے ہوئے بولا تو فرحان خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "ایک بات سچ سچ بتاؤ تمہاری اصلیت کیا ہے۔؟" اشعر نے پوچھا۔

"کیا مطلب۔؟" فرحان چونک گیا۔

"اس پسماندہ گاؤں کا ایک عام دیہاتی مارشل آرٹ کا ماہر اور اسلحہ شناس ہونے کے ساتھ ساتھ کماٹوز کی سی مہارت سے لڑنا مجھے شک و شبہ میں مبتلا کر چکا ہے۔" اشعر اسے شک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"دراصل میں کافی عرصہ شہر میں رہا ہوں۔ ایک شوٹنگ کلب سے نشانہ بازی کی تربیت حاصل کی اور کافی عرصہ مارشل آرٹ کلب سے بھی منسلک رہا ہوں۔" فرحان نے اپنی گردن بچانے کے لئے جھوٹ بولا۔ وہ مناسب کا بدلہ لئے بغیر گرفتار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

اب وہ جنگل کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اندھیری رات کے باوجود جنگل سے مختلف جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں آگے راستہ دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ گاڑیوں کو ایک طرف روک لیا گیا اور وہ سرچ لائٹوں کی روشنی میں پیدل کرآگے بڑھنے لگے اب وہ لوکیشن کے قریب پہنچنے والے تھے رستم کے کہنے کے مطابق تجربہ گاہ جنگل کے اس حصے میں زیر زمین تھی۔ مگر وہ بھی خفیہ راستے کے بارے میں نہیں جانتا تھا اب یہ خفیہ راستہ انہیں خود تلاش کرنا تھا۔

اشعر، فرحان اور کماٹوز مختلف سمتوں میں پھیل کر محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے وہ کماٹوز ان سب سے آگے تھے انہوں نے ابھی چند قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ ساعت شکن دھماکہ ہوا اور دونوں کماٹوز کے پرخچے اڑ گئے۔ "رک جاؤ اور کوئی آگے نہ بڑھے یہاں بارودی سرنگیں نصب ہیں۔" اشعر چلایا تو سب خوف زدہ ہو کر رک گئے۔

خفیہ تجربہ گاہ تک جانے کے لئے آگے بڑھنا ضروری تھا اور اس طرف آگے بارودی سرنگوں کی صورت میں یقینی موت تھی۔ دو کماٹوز نے دوسری سمت سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جھاڑیوں کی آڑ سے گولیوں کی بوچھاڑ نے ان کے جسم چھلنی کر دیئے۔ "سب چند قدم مزید پیچھے ہٹ جاؤ یہاں قدم قدم پر موت موجود ہے۔" اشعر چلایا اور وہ سب پیچھے ہٹ گئے اشعر کے اندازے کے مطابق یہاں خود کار گنیں نصب تھیں جنہیں تجربہ گاہ سے آپریٹ کیا جا رہا تھا وہ تیسری سمت سے آگے بڑھنے کے لئے انہیں کافی راستہ پیدل طے کرنا پڑا ایک وہ بہت زیادہ محتاط تھے، اس بار انہیں پھر رک جانا پڑا ایک اور کماٹوز زمین میں دھنسنا شروع ہو چکا تھا جب تک وہ دوڑ کر آگے جاتے زمین اسے مکمل نگل چکی تھی وہ سب سناٹے میں آ گئے کیونکہ وہاں ایک دلدل تھی اب آگے جانے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا ایک طرف بارودی سرنگیں دوسرے راستے میں خود کار گنیں اور تیسرے راستے میں دلدل موجود تھی وہ گھوم پھر کر دوبارہ بارودی سرنگوں والے راستے پر آگئے اور ابا ایک طرف کھڑے سوچ رہے تھے۔ "کیا کیا جائے اشعر! کیا ہم ساری زندگی یہیں کھڑے انتظار کرتے رہیں گے۔" فرحان سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں نے ہائی کمان کو اطلاع کر دی ہے صبح تک بھاری نفری جدید آلات سمیت یہاں آ جائے گی اور ہم ان جدید آلات کی مدد سے ان بارودی سرنگوں کا کنارہ بنا کر آگے بڑھیں گے۔" اشعر نے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں اشعر میں انتظار نہیں کر سکتا یہ دونوں بھائی انسانیت کے دشمن ہیں اور اس کے علاوہ میری مناسل کے قاتل بھی ہیں جب وہ زندہ نہیں رہی تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔" وہ ہذیانی لہجے میں بولا تو اشعر ششدر رہ گیا گویا فرحان بھی مناسل کو چاہتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس دیوانگی سے کسی کو چاہ سکتا ہے کہ اپنے محبوب کے لئے جانتے بوجھتے ہوئے آگ کا دریا پار کر جائے۔

فرحان خطرناک فیصلہ کر چکا تھا کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے وہ جانتا تھا کہ آگے بڑھنے کی صورت میں یقینی موت ہے وہ چند قدم اور آگے بڑھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ آگے بڑھنے کی صورت میں بارودی سرنگ پر پاؤں پڑ سکتا ہے جس کا نتیجہ خود دیکھ چکا تھا دو کماٹوز کے جسم کے پرخچے اڑ چکے تھے لیکن موت سے ٹرٹل کا خندق پھلانگنے والے نہیں ڈرنے کر وہ مر بھی سکتے ہیں وہ بھی ایسا ہی تھا اس نے قدم بڑھا۔

اشعر کے منع کرنے کے باوجود بھی چھلانگ لگائی ساعت شکن دھماکہ ہوا اور زمین پاؤں لگنے سے پہلے فضا میں فلا بازی کھا کر جب الٹا گرا تو اشعر اور کماٹوز جان کن بازی لگانے والے اس دیوانے کو دیکھ رہے تھے جو چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے پے در پے بارودی سرنگوں کے دھماکے ہو رہے تھے ان دھماکوں کی شاک ویو سے اگ دور گھنی جھاڑیوں میں اچھال کر لے گئی دھماکوں کی آواز سے وہ سر کی مخصوص آواز تو نہ سن سکا لیکن اتنا ضرور محسوس کیا کہ وہ اچانک نمودار ہونے والے کسی خلائی مخلوق کی طرح ہوا میں گھومتا ہوا زمین پر گرا اور اس کے پاؤں کسی پختہ فرش سے ٹکرائے تھے یہ ایک ہال تھا ہر طرف ائرجی سیور جل رہے تھے ان سیوروں کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کے اردگرد اپاہج انسان کھڑے تھے ان میں سے دو وہ آشنا چہرے تھے جب کہ دوسرے تین کرخت صورت افراد اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔

"بہت خوب تم واقعی بے حد جاں باز ہو، ہم تک پہنچنے کے لئے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے تجربہ گاہ کے خفیہ راستے کے قریب جا پہنچے تم ہی ہمیں یہ سوچا کیوں نہ تمہیں خراج تحسین پیش کیا جائے اس لئے میں نے اندر سے آپریٹ کر کے خفیہ راستہ کھول دیا اور تم تجربہ گاہ میں پہنچ گئے ورنہ خود تم اور تمہارے ساتھی بلکہ حساس اداروں کے افسران اور بڑے بڑے اہل ہی اس تجربہ گاہ کے خفیہ راستے تک نہیں پہنچ سکتے۔" وہ رکے تھے اور پھر بولا۔

"آؤ ذرا تمہیں اپنے حیرت کدے کی سیر کروادوں اور تمہارے لئے ایک سرپرائز بھی ہے۔" وہ اسے گن پوائنٹ پر لئے ہوئے ایک کشادہ کمرے میں آئے یہاں مانیٹر کی روشنی اسکرین بھی تھی جس پر لکیروں میں مختلف مناظر نظر آ رہے تھے وہ اشعر اور کماٹوز کو بھی دیکھ سکتا تھا جو اسی طرح ساکت اور جامد کھڑے تھے، شاید سوچ رہے تھے کہ آگے بڑھیں یا آنے والی نفری کا انتظار کریں وہ فرحان کے انجام سے بھی بے خبر تھے بلکہ ان کے خیال میں فرحان کا جسم بارودی سرنگ کا شکار ہو کر مختلف ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ فرحان زیر زمین تجربہ گاہ میں کھڑا مانیٹر اسکرین پر انہیں دیکھ رہا ہے اس کمرے کی دیواروں کے آگے نیلی قسم کے بھاری بھرکم پردے آویزاں تھے تینوں رائفل بردار اب تک اس کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

وقار ایک دیوار کی طرف بڑھا اور پھر پردہ سرکا دیا اگلا ہی لمحہ فرحان کے لئے ناقابل یقین تھا یہ شیشے کی دیوار تھی جس کے پار کمرے میں مناسل موجود تھی مناسل جسے وہ خود دریا میں ڈوبتے دیکھ چکا تھا اور پھر دریا سے اسی کے قد و قامت کی لڑکی کی لاش ملی تھی وہ بھی فرحان کو دیکھ کر مضطرب ہو چکی تھی اس کے ہونٹ ہل رہے تھے وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز فرحان تک نہیں پہنچ رہی تھی شاید وہ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔

فرحان بے اختیار شیشے کی دیوار کی طرف بڑھا۔ "اوئے ہیرو رک جا، یہ کوئی فلمی منظر نہیں اور نہ ہی ناول کی کہانی ہے کہ تو یہ شیشہ توڑ کر ہیروئن کو نکال لے گا یہ شیشہ بلٹ پروف ہے اور اسے توڑنا ناممکن ہے اسے صرف کنٹرول پینل سے ہی آپریٹ کیا جا سکتا ہے تمہارے لئے یہاں اور بھی بہت سے سرپرائز ہیں جو ایک ایک کر کے دکھاتا رہوں گا۔

اس نے دوسری طرف کا شیشہ سرکایا یہاں فرش پر وہی انسان نما حیوان بے سدھ پڑا تھا جبکہ اس جیسا ایک دوسرا انسان نما حیوان کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ "یہ ٹائیگر کا بھائی ہے اور اپنے بھائی کے زخمی ہونے پر سخت اشتعال میں ہے ہم نے زخمی ٹائیگر کو خواب آور انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر کے ہمارے بارے میں بہت کچھ تو تم رستم سے جان چکے ہو اب مزید بھی تم جان جاؤ گے

ویسے بھی تمہاری دیوانگی کا مظاہرہ ہم نے دیکھ لیا ہے اور اسکرین پر تمہاری اس جھانسی کی رانی کو دکھایا بھی ہے اب یہ بھی تمہیں بتاتا چلوں کہ مناصل کیسے بچی اور اسے زندہ رکھنے کا میرا کیا مقصد ہے۔

تو مسٹر فرحان رستم اور چند دوسرے ساتھی ایک دوسری گاڑی پر تمہارے پیچھے تھے پل پر جب مناصل نے غیر متوقع طور پر گاڑی دریا میں گرادی تو وہ دریا میں کود گئے وہ ماہر تیراک تھے وہ اپنے ساتھیوں کو تو نہ بچا سکے اور نہ ہی تمہیں تلاش کر سکے۔ ہاں البتہ مناصل کو زندہ سلامت دریا سے نکال دیا گیا، وہ اس وقت بے ہوش تھی اسے خاموشی سے اس تجربہ گاہ میں پہنچا دیا گیا اور ایک دوسری لڑکی جو میرے تجربے کی وجہ سے مر چکی تھی اسے دریا میں پھینک دیا گیا اشعر اور تم اس لڑکی کی لاش کو مناصل سمجھے ایک انسان نما حیوان کو نکارہ ہوتے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا۔

کیوں نہ انسان اور اس کے ملاپ سے اسی قسم کی کوئی دوسری مخلوق پیدا کروں، اسی تجربے کے لئے اس لڑکی کو استعمال کیا اس سلسلے میں اس حیوان کو مختلف انجکشن لگائے اب یہ حیوان جنسی اعتبار سے کسی بھی عورت کو دیکھ کر بپھر سکتا ہے، دریا میں پھینکی جانے والی عورت بھی اسی تجربے میں ماری گئی۔ میرا اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس قسم کے حیوان انسانوں کی فوج ہوگی ان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیت تم دیکھ ہی چکے ہو۔

مناصل اور اس حیوان کے کمرے میں صرف ایک دروازہ حائل ہے جو کنٹرول پینل کا ایک بٹن دباتے ہی کھل جائے گا پھر مناصل کے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے یہ حیوان نما انسان میری تخلیق ہے۔"

وقار کی شیطانی گفتگو فرحان سن رہا تھا۔ "تم خدائی دعویٰ کر رہے ہو اس سے پہلے بھی کتنوں نے ایسے دعوے کئے اور ان کا حشر کیا ہوا، وہ نیست اور نابود ہو گئے، چند گھنٹوں بعد یہ جنگل قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں سے بھر جائے گا۔ تم کیا سمجھتے ہو تم اور تمہاری دیوانگی کا مظاہرہ ہم نے دیکھ لیا ہے اور اسکرین پر تمہاری اس جھانسی کی رانی کو دکھایا بھی ہے اب یہ بھی تمہیں بتاتا چلوں کہ مناصل کیسے بچی اور اسے زندہ رکھنے کا میرا کیا مقصد ہے۔

تو مسٹر فرحان رستم اور چند دوسرے ساتھی ایک دوسری گاڑی پر تمہارے پیچھے تھے پل پر جب مناصل نے غیر متوقع طور پر گاڑی دریا میں گرادی تو وہ دریا میں کود گئے وہ ماہر تیراک تھے وہ اپنے ساتھیوں کو تو نہ بچا سکے اور نہ ہی تمہیں تلاش کر سکے۔ ہاں البتہ مناصل کو زندہ سلامت دریا سے نکال دیا گیا، وہ اس وقت بے ہوش تھی اسے خاموشی سے اس تجربہ گاہ میں پہنچا دیا گیا اور ایک دوسری لڑکی جو میرے تجربے کی وجہ سے مر چکی تھی اسے دریا میں پھینک دیا گیا اشعر اور تم اس لڑکی کی لاش کو مناصل سمجھے ایک انسان نما حیوان کو نکارہ ہوتے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا۔

کیوں نہ انسان اور اس کے ملاپ سے اسی قسم کی کوئی دوسری مخلوق پیدا کروں، اسی تجربے کے لئے اس لڑکی کو استعمال کیا اس سلسلے میں اس حیوان کو مختلف انجکشن لگائے اب یہ حیوان جنسی اعتبار سے کسی بھی عورت کو دیکھ کر بپھر سکتا ہے، دریا میں پھینکی جانے والی عورت بھی اسی تجربے میں ماری گئی۔ میرا اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس قسم کے حیوان انسانوں کی فوج ہوگی ان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیت تم دیکھ ہی چکے ہو۔

مناصل اور اس حیوان کے کمرے میں صرف ایک دروازہ حائل ہے جو کنٹرول پینل کا ایک بٹن دباتے ہی کھل جائے گا پھر مناصل کے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے یہ حیوان نما انسان میری تخلیق ہے۔"

وقار کی شیطانی گفتگو فرحان سن رہا تھا۔ "تم خدائی دعویٰ کر رہے ہو اس سے پہلے بھی کتنوں نے ایسے دعوے کئے اور ان کا حشر کیا ہوا، وہ نیست اور نابود ہو گئے، چند گھنٹوں بعد یہ جنگل قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں سے بھر جائے گا۔ تم کیا سمجھتے ہو تم

اور تمہاری تجربہ گاہ محفوظ رہے گی۔" فرحان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے بچے، وہ دیکھ کنٹرول پینل پر لگا ہوا لیور، میں نے برسوں اس جنگل میں جنگ نہیں ماری، اس تجربہ گاہ کے اوپر انتہائی خطرناک میزائل نصب ہیں لیور کو اوپر کرتے ہی یہ میزائل تقریباً کچھ منٹ بعد فائر ہو جائیں گے اور منٹوں میں یہ شہر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔" وہ شیطان سائنسدان ہذیانی انداز میں ہنسا۔

فرحان کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا، وہ واقعی تخریبی ذہن رکھنے والا شیطان سائنسدان تھا۔

"اتنی بڑی کارروائی تمہارے اکیلے کے بس کی بات نہیں یہ خطرناک میزائل نصب کرنے میں ضرور کسی ملک دشمن کا ہاتھ ہے جو تمہارے جرائم میں برابر کا شریک ہے۔"

فرحان جذباتی ہو گیا مانیٹر کی اسکرین پر اچانک ہل جل دکھائی دے رہی تھی شاید اشعر کے ساتھیوں کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا وہ آگے کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ "نہیں فائرنگ پوزیشن میں ہیں، فائر کرو۔" وقار چلایا ایک رائفل بردار کندھے سے رائفل لٹکا کر کنٹرول پینل کی طرف بڑھا۔ اور سرخ رنگ کا ایک بٹن دبا دیا مختلف مقامات پر گنوں سے فائرنگ شروع ہو گئی تین کمانڈوز مزید مارے گئے، اشعر اور بچ جانے والے کمانڈوز نے اپنے بیگز میں سے دستی بم نکالے اور آٹومیٹک گنوں والے مقامات پر پھینک دیئے پے در پے کئی ساعت شمکن دھماکے ہوئے مانیٹر پر ہر طرف گرد و غبار کے بادل دکھائی دے رہے تھے۔

"وقار صاحب دستی بموں نے ہماری تمام خود کار گنیں ناکارہ بنا دی ہیں۔" ایک رائفل بردار گھبراہٹی ہوئی آواز میں بولا۔

"اب مانیٹر کی اسکرین پر اشعر اور اس کے بچ جانے والا کمانڈو دکھائی دے رہے تھے وہ خفیہ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔" اپنے ساتھیوں کو ان کے مقابلے پر باہر نکالو۔" دلاور خان نے پہلی بار زبان کھولی۔

وقار سر ہلاتے ہوئے کنٹرول پینل کی طرف بڑھا۔ اور ایک بٹن دبا کر مائیک میں بولا۔ "تمام افراد باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔"

فرحان نے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھا درجنوں کی تعداد میں مسلح افراد تجربہ گاہ سے نکل کر پھیل چکے تھے کانٹر فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ اشعر اور اس کے کمانڈو بے فکری سے لڑ رہے تھے وہ وطن کے سپاہی تھے وطن کی حفاظت کی خاطر جان دینا بھی جانتے تھے اور جان لینا بھی جانتے تھے واضح طور پر اشعر کے گروپ کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا، اشعر کے ساتھ صرف پانچ کمانڈوز زندہ بچے تھے جو بے جگری سے لڑ رہے تھے ایل ایم جی گنوں کا آزادانہ استعمال کیا جا رہا تھا۔

"میں ٹائیگر کو بھی باہر بھیج رہا ہوں۔" وقار نے کہا اور کنٹرول پینل کا ایک بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی حیوان نما انسان کے کمرے کی چھت سلائیڈنگ کر کے سرک گئی اور سیڑھیوں کا زینہ جار ہا تھا۔ "ٹائیگر تم باہر جاؤ اور جو بھی سامنے آئے اسے مار دو۔" وقار چیخا۔

حیرت انگیز طور پر وہ درندہ اس کی بات سمجھ کر میز پر میاں چڑھنے لگا وقار نے اپنے ساتھیوں کو تیزی سے کم ہوتا دیکھ کر حیوان نما انسان کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اب وہ حیوان نما درندہ اشعر اور اس کے ساتھیوں کی پشت پر نمودار ہو چکا تھا اور چنگھاڑتے ہوئے دو کمانڈوز کی گردن پکڑیں اور کسی کھلونے کی طرح مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

وقار کے زندہ بچ جانے والے پانچ کارندوں نے فائرنگ روک دی تھی اور تجربہ گاہ کے خفیہ دروازے کی طرف بھاگے مگر انہیں وہاں تک جانا نصیب نہیں ہوا اشعر نے للکارتے ہوئے برسٹ مارا وہ پانچوں گولیوں کی تال پر رقص کرتے ہوئے جہنم رسید ہو گئے ادھر وہ حیوان نما انسان دوسرے دو کمانڈوز کو بھی مار چکا تھا فرحان اور اس کا ساتھی کمانڈو اس عفریت کی طرف مڑا اور ٹریگر دبانا چاہا مگر ٹھک کی آواز ابھری گویا ان کی رائفلوں سے گولیاں ختم ہو چکی تھیں ان کے پاس میگزین بدلنے کا وقت نہیں تھا۔

وہ انسان نما حیوان آخری کمانڈو کے سر پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ مار کر اس کا سر تربوز کی طرح توڑ چکا تھا، اشعر جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگا اور وہ انسان نما حیوان پنجے جھاڑتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔

فرحان سکتے کے سے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ چار ہاتھوں والا وہ دیو ہیکل انسان نما حیوان کسی وحشی بیل کی طرح اشعر کے پیچھے تھا۔ تمام کمانڈوز کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

"دیکھا مسٹر فرحان سب ختم ہو گئے اب اشعر بھی میرے تخلیق کردہ عفریت کے ہاتھوں مارا جائے گا، اب چلو وہ اسے رائفل برداروں کے ہمراہ ایک دوسرے کمرے میں لے گیا فرحان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور پاؤں میں بھی مضبوط رسی باندھ دی گئی۔" اب جانتے ہو کیا ہوگا۔؟ ہم شہر پر میزائل فائر کر دیں گے اس کے بعد تمہاری آنکھیں آپریشن کے ذریعے زخمی حیوان نما انسان کو لگا دی جائیں گی میں ان حیوان نما انسانوں، مناصل اور اس جیتی دھات کے ذخیرے سمیت سرنگ کے راستے اس ملک سے نکل جاؤں گا وہاں مناصل اور اس حیوان نما عفریت کے ملاپ سے ایک نئی نسل تخلیق دوں گا۔" اور اسے بے دست و پا کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

فرحان جانتا تھا کہ وہ سخت خطرے میں ہے، شہر سے مزید نفری آنے سے پہلے پہلے میزائل فائر کر دیا جائے گا پھر وقار کے پلان کے مطابق اس کی آنکھیں زخمی انسان نما حیوان کو لگا کر وہ لوگ اپنا سب کچھ سمیت کر یہاں سے نکل جائیں گے وہ کمرے کے فرش پر بے دست و پا پڑا تھا۔ اسے یہاں سے نکلنے کے لئے جدوجہد کرنا تھی۔ وہ کافی دیر تک اپنی پشت پر بندھے ہاتھوں کو زور دے کر رسی کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنی ان کوششوں سے اسے محسوس ہوا کہ رسی اسی طرح مضبوطی سے بندھی ہوئی ہے وہ کوشش کر کے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کہنیوں تک لانے لگا اس کوشش میں اسے کافی تکلیف

کا سامنا کرنا پڑا۔ مارشل آرٹ کی مسلسل ورزشوں کی بدولت اس کا جسم کس قدر لچکدار ہو چکا تھا اس کے بندھے ہوئے ہاتھ کولہوں سے گزر کر گھٹنوں کے جوڑ تک آ چکے تھے پھر کچھ کوششوں سے اس کے بندھے ہوئے پاؤں سے گزر کر سامنے آ چکے تھے اب رسی کی گانٹھ کھولنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس نے اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ اپنے منہ تک لائے اور دانتوں کی مدد سے گانٹھ کھولنے لگا کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے، اس کے بعد ٹخنوں کے گرد بندھی رسی کھولنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اب وہ آزاد تھا۔

خوش قسمتی سے کمرے کا دروازہ لاک نہ تھا وقار اور اس کے کارندوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بے دست و پا فرحان آزاد ہو سکتا ہے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا ہتھیار کے نام پر اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اسے خالی ہاتھ ہی دلاور خان اور وقار کے کارندوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور پھر وہ انسان نما حیوان بھی تھا جو بے پناہ حیوانی طاقت کا مالک تھا۔

فرحان کوریڈور میں دبے قدم چلتا ہوا آگے بڑھا اس طرف ایک دروازہ تھا اس نے پوری احتیاط برتی اور آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، اس کمرے میں ایک شخص ڈاکٹروں والا گاؤن پہنے ایک بڑی سی مشین سے برسرِ پیکار تھا وہ شاید فرحان کے قدموں کی آہٹ سن چکا تھا۔ اس لئے چونک کر مڑا لیکن تب تک فرحان اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس چھلانگ کے نتیجے میں وہ دونوں اس طرح گرے کہ وہ شخص فرحان کے نیچے تھا اس شخص نے گھٹنے سمیت کہنی فرحان کے پیٹ میں مارے فرحان نے پے در پے تین چار پنچ اس کے چہرے پر رسید کئے اور اس شخص کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس شخص نے بلبلا کر ایرو کن پنچ کا وار فرحان کی کنپٹی پر کیا یہ خاصا خطرناک وار تھا فرحان کی نگاہوں کے سامنے تارے سے رقص کرنے اور ذہن پر دھند چھانے لگی اس شخص نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دونوں پیر خود پر سوار فرحان کے سینے پر رکھ کر دھکیل دیا فرحان ایک طرف جا گرا وہ دونوں ایک ساتھ ہی پھرتی سے اٹھے اس بار فرحان نے غور سے اپنے حریف کا جائزہ لیا۔

وہ مثل صورت سے غیر ملکی دکھائی دے رہا تھا اس باراس شخص نے حملے میں پہل کی اور زوردار پنچ رسید کیا فرحان نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور (سوتو ہنر) دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی کی زوردار ضرب اس کی گردن پر لگائی یہ مارشل آرٹ کا انتہائی خطرناک وار تصور کیا جاتا ہے کڑاک کی آواز ابھری اور اس شخص کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی وہ بنا کوئی آواز نکالے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

فرحان نے اس کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی لیکن میز کی دراوزوں اور الماری سے بھی اسے کوئی خاص چیز نہ ملی اچانک اس کی نظر کمرے سے متصل دروازے پر پڑی وہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا یہ ایک دوسرا کمرہ تھا اس کشادہ کمرے میں مختلف اقسام کے جدید ہتھیار پڑے تھے گویا یہ اس تجربہ گاہ کا اسلحہ خانہ تھا اس نے ایک پسٹل اپنی بیلٹ میں اڑسا۔ بھاری بھرکم گن کے مقابلے میں پسٹل بہترین ہتھیار رہتا ہے۔

فرحان نے ایک پسٹل بیلٹ میں اڑسنے کے بعد ایک دوسرا پسٹل بھی اٹھالیا، وہیں ڈانٹا مائیٹ اسٹک بھی موجود تھیں اس نے ڈانٹا مائیٹ اسٹک بھی اٹھائیں اور دوسرے کمرے میں آ کر بیڈ سے ٹیکا اٹھایا اس کا خلاف اتار کر ڈانٹا مائیٹ اسٹک اس میں ڈال دیں یہ ڈانٹا مائیٹ اسٹیک جدید اور زیادہ طاقتور محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ ان کو تجربہ گاہ کے ہر حصہ میں پھیلاتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اب وہ کنٹرول پینل والے اس دروازے تک پہنچ چکا تھا جہاں دلاور اور وقار موجود تھے۔

فرحان جانتا تھا کہ ان کے زیادہ تر کارندے اشعر اور کمانڈوز کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں دروازہ بالکا کھلا ہوا تھا اس نے جھری سے جھانکا۔ وقار کنٹرول پینل کے قریب کھڑا مختلف اقسام کے بٹن دبا رہا تھا اس سے کچھ فاصلے پر دلاور خان اور دو رائفل بردار شخص موجود تھے سب کی توجہ کنٹرول پینل کی طرف تھی پھر اس نے دیکھا۔

وقار نے کنٹرول پینل پر لگا لیور ایک جھٹکے سے نیچے کر دیا اور ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ ”اب دس منٹ میں میزائل فائر ہو جائیں گے۔“

فرحان نے برقی سرعت سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا اس سے پہلے کہ رائفل بردار سنبھلتے اس نے پے در پے ٹریگر دبا دیا فائر کی ہولناک آواز کے ساتھ دونوں رائفل برداروں کے سینے میں گولیاں لگیں وہ چیختے ہوئے گرے اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گئے۔

ادھر وقار تیزی سے مڑا اس کے ہاتھ میں پسٹل نظر آ رہا تھا اس نے پیشتر زدن میں فائر کیا تو گولی فرحان کے پسٹل والے ہاتھ میں لگی اور اس کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا۔

فرحان جانتا تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے کسی بھی وقت ڈانٹا مائیٹ اسٹک پھٹ سکتی تھیں اور میزائل بھی فائر ہونے والے تھے اس نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے رائفل اٹھائے دلاور خان پر چھلانگ لگائی ادھر وقار نے فائر کیا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا فرحان دلاور خان سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔

رائفل کے حصول کے لئے ان کے درمیان کش مکش جاری تھی وقار بھی جانتا تھا کہ وقت کم ہے اس نے فرحان کو دلاور خان کے اوپر دیکھ کر گولی چلا دی اسی وقت دلاور خان نے فرحان کو دھکیلا اور خود اس پر سوار ہو گیا وقار کے پسٹل سے نکلنے والی گولی دلاور خان کے سر میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

وقار سکتے کے عالم میں کھڑا تھا اسی کے ہاتھوں اس کا بھائی مارا جا چکا تھا فرحان نے اس کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیشتر زدن میں طلاقتِ کک لگائی ،وقار ایک طرف جا گرا اور پسٹل ہاتھوں سے نکل گیا۔

فرحان کنٹرول پینل کی طرف لپکا اور بنا سوچے سمجھے لیور ایک جھٹکے سے اوپر کر دیا تجربہ گاہ میں سائرن بجنے لگا۔

وقار نے کنٹرول پینل کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہو گیا۔ ”بے وقوف تم نے کیا کر دیا اب دس منٹ میں یہ تجربہ گاہ تباہ ہو جائے گی۔“ وقار چلایا۔

”اس تجربہ گاہ نے ویسے بھی تباہ ہونا تھا، میں ڈانٹا مائٹ اسٹیکس پوری تجربہ گاہ میں پھیلا چکا ہوں۔“ فرحان ہنسا۔

وقار تجربہ گاہ کے خفیہ دروازے کو کھول چکا تھا وہ جان بچانے کے لئے باہر بھاگا۔ مناظل شیشے کے پار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

فرحان کے پاس اپنی اور مناظل کی جان بچانے کے لئے صرف پانچ منٹ تھے اس نے دھڑکتے دل سے کنٹرول پینل پر لگا گرین بٹن دبا دیا تو سرکی آواز کے ساتھ شیشے کی دیوار سرک گئی مناظل دوڑتی ہوئی باہر نکلی ،بھاگ کر مناظل، یہ تجربہ گاہ تباہ ہونے والی ہے۔“ فرحان چیخا اور اس کا ہاتھ تھام کر خفیہ دروازے کی طرف بھاگا۔ جو ابھی تک کھلا ہوا تھا۔

وقار بدحواسی میں اسے مقفل کرنا بھول چکا تھا وہ دونوں بھی تجربہ گاہ سے باہر نکل گئے وہ دونوں بھاگتے ہوئے تجربہ گاہ سے کافی آگے نکل چکے تھے کہ اچانک فضا پے در پے ساعت شکن آوازوں سے گونج اٹھی ہے دھماکے اس قدر شدید تھے کہ زمین لرز اٹھی وہ ایک طرف جا گرے مگر پھر اٹھ کر بھاگنے لگے وقار غائب تھا جبکہ اشعر کا کہیں پتہ نہیں تھا شاید اس انسان نما درندے نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔

بھاگتے بھاگتے انہوں نے مڑ کر دیکھا جہاں تجربہ گاہ تھی وہاں سرخ بگولے اٹھ رہے تھے گویا جنگل میں آگ لگنا شروع ہو چکی تھی وہ جانتے تھے کہ جنگل کی آگ کس طرح پھیلتی ہے اب انہوں نے اپنے بھاگنے کی رفتار تیز کر دی تھی۔

بھاگتے بھاگتے فرحان کسی چیز سے ٹھوکر کا کر جانے کے باعث گرا، یہ وقار کے ایک کارندے کی گولیوں سے چھلنی لاش تھی جس کے قریب ہی رائفل پڑی تھی اس نے رائفل اٹھالی اور مناظل کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بھاگنے لگا۔

اچانک اس کی نظر اس انسان نما حیوان پر پڑی وہ ایک لمبے چوڑے درخت کے قریب کھڑا چنگھاڑتا ہوا اسے جھنجھوڑ رہا تھا پھر انہیں اشعر بھی نظر آ گیا وہ کافی بلند

پر ایک مضبوط ٹہنی کے اوپر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ عفریت اس قدر طاقتور تھا کہ اس کے جھنجھوڑنے سے وہ مضبوط درخت بھی ہل رہا تھا۔

فرحان نے اس کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا گولی نوفٹ لمبے اور جسیم خوف ناک انسان نما حیوان کے شانے میں لگی اور گولی لگتے ہی وہ عفریت ان کی طرف مڑا اور چنگھاڑتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑا۔

''مناحل بھاگو!'' فرحان چیخا اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک طرف بھاگنے لگا۔

مناحل نے دیکھا ان کا رخ جنگل کے اس حصے کی طرف تھا جہاں دلدل موجود تھی گولی لگنے کے باوجود وہ عفریت آندھی اور طوفان کی طرح ان کے پیچھے تھا۔ فرحان دلدل کے قریب پہنچ کر رکا۔ اور پے در پے تین فائر کیے۔

گولیاں انسان نما حیوان کے سینے میں لگیں اس کے باوجود اس عفریت نے چنگھاڑتے ہوئے ان پر چھلانگ لگادی۔ مناحل اور فرحان نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی اور مختلف سمتوں میں چھلانگ لگادی وہ انسان نما حیوان دلدل میں جا گرا۔ اور چنگھاڑتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا فرحان نے رائفل برسٹ موڈ پر کی اور اس کے اوپر برسٹ مارا۔ انسان نما حیوان چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ اب دلدل اس کی بھاری بھرکم لاش کو نگل رہی تھی۔

دور کہیں سے ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ اور جیپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''لگتا ہے پولیس کی بھاری نفری پہنچنے والی ہے۔'' مناحل نے کہا۔

''قانون ہمیشہ ولن کے مرنے کے بعد ہی آتا ہے۔'' فرحان بڑبڑایا۔

اچانک انکی نظر دائیں طرف ایک درخت پر پڑی وقار رائفل ہاتھ میں لئے درخت کی آڑ سے نکل رہا تھا اس کی رائفل کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔ ''تم لوگوں نے میری برسوں کی محنت برباد کردی، میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وقار چلایا اور رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

فرحان اور مناحل کو اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا کہ اچانک فضا فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وقار چیختا ہوا گر گیا اس کی پشت سے اشعر نمودار ہو رہا تھا رائفل اس کے ہاتھوں میں تھی یہ گولیاں اشعر نے چلائی تھیں، وہ درخت سے اتر کر وہاں پہنچا تو وقار کو ان پر رائفل تانے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ فرحان اور مناحل کو بچانے کے لئے وقار کا خاتمہ ضروری ہے رائفل برسٹ موڈ پر تھی اس نے چشم زدن میں وقار پر فائر کھول دیا۔

پولیس کمانڈوز کی درجن بھر جیپیں پہنچ چکی تھیں مشن مکمل ہو چکا تھا شیطان سائنسدان چوہدری دلاور اور انسان نما حیوانوں کا خاتمہ ہو چکا تھا تجربہ گاہ تباہ ہو چکی تھی۔

فرحان نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کردیا۔ بینک ڈکیتی کا اصل مجرم وقاص بھی کچھ دنوں بعد گرفتار ہوگیا جس نے اقرار کرلیا تھا کہ گارڈ اور بینک منیجر اس کی فائرنگ سے مارے گئے تھے، اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی جبکہ فرحان کو قانون کا ساتھ دینے اور انسان نما حیوانوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں قانون کی مدد کرنے کی وجہ سے صرف ایک سال کی سزا سنائی گئی۔

دو سال بعد جب وہ رہا ہوا تو مناحل اور اشعر جیل سے باہر اس کے منتظر تھے۔ ''تم؟'' فرحان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں میں اور یہ اشعر ہے۔'' مناحل مسکرائی۔

''مسٹر فرحان ایک سال کی سزا تو تم بھگت چکے ہو اب عمر قید کے لئے تیار ہو جاؤ، اب باقی کی زندگی تمہیں مناحل کے ساتھ گزارنی ہے اس کا فیصلہ عاصمہ آنٹی اور ڈی آئی جی حیدر علی صاحب کر چکے ہیں۔'' اشعر ہنسا اور مناحل نے مسکراتے ہوئے فرحان کا ہاتھ تھام لیا۔

ایک روشن صبح ان دونوں کی منتظر تھی۔